

DYAL SINGH PUBLIC LIBRARY
READING ROOM
8A, CANNOUGHT PLACE,
NEW DELHI

Dyal Singh Public Library

READING ROOM

8-A, CONNAUGHT PLACE, NEW DELHI-1.

Cl. No. 891.4393

ت 111

Ac. No. 221

Date of release for loan

This book should be returned on or before the date last stamped below. An overdue charge of 0.10 P. will be charged for each day the book is kept overtime.



واحدہ تہتم

ریلوے بلاک ۱۳۱ فلیٹ نمبر ۱
سانٹا کروز ولیٹ بیٹی ۵۸

ہوتا یوں ہے کہ جب ایک کتاب چھپنے لگتی ہے تو لکھنے والا
 (یا لکھنے والی) اپنی موافقت یا مخالفت میں پہلے ہی کچھ لکھ دیتا ہے
 اودیوں افسانوں، کہانیوں یا ناول سے پہلے رائٹر کی "عرضداشت"
 چھپ جاتی ہے۔

میری اس کتاب "شہر ممنوع" کے ساتھ قصہ ہی دوسرا ہو گیا۔
 میری کتاب چھپ کر آئی، میں نے اسے دیکھا اور پھاڑنے بیٹھ
 گئی۔ میرے میاں نے بید منایا کہ خدا کے لئے ایسی حرکت
 نہ کرو۔ لیکن میں کسی صورت اپنا ہارٹ فیل کروانے پر تیار نہ تھی
 سارا جھگڑا یہ ہے کہ میرے پبلشر (اب نام لے کر بیچاروں کو کیا
 شرمندہ کروں۔) جنھوں نے "شہر ممنوع" کا یہ تیسرا ایڈیشن چھپوایا
 ہے۔ شاید یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ دنیا میں بس ایک کتاب چھپوا دینا ہی

سب کچھ ہے۔ اتنی بکواس کتاب چھپی ہے کہ دیکھ جی چاہا جلا دوں۔ کتابت کی غلطیوں سے لے کر چھپائی کا غلط ہر ہر چیز اپنی مثال آپ اسی کتاب کا پہلا ایڈیشن لاہور کے نیا ادارہ نے چھاپا تھا، اور ایسا خوبصورت کہ اسے طباعت اس کے ظاہری حسن پر انعام تک ملا۔ یہاں یہ حال کہ کتاب چھونے تک کو جی نہ چاہے۔

میں ابھی حال ہی میں امریکہ اور کنیڈا گئی تھی وہاں دکانیں دیکھیں ایسی کہ آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں۔ ان میں سر فہرست کتابوں کی دکانیں ہیں۔ اس قدر خوبصورت اور نفیس کتابیں کہ رشک آجائے۔ پتہ چلا کہ وہاں کتابوں کی چھپائی کا معیار ہی یہ ہے۔ یہ نہیں کہ بڑا رائٹر ہو تو ہی اس کی کتاب خوبصورت چھپے بس رائٹر ہو۔ رائٹر کی وہاں بھی بیحد عزت اور قدر ہے۔ یہاں عام لوگوں کی طرح مجھے یہ رونا نہیں رونا ہے کہ اپنے ہندستان میں لکھنے والوں کی قدر و منزلت کہاں؟ خدا کے فضل سے مجھے میرے پڑھنے والوں نے بے حساب چاہا ہے، بیحد قدر اور چاہت ملی ہے (لیکن ایک چیز یہاں سے بہت بڑھ کر ہے وہاں رائٹر کو EXPLOIT نہیں کیا جاتا۔ گھٹیا سے گھٹیا پبلشر بھی کتاب کو اس قدر معیاری طور سے چھاپے گا کہ طبیعت خوش ہو جائے۔ پتہ نہیں اس میں ہم لکھنے والے خود

مقتضواریا واقعی پبلشرز یا قریبی پبلشرز یا قریبی پبلشرز (میں خود کو ہی تصور
 ٹھہراؤں گا۔۔۔ اگر میں ہی اپنی کتاب چھاپنے کے لئے اجازت
 دیتی تو پبلشر صاحب مجھے پھانسی تو نہیں دینے چلے تھے۔)
 اب یہ پریشانی یہ ہے کہ اس بد قطع کتاب کو کون پڑھے گا
 اور کیسے پڑھے گا۔۔۔ ”کون پڑھے گا“ یہ تو میں کہہ سکتی ہوں کہ
 سینکڑوں کتاب پڑھ لیں گے۔ میرے مجموعوں کے بارے میں کئی لوگ
 پوچھ چکے۔ کتاب کے لئے لکھ چکے ہیں۔ وہ بارہ روپے کو
 MIND دینی نہیں کریں گے۔ لیکن کیا یہ زیادتی نہیں ہے کہ
 اتنی آس۔۔۔ نہ پڑھنے والا کتاب کھولے اور اسے اُبکائی آجائے۔
 اب ہری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ میں کروں تو کیا کروں ؟
 پس اتنا وعدہ کر سکتی ہوں کہ آئندہ آپ کو میری اتنی خوبصورت
 کتابیں پڑھنے کو ملیں گی (انشاء اللہ) کہ آپ اس بد صورتی کو
 بھول جائیں گے۔

وہ۔۔۔ میں نے اس کتاب کے شروع کے چند صفحات
 تو واقعی پبلشر کے لئے لکھے ہیں۔ خدا کرے یہ کتاب کسی طور آپ کے
 گھر پہنچے۔ جائے۔ اور میرے میاں کی محنت اور پیسہ چیز
 ہو جائے۔ کیونکہ پہلے والے پبلشر سے انہوں نے ساری کتابیں

خود خرید لی ہیں اور انھیں سجا سنوار کر پھر سے نیا کیا ہے۔
 حالانکہ اپنے حسابوں تو وہ بہت سنوار رہے ہیں لیکن
 میں پھر بھی مطمئن نہیں اس لئے کہ اب کہانی لکھتے ہوئے میں
 جس قدر نفاست پسند حساس اور مغرور ہو جاتی ہوں اس کا کوئی
 اندازہ لگا ہی نہیں سکتا کہ شہر بھرے میں ملنے والا سب سے
 قیمتی پیڈ مجھے کہانی لکھنے کے لئے چاہیئے۔ اسی حساب سے
 قلم - سیاہی - پھر میں لکھتی ہوں تو یوں کہ ایک غلطی نہیں -
 نہ کانٹ نہ چھانٹ - تو آپ ہی بتائیے کہ یہ کتاب بھلا مجھے
 کیا بچائے گی - ؟ حقیقت تو یہ ہے کہ اشفاق خود بھی مطمئن
 نہیں - اور یہ معذرت دراصل اسی لئے میں کر رہی ہوں
 کہ اگر آپ بھی مطمئن نہ ہوں تو کم سے کم میری مجبوری تو جان لیں۔

وَاحِدَ لَا تَبْسَم ۱۵ اگست ۱۹۷۲ء

بہی

شہرِ مہر

وَاجِدَةٌ تَبْسُمُ

قیمت ۱۲ روپے

ناشر: اور سینز بکس نیٹر - بمبئی ۵۸

ایک بات

”میری کہانی“ لکھنے سے قبل میری آنکھوں کے سامنے واضح
 کا یہ مصرعہ تھا: ”شرکتِ علم بھی نہیں چاہتی غیرتِ میری!“
 میں نے بہت سوچا۔ بہت سوچا کہ مجھے اپنے حالات زندگی کہنے
 چاہیے یا نہیں؟ کیا اس طرح کچھ لکھ دینے کا امکان پیدا ہوتا
 ہے؟ یا کچھ ملتا بھی ہے؟ کچھ بھی ہو۔ میں نے سوچا۔ ”کچھ نہ کچھ
 تو لکھنا ہی ہے اب۔“ اور جہاں تک ”شرکتِ غم“ کا سوال ہے،
 میں نے اپنے دکھڑے اس لئے نہیں روئے کہ کسی کو اپنے غم میں شریک کر دوں جو
 اب تو غم صرف ماضی بن گیا ہے۔ اور مجھے تو اس غم کی روداد بس
 یوں سنائی تھی کہ آپ نے مجھ سے میری افسانہ نگاری کے بارے
 میں پوچھا تھا۔ اسی لئے میں اپنے یہ مختصر سے حالات زندگی سنا کر
 ذرا بھی شرمندہ نہیں ہوں۔

واحدہ تبسم

۲۹ دسمبر ۱۹۵۹ء، حیدرآباد دکن

میری کہانی

مجھے افسانے لکھتے ہوئے چار سال ہو چکے ہیں۔ میں یہ نہیں کہوں گی کہ میری چار برسوں کی محنت آپ کے سامنے ہے۔ کیونکہ جہاں تک محنت کا سوال ہے، میں نے افسانے لکھنے میں کوئی محنت نہیں کی۔ میں نے تو افسانہ نگاری یوں شروع کی کہ محنت یا کادش کا کوئی سوال ہی نہ اٹھا۔ مجھے ایک طرح سے اپنی افسانہ نگاری کا ممنون ہونا چاہیے کہ اس کی وجہ سے میرے دل کا بوجھ ملا۔ میں آپ سے بتاؤں، اگر میں افسانے نہ کہتی تو یقیناً ایک نہ ایک دن میرا دل پھٹ جاتا۔ لیکن ہوا یوں کہ میں افسانے لکھنے لگی اور دل میں چھپے ہوئے غم اور احساسات جب ایک ایک کر کے نقطوں کی صورت میں دھیلنے لگے تو میں نے جانا کہ اب میں کبھی نہ مر سکوں گی۔ یہاں میرے ایسا کہنے سے آپ یہ ہرگز نہ سمجھیں کہ اس طرح "میں کبھی نہ مر سکوں گی" جیسے سیدھے سادے جملے میں جانا چاہ رہی ہوں کہ "اب میں ایسی مافی ہونی فنکار ہو گئی ہوں کہ مرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں مر گئی تو کیا ہوا۔ میرا فن تو مجھے زندہ رکھے گا۔" جی نہیں، ایسی کوئی خوش فہمی مجھے اپنے متعلق نہیں ہے۔ اور خوش فہمی رہے بھی کیوں؟ ابھی میں نے لکھا ہی کیا ہے۔؛ دیکھ جی جانتا ضرور ہے کہ اتنی بڑی فنکار بن جاؤ

کہ میرا نام ہمیشہ زندہ رہے۔ دل میں لگن تو موجود ہے ہی۔ مگر اپنی افانہ نگاری کا خیال آتا ہے تو یوں لگتا ہے کہ بال سے بندھی دو دھاری تتلوار سینے پر لٹک رہی ہے۔ اب گری کہ اب گری۔ یہ چار سال اسی دھک دھکا ہٹ میں گزرے ہیں۔ کیا پتہ یہ تتلوار کب گر جائے اور یوں قصہ پاک ہو جائے۔ کانٹوں بھری اس راہ پر چلتے ہوئے کئی بار میں نے یوں محسوس کیا ہے کہ ابھی ابھی گر پڑوں گی۔ مگر سخت حال ایسی تھی کہ کبھی نہ مر سکی۔ جی ہاں کہہ لیجئے کہ "بھئی واجدہ تم بڑی بزدل لڑکی ہو۔" لیکن آپ کے کہہ دینے سے کیا ہوگا؟ ساحل سے کبھی اندازہ طوفاں لگایا جاسکا ہے؟ آپ نے مجھے بزدل کہہ دیا۔ اور میں نے مان بھی لیا۔ لیکن اس ایک لفظ بزدل کے پیچھے جو ایک بیس چوڑی داستان چھپی ہے۔ اسے سنکر آپ کیا فیصلہ کر سکیں گے؟ ان چار سالوں میں کئی کئی بار مجھ سے میرے حالات زندگی جاننے کی فرمائش کی گئی۔ اس جذبے کی تلاش اور جستجو کی گئی جو میری انسانہ نگاری کا محرک بنا۔ ہمیشہ تو مالتی گئی، سوچتی ہوں آج موقع آیا ہے تو کبھی ہی چلوں۔ پھر آپ میں سے جو مجھے بزدل کہہ رہے ہیں خود ہی فیصلہ کر لیجئے کہ حق پر کون تھا۔ لیکن اب جب کہ اپنے حالات زندگی اور افانہ نگاری کے بارے میں "کچھ" لکھنے بیٹھیں تو بڑی طرح ہنسی آرہی ہے۔ مجھ ایسی لڑکی کے حالات زندگی۔ اور پھر افانہ نگاری۔؟ حالات زندگی ہی تو کینخت ایسے تھے جنہوں نے افانہ نگاری پر مجبور کر دیا۔

مگر اب خیال آتا ہے کہ اس طرح تو وہ راد بھی کھول دینے پڑیں گے۔
جو دل بن کر سینے میں دھڑک رہے ہیں، آنسو بن کر آنکھوں میں
چھپتے رہے ہیں۔ اور سکراہٹ بن کر ہونٹوں پر بکھر بکھر گئے ہیں۔ مگر
آپ ہیں کہ آج ان آنسوؤں اور سکراہٹوں کا حساب لے کر ہی
رہیں گے۔

اسی چھا چھ کو کوئی گواہن کھٹا نہیں کہتی۔ مگر میں وہ بے رحم نقاد
ہوں جو کبھی جانب داری سے کام نہیں لیتا۔ پھر میں آپ کے سلفے
یہ کیوں کہوں کہ میرا ماحول میرے لئے بڑا سازگار تھا؛ اگر میں یہ
جھوٹ کہہ بھی دوں تو میری کہانیاں چغلی کھا دیں گی۔ پھر میں سچائی
سے کام کیوں نہ لوں۔؟

میرا گھرانہ سیدوں کا وہ گھرانہ تھا۔ ریحی ماں صیغہ ماضی۔
کیونکہ اب تو ہم نے بقول کسے "فارورڈ" ہو کر نبرگوں کی ناک کاٹ
ڈالی ہے، جہاں پر دے کی سخت قید و بند تھی اور لڑکیوں کی
کسی قسم کی آزادی کا تصور ہی ناممکن تھا۔ حدیث ہے کہ میرے ببا
نے ہم بہنوں کو اسی لئے اسکول میں داخل نہ کروایا کہ "لڑکیاں
اسکولوں میں پڑھ لکھ کر آوارہ ہو جاتی ہیں۔" تین سال کی عمر میں
جب ہمارے سروں سے ماں اور باپ دونوں کا سایہ اٹھ گیا تو پھر
پچھانے نانی اماں سے بڑی منتیں کیں اور یوں ہمیں اسکول میں
داخل مل گیا۔

بات میہیں پر ختم نہیں ہو جاتی، کیونکہ اس طرح تو ہماری
نگرانی کی اور زیادہ ضرورت تھی۔ (کیا پتہ ہم کب پڑھ لکھ کر آوارہ
ہو جائے، اور وہ حسب ضرورت کی بھی جاتی تھی۔ ہماری بیہوشی
جو مین نیسے نمبر پہ تھی، وہ بڑی ذہین اور ذرا خود سر قسم کی تھی۔
اسے جب اسکول میں داخل کروایا تھا اس وقت اس کی عمر صرف
تین سال تھی۔ ٹھیک سے بات کرنی بھی اسے نہ آتی تھی۔ مگر فقے
کہانیاں پڑھنے کا اسے وہ شوق تھا کہ پوچھے نہیں۔ ظاہر ہے ابھی
الف بے بھی ٹھیک سے یاد نہ تھی تو پڑھنے کا سوال ہی کہاں پیدا
ہوتا تھا، مگر جوں جوں وہ پڑھنا سیکھتی گئی اس کا یہ شوق پختہ
ہوتا گیا۔

ان دنوں ہمارے ہاں بہت سارے رسالے آیا کرتے تھے۔
'شیع' سے لیکر 'جمالستان'، 'آریہ ورت'، اور 'کامیاب' تک۔ او
اسی قسم کے اور کئی دوسرے پرچے۔ میں ہر پرچہ الف سے لے کر بے
تک چاٹ جایا کرتی۔ جنوں میہیں پر ختم نہ تھا۔ گھر کا ماہانہ سودا سلف
جن کاغذوں میں، رسالوں کے پھٹے ہوئے صفحوں میں بند ہو کر آتا
تھا وہ میرے لئے سب سے بڑی دل چسپی تھے۔ میں وہ سارے
کاغذ سمیٹ کر کونے میں جا بیٹھتی اور ہر ادھورا اور مکمل
مضمون پڑھ ڈالتی۔ میرا دل چاہتا ساری دنیا کا علم گھول
کر لیا جاؤں۔ جی نہیں میں نے غلط کہا، یہ "علم" والی ترکیب تو میں

اب، یعنی ایم۔ اے ہو کر بگھار سکتی ہوں۔ ان دنوں میں چوتھی یا پانچویں میں پڑھتی تھی اور علم کا کوئی واضح تصور اپنے ذہن میں نہ رکھتی تھی۔ یوں کہتے ہر تحریر پڑھ جانے کی دل میں تیار رکھتی تھی۔ چاہے وہ کیسی ہی گری پڑی کیوں نہ ہوتی۔

ابھی تک تو میں آپ کو صرف اپنے شوق کے بارے میں بتاتی آرہی ہوں، ابھی میں نے آپ کو اپنے حالات کے بارے میں کچھ نہیں بتایا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ میں ان دنوں چیزوں کو، یعنی حالات زندگی اور افسانہ نگاری کو، الگ الگ کر بھی نہیں سکتی۔ میرا دل چاہا کرتا کہ کبھی بازار جاؤں اور اچھی اچھی کہانیوں والی کتابیں خرید لاؤں مگر شاید آپ کو میں نے یہ نہیں بتایا ہے کہ پیسہ ان دنوں سورج ہوا کرتا تھا، دور سے جھلک دکھانے والا۔ جس کی گنتی ہی تنہا کر میں ہاتھ نہیں آسکتا۔ بڑی عجیب بات تو یہ ہے جناب کہ (کہتے ہوئے عجیب سا لگتا ہے) میری امی ایک نواب خاندان سے تھیں۔ بے شاہر کے سب سے بڑے وکیل تھے۔ مجھے نہیں پتہ۔ مگر میں بچپن سے سنتی آرہی ہوں کہ انہوں نے لاکھوں سے روپیہ کمایا۔ کمایا بھی اور گنوا یا بھی۔ اور جب مرے ہیں اس وقت دفنانے کو بھی کچھ نہ تھا۔ امی کی بات نہ پوچھیے، وہ تو بڑی رئیس تھیں۔ جینز میں ڈھیر سونے کے علاوہ پانچ کٹاؤں ساتھ لائی تھیں۔ کافی اماں آج بھی کہتی ہیں کہ ”اگر تیں نے اس سونے کا آدھوں آدھ بھی اٹھا کر رکھ دیا

ہوتا تو میری چاروں نایاں اور بہوئیں سونے میں پھیلی رہتیں۔
 وہم آٹھ بہن سجائی ہیں، مگر نانی اماں نے تو ایک لمبے کاٹار سی اٹھا
 کر نہ رکھا۔ یہ گھبلا بچپن تک تو کبھی میری سمجھ میں نہ آیا۔ مگر آج
 تو ہر بات آئینہ کی طرح روشن ہے۔ پہلے میری امی مر گئی۔

اس وقت میں ایک سال کی تھی، اس کے دو سال بعد میرے
 ببا بھی چلا دیئے (اچھے لوگ تھے بے چارے، جو ہر فکر سے آزاد
 ہو گئے) میں نے آپ سے ابھی بتایا ہے ناکہ میرے ببا بہت نفول
 خرچ تھے۔ اپنی کمائی تو گنوائی ہی گنوائی، امی کا جہیز بھی گنوا دیا۔
 قرضوں کے ڈھیر لے رکھے تھے۔ جانے کتنا قرضہ تھا کہ ساری دولت
 چپ چاپ تے غائب ہو گئی۔ نانی اماں یوں نہ کرتیں تو جانے اس عزت
 کا کیا حشر ہو جانا جو برسوں سے "خاندانِ سادات" کے سر پر
 تاج بن کر جگہ کافی رہی تھی۔ میں نے آپ سے کہا ناکہ کیا مرے
 تو کفن بھی دوسروں نے پہنایا۔ جب یہ صورت حال نظر آئی
 تو ظاہر ہے سب رشتے دار سناٹے میں آ گئے۔ اور ایک ایک کر
 کے کھینکنے لگے درشتہ دار تک سبوں نے جھڑھائیں۔ میں تو صرف
 اپنی کہانی سن رہی ہوں، جب گھر خالی رہ گیا تو صرف ہم چار
 بہنیں اور چار سجاوٹیں تھیں جنہیں سوائے نانی اماں کے اور
 کسی کا آسرا اور سہارا نہ تھا۔

نانی اماں کا یہ حال تھا کہ وہ اپنے گھر میں روپیوں پر چلتی تھیں۔

(یہ مبالغہ نہیں، افسانوی تراش نہیں، حقیقت ہے!) بے حساب تھیلیوں
 میں بے حساب روپے ہوتے اور انہیں جگہ نہ ہونے کے کارن کوٹھری
 میں اناج کے بوروں کی طرح اوپر تلے سھولنس دیا جاتا۔ اب وہی نانی
 اماں رہے سہے زیور کو توڑ توڑ کر ہماری تعلیم تربیت کر رہی تھیں بگاؤں
 سے زینوں کا پیسہ بھی آجاتا تھا۔ اور یوں زندگی گزر رہی تھی۔ بڑی
 بے رنگی اور بے دلی سے عموماً ہم لوگ جوار کی روٹی اور دال کھاتے
 تھے اور اپنے اپنے بستے لڑکائے انگریزی پڑھنے اسکول میں جاتے تھے۔
 مجھے اچھی طرح یاد ہے کیمپ والی سینٹ روڈ پر سے جب ہم مڑتے تھے
 تو لال گر جا کے پاس ایک بہت اونچا بنگلہ تھا۔ بنگلے کے پھاٹک پر
 ہری بھری بیل جھومتی تھی جس میں سرخ رنگ کے پھولوں کے بے
 حساب گچھے لٹک رہے ہوتے۔ رنگ برنگے پھولوں کے گملوں کی دو
 روہ قطار دو رنگ چل کر پھاٹک سے مل جاتی۔ پورٹیکو میں گہرے نیلے
 رنگ کی لمبی سی کار کھڑی ہوا کرتی اور عین ہمارے وہاں سے گزرنے
 کے ٹائم تین چار بچے، بنتے، اچھلتے پردے جھٹلاتے ڈرائنگ روم سے
 باہر آتے اور فنیفہ لگاتے ہوئے ساریں چڑھ جاتے۔ ان کے پیچھے
 پیچھے ان کی آیا۔ ساروں کے بستے سمیٹے، فرسٹ بیڈ میں بیٹھ جاتے
 اور کارزوں زدوں کرتی یہ جادہ جا۔ سڑک پر ہلکی سی گرد اڑتی اور وہ
 خاک ہمارے حلق میں پہنچتی۔ میرے بستے کا بوجھ میری جان لے ڈالتا
 اور سینٹ روڈ پر چلتے چلتے میں سوچنے لگتی کہ مروں گی تو اپنی قبر
 کیسا کتبہ لگواؤں گی۔

”یہاں وہ دل دفن ہے جو زندگی بھر خوشی کے لئے روتا رہا“

تو جناب میں آپ سے تیار ہی تھی کہ صورتِ حال یہ تھی تو کتابوں کے لئے روپے کہاں سے آتے ؟ نانی اماں بے چاری کا تو ناظم بندھنا کبھی نہ کیسی ایک آدھ مہینہ سھائی اڑ جاتا۔

”میں نو انڈا کھاؤنگا۔“

”اوں اوں۔ میں تو گھی شکر کھاؤں گی۔“

نانی اماں کہتیں: ”گھی شکر۔ یہ کون بڑی بات ہے۔ بلکہ بیویوں تو گھی شکر چہ سے مانگ کر لایا کرتی ہوں۔ اور اس چوہے کو بچے بہت ناپسند ہیں۔ بس تم ادھر چلے جاؤ۔ یا پھر اپنی آنکھیں بند کر لو۔“ ہم اپنی آنکھیں بند کر لیتے اور تھوڑی دیر میں ہمارے سامنے سچ سج رکابی میں گھی شکر موجود۔ اگر ہم میں سے کبھی کسی نے گھی کھا یا تو اتنا اصلیت سہانہ جاتا۔ مگر ہم تو سچ سج ہی بچے تھے تہ نہیں کیسے۔ بہت دنوں بعد، ایک دن یہ صبیہ کھلا گیا کہ وہ چوہے ماموں بے مدبر لڑیتے سخت ہمیشہ گھی کی بجائے پانی کھلاتے رہے۔ تہ نہیں کتنا پانی اور شکر یہ گھی شکر کے دھوکے میں کھاتے رہے۔

میں تو کبھی ایک پیسے کی کتاب بھی اپنے لئے نہ خرید سکی۔!! کبھی نانی اماں سے کہا بھی تو انہوں نے بڑی صفائی سے ٹال دیا۔ ”اچھی بیٹی! کتابیں مہینے بڑھاکرتیں۔“ اور یوں کبھی ان کی تینبہ چاری ہی رہتی تھی کہ الا بلانہ پڑھا کرو۔ لیکن یہ بتنا ہی ابھی ظلم نہ بنی تھی کہ ایک حادثہ ہو گیا۔ ہماری ماما غائب ہو گئی۔ کھانا پکھنے کی سخت مشکل جا رہی تھی۔ نانی اماں ہر کسی سے کہا کرتیں کہ ”ایک ماما لا دو۔ مجھ سے تو اتنے سارے بچوں کی ریکھ بھال ہی نہیں ہوتی، کھانا کیسے پکاؤں؟“

مامائیں الٹی جاتیں اور کسی نہ کسی وجہ سے رجکٹ کر دی جاتیں
 ایک دن مغرب کے بعد نانی اماں محن میں بیٹھی کی بھابھی توڑتی بیٹھی تھیں
 ہسٹا لوگ تخت پر ہوم درک کر کے بیٹھے تھے۔ بہنیں پڑھ رہی تھیں۔
 اور میں شطرنج پر سر نہیوڑائے، نیسل منہ میں دبائے سپت انہماک سے
 بیٹھی حساب حل کر رہی تھی۔ اسی دم کسی نے ایک ماما کو باہر سے
 بھجوایا۔ نانی اماں حسب معمول جرح میں مشغول ہو گئیں۔ میں نے یونہی
 ایک بار سراٹھا کر دیکھا، ماما کی گود میں ڈیڑھ دو برس کا بچہ بھی لٹکا ہوا تھا۔
 میں پھر کاپی پر جھکا گئی۔

نانی اماں نے ادھر ادھر کے مختلف سوالوں کے بعد پوچھا۔
 ”تمہارا مرد کیا کام کرتا ہے۔“

”مرد تو چار سال ہوئے مر گیا۔“

میں نے لیپ کی روشنی سے نگاہیں ہٹا کر ماما کو دیکھا۔ کاپی بند کی
 نیسل نیچے رکھی اور پرآمدے میں آکر بڑے معتبر انداز میں یولی۔

”کیوں جی! تمہارا مرد تو مر آیا، پھر یہ بچہ کہاں سے آیا۔؟“ میری

عمر اس وقت آٹھ یا نو سال رہی ہوگی۔

نتیہ نہیں اس سوال میں کون سے دعوے کا اثر سنا کہ نانی اماں اکدم

بھونچک رہ گئیں۔ پہلے تو انہوں نے دیہ سے پٹاٹا کر اپنے نواسوں کو

دیکھا، پھر ادھر ادھر نظر میں دوڑائیں، پھر چلا کر کہا۔ ”اور پڑھنے دو“

اسے رسالت۔

میں اکدم چکر اگئی۔ اپنے سوال کی نوعیت پر غمہ کیا تو کوئی برائی

اس میں نظر نہ آئی۔ میں ابھی سرا سیمہ سی کھڑی تھی کہ نانی اماں گریہیں۔

"آج سے تیرے ہاتھ میں کوئی رسالہ دیکھوں۔"

میری سمجھ میں نہ آیا کہ مجھے اتنی بڑی سزا کیوں ملی۔ نانی اماں سمجھنے لگیں۔ میرے ایک بڑے بھیا ہمیشہ میری سادہ پسند کرتے تھے۔ اگر بھی نانی اماں پڑھنے کو منع کرتیں تو ہمیشہ کہا کرتے۔ "نانی اماں اسے پڑھنے سے نہ روکتے۔ بہت ذہین ہے۔ آئے چل کر یہ نوہ بھی کہانیاں لکھے گی۔" اب نانی اماں انہی کے پیچھے پڑ گئیں کہ ابھی سے یہ حال ہے تو آگے چلا کر کہا ہوگا۔ شاید وہ بھی لاجواب ہو گئے ہوں۔ رات گئے تک بستر میں ساکت و محاسن لیتی رہی۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آتا کہ میں نے ایک جملہ میں کون سا گناہ کر ڈالا تھا۔ (داب سوچتی ہوں تو سنہمی آتی ہے۔ بچپن میں ہم کس قدر بے باک ہوتے ہیں!) اس دن سے خوشیوں کے دروازے مجھ پر بند ہو گئے۔ اور میری نوشتیاں ہی کیا تھیں؟ پڑھنا۔ پڑھنا۔ بس پڑھنا۔ اب بڑے ہوئے لڑکے کہاں میں نظروں سے ذرا اجھل ہوئی نانی اماں نے کارنامہ شروع کیا۔

"وہ بدذات کہہ رہے ہیں؟ کہاں غائب ہو گئی۔؟"

میں نے ابھی آپ سے بتایا تھا کہ میں ان دنوں بہت سوچتی تھی کہ انہی تیرے پر کیا کہتے لگواؤں گی۔

"یہاں وہ پھول دفن ہے برعکس میرا میں مرجھا گیا۔"

میں بچپن ہی سے غیر معمولی حساس ہوں۔ جس بات کو آپ قبول کر بھی انٹرنل نہ کریں، میں اسی بات پر گھنٹوں روتی ہوں۔ آج بھی میری یہی عادت ہے۔ اس دلِ حساس نے مجھے اتنا رلا لیا ہے مگر

پھر بھی مجھے اپنی فطرت کا یہ میوہ پسند ہے۔ میں جانتی ہی اس کے بارے
 ہوں (ایک دن میں یونہی غلطی سے ایک چیونٹی کو مار بیٹھی۔ تو سو میرا
 سٹھا بھی نہیں۔ وہ میرے پر تیلے اگے۔ بیٹھے بیٹھے میں نے یونہی پر پٹایا
 تو وہاں مری ہوئی چیونٹی پڑی تھی۔ اس حادثے نے مجھے تین دن تک
 ملول رکھا۔ پتہ نہیں اس کے کتنے بچے ہوں؟ اس کے منہ میں شکر کا
 دانہ بھی تو تھا۔ اب کون اس کی جگہ لے سکے گا۔)

اب مجھے اپنے سائے سے کبھی ڈر کر چلنا پڑنا سٹھا۔ میں جہاں
 بھی تنہائی پاتی فوراً ادھر کا رخ کر لیتی۔ ہمارا گھر بہت بڑا سٹھا۔ تین
 منزلہ۔ ادھر ادھر بڑے بڑے آنگن۔ برآمد۔ دھابے کافی جگہوں
 ایسی تھیں جہاں میں چوری چھپے پڑ سکتے۔ مگر اس دن کے بعد مجھے بہت
 کم موقع ملے کہ میں نانی اماں کی نگاہوں سے غائب ہو سکتا۔ میرے ایک
 بھائی تھے۔ سگریٹ کے شوقین۔ ان کا ڈھنگ بھی نرالا سٹھا۔ نانی اماں کے
 ڈر سے وہ اس طرح سگریٹ نوشی کرنے کہ خود کو رضائی میں بالکل چھپا لیتے
 اور اندر مزے سے سگریٹ دھونے لگتے۔ (ان کی اس جوری کار راز یوں
 کھلا سٹھا کہ مہربان نے ایک بار نانی رضائی چا ڈالی تھی۔ ایک دن میں
 نے غور سے انہیں دیکھا اور خود سمجھا کہ کیا یہ پر عمل کرنے لگی۔ مگر پوتا
 یوں نڈا کہ اس طرح سے یہ پرتک نہ کو ڈھانک لیتے سے ایک نو دم
 گھٹنے لگتا سٹھا۔ دوسرے "کمر" میں اندھیرا بہت ہو جاتا سٹھا اور الفا
 نظر نہ آتے تھے۔ میں نے اس کے لئے مارچ کا انتظام کیا سٹھا۔ مگر ایک
 بار یوں ہو آ کہ رضائی نے بھانڈا سپورڈ دیا۔ رضائی میں جگہ جگہ سے روئی
 بٹ گئی تھی اور یوں روشنی چھن چھن کر باہر جھلنے لگی تو۔۔۔ انجم

نما ہر ہے۔ مگر ایسی دلیلی باتوں سے ہار جانا تو گویا میرے ذوق کی توجہ
 تھی۔ میرا ذہن نت نئے طریقے ایجاد کر لیا کرتا تھا۔ پڑھائی کے سلسلے میں
 مجھے کبھی کسی اہتمام کی ضرورت نہ پڑی۔ ہمیشہ سے میرا اصول رہا ہے
 کہ امتحان سے چند دنوں پہلے ایک دو بار گہری توجہ سے پوری کتابیں
 دیکھ ڈالیں اور پس معاملہ ختم گمرہیں گھر والوں پر بولوں پڑ کر تھی تھی
 کہ جیسے میں بڑی بدکش (Eccentric) بڑی ہی پڑھا کو ہوں۔ جب
 دیکھو تب کتاب منہ سے لگی ہے۔ (یہ مدتوں کا راز ایک دن کھل ہی گیا،
 بس کہ فی یہ تھی کہ کورس کی کتابوں یا کاپیوں میں اندر نادلی اور رسالے
 رکھ کر پڑھا کرتی تھی۔ اگر کوئی دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ میں بڑے
 اہم کام سے امتحان کو تیار رہی میں مشغول ہوں، مگر میں تو دوسرے
 ہی امتحان کی تیاریاں کیا کرتی تھی۔ حد یہ ہے (ممکن ہے آپ میں
 سے بہت سے یقین کر رہے ہوں) کہ عین امتحان کے دنوں میں بھی
 دل پڑھا کرتی۔ بد بختی نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ ایک دن ایک
 سالہ کاپی میں چپا کر پڑھ رہی تھی۔ کسی نے مجھے کوئی کام بتایا۔ میں
 نے اپنی رسالہ اور کاپی زمین پر رکھ دی اور باہر چلی گئی۔ کاپی پتلی
 تھی اچانک ہوا کے ایک تیز جھونکے سے اس کا دور چا پڑی اور رسالہ
 نمایاں ہو گیا۔ کسی مہربان بھیلے یہ واردات نانی اماں سے جانتائی
 نانی اماں نے انشائا رکھ میرا بے ہوش ہونا باقی رہ گیا۔ یہی میری زندگی
 تھی۔ یہی میرے ذوق و شوق کا انعام !!

میں ان دنوں زندگی سے سخت بدول ہو رہی تھی۔ انہی دنوں

مجھ پر مایہ ناند کا شدید حملہ ہوا۔

میرے ببا بہت ہی حسین و جمیل آدمی تھے۔ خاندان میں تو ان سا کوئی تھا ہی نہیں۔ سڑک پر بھی مکمل جلتے نولوگ پلٹ پلٹ کر دیکھتے رہتے۔ امی حسین نہیں تھیں۔ رنگ سا نولا تھا، بال لمبے تھے۔ مگر ان کی آنکھیں غضب کی تھیں۔ اتنی روشن آنکھیں کہ آنکھوں کا اجالا، نگالوں پر پڑتا تھا۔ میں لے تو انہی اسی کو نہیں دیکھا، ان کی تصویر بھی نہیں ہے۔ ہاں کہنے والے کہتے ہیں کہ اتنی اچھی آنکھیں میں کہاں کی نیالی ہیروئن کی ہو سکتی ہیں۔ ان دونوں کے میل سے جو بچے ہوئے وہ جیسے کچھ بھی تھے، مگر شاید میری بد نصیبی تھی کہ اپنے سب بہن بھائیوں میں متولی میں تھی۔ اور مزید سنم یہ کہ بچپن ہی سے بیمار رہتی چلی آ رہی تھی۔ تندرست اور نیک سگ سے درست بہن بھائیوں میں ایک میں بھی تھی جس کا رنگ سا نولا تھا، جسم دبلا تھا، کمر سے نیچے جاتے ہوئے بال اور بھی بھی آنکھیں۔ قد کی مناسبت سے بال بہت ہی لمبے نظر آتے۔ یوں سب لوگ مجھے چڑیں یا کالی بلی کہہ کر سنایا کرتے۔ میں شدید احساس کمتری میں مبتلا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہم عموں سے محبت نہ پا کر میں نے اپنی تنہائیوں کا سا حق کتا بول کو بتایا تھا۔

دیہ بات تو مجھے بہت پہلے ہی کہہ دینی چاہیے تھی، بیماری جمیل کر اسٹی تو اور زیاہ چڑی اور زور بخ ہوئی۔ احساس دگنا ہو گیا۔ زندگی تلخ ہو گئی۔ میں آپ سے تباؤ، ان دنوں کتا بول کا سہارا نہ ملا ہوتا آج میں یہ سب کچھ نہ لکھ رہی ہوتی۔

سب طرف سے ہار کر میں نے مطالعہ میں جی لگایا۔ اس طرح لامحالہ میں کلاس میں فرسٹ رہنے لگی۔ استانیات بہت خوش رہیں۔

میں نے اپنی ذہانت سے ایک ناجائز فائدہ میاں سٹھایا کہ مس سے یہ پریشانی حاصل کر لی کہ میں لائبریری سے جتنی چاہوں اتنی کتابیں لے لیا کروں۔ میری زندگی ہمیشہ سے بے حد فاسٹ ہے۔ دو تین سو صفحوں کی کتاب ایک ڈیڑھ گھنٹے میں ختم کر ڈالتی ہوں۔ جس کو اس پر کوئی اعتراض نہ تھا! اور یہ میری زندگی کی سب سے پہلی خوشی تھی۔ معصوم مسرت :-

ہم لوگ چونکہ بہت غریب تھے اس لئے پیدل ہی اسکول جایا کرتے غریبی میں لوگ اپنے بچاؤ کے کیسے کیسے جواز و معوضہ نکالتے ہیں۔ اگر کبھی ہم نے پیروں میں درو کی شکایت کی تو نانی اماں نے جھوٹ کہہ دیا۔ ”پیدل چلنے سے صحت اچھی رہتی ہے۔“

کتابوں کا لالچ مجھے مارے ڈالتا۔ پاؤں پاؤں چلتے چلتے پیر چھوٹے چھوٹے پیر دکھ کر رہ جاتے۔ اس پر مزید کوشش یہ کہ جلد سے جلد اسکول پہنچ جاؤں تاکہ خوب پڑھ سکوں۔ سینٹ روڈ والے بنگلے سے جب کار چکر کھاتی نکلتی تو دل کو نختہ یقین ہو جاتا کہ اللہ میاں چونکہ بوڑھے ہو چکے ہیں اس لئے انہیں اب دنیا کا انتظام چلانا نہیں سوجھتا۔ یہ تک یاد نہیں کہ کس موٹر کی ضرورت ہے اور کسے نہیں۔ خوب ہیں اللہ میاں آپ بھی۔

میں تو بس یہی سوچتی ہوں کہ خداوند دو عالم نے میرے نصیب میں کتنی کم خوشیاں رکھی ہیں۔ کچھ ہی دنوں بعد ملک تقسیم ہو گیا۔ ۱۹۴۷ء کی آمد اور ہمارا وطن چھوڑ کر جید آباد آنا۔ یہ زندگی کا بڑا عجیب موڑ ہے۔ یہاں پہنچ کر تو زندگی کے ختم کچھ اور بھی سوا ہو گئے۔ اب ہم بہنوں نے مل جل کر اسکول پاس کر لیا تھا۔ سبھی لوگ کالجوں

کو جاتے تھے۔ اخراجات پہلے سے زیادہ تھے اور ذرائع آمدنی پہلے سے کہیں کم۔ میں بہت چھوٹی ٹنٹی اس وقت نانی اماں کے ہاتھوں میں سونے کی چوڑیوں کا بھرداں جوڑا تھا۔ ۶۰ تو لے گا۔ ساٹھ تو لے کی کوئی حقیقت نہیں۔ نانی اماں نے جب ضرورت پڑی ایک ایک چوڑی توڑ ڈالی مجھے یاد ہے ہر بار جب سرو نہ لے کر نانی اماں اندھیرے کمرے میں جایا کر فی تھیں تو ان کے چہرے پر کوئی تاثر نہ ہوتا تھا۔ مگر مجھے یوں لگتا تھا چوڑی کے ساتھ میرا دل بھی کٹ جائے گا۔ کتنی بار چوڑیاں ٹوٹیں۔ کتنی بار دل کٹا۔ مگر اب تو زبور بھی نہ تھا جس کو توڑنا توڑ کر اخراجات پورے کئے جاتے۔ لے دے کر گاؤں اور زمینات کی چند ہزار کی آمدنی رہ گئی تھی۔ جس سے سال بھر تک خرچ چلتا۔ زمیندار سی سٹم لاگو ہوا تو وہ زمینات بھی حکومت کے بھک میں چلی گئیں۔

(سننے میں زبور نگھار کے کام آتا ہے۔ ہمارا زبور تو سدا رہن رکھتے زبور نے کے کام ہی آیا۔!!)

پارٹیشن کے وقت میری عمر گیارہ بارہ سال تھی۔ امر اوتی سے جید آباد کو تک کا سفر ہم نے تیرہ دن میں طے کیا۔ ان تیرہ دنوں میں میں نے تیرہ صدیوں کا تجربہ سمیٹا ہے۔ میں کس قدر بوڑھی ہوں۔ اس کا احسا سوانے میرے اور کس کو ہو سکتا ہے۔ جید آباد آکر ہم نے جو مصیبتیں جھیلیں اس کا اندازہ آپ یوں لگائیے کہ اب تک جیسے ہم شاہی زندگی گزارتے آ رہے تھے۔! مصیبتیں کیا ہوتی ہیں۔ اس کا پتہ یہاں آکر چلا۔ ہمارے پاس کھالے کو اناج نہ تھا۔ پیٹنے کو کپڑے نہ تھے۔ رہنے کو مکان نہ تھا۔ پھر بھی ہم جی رہے تھے اور خوش تھے۔ کتا میں خریدنے کو پیسے

نہ ہوتے تھے۔ فیس کا وقت آتا تو ہم کلاسوں سے باہر کھڑے کر دیے جاتے
ان دنوں میں نويس کلاس میں تھی کلاس کی سب سے ننھی طالبہ تھی اور
سب سے ذہین۔ سب سے غریب اور سب سے زیادہ بد نصیب۔ !!
جیدر آباد آکر سب سے بڑی بدھیتی یہ رہی کہ میرا مطالعہ جیسے ختم
ہو کر رہ گیا۔ لائبریری میں اس قدر اچھی اچھی کتابیں تھیں !!
اسے نہ تو خدا نیست دے۔

نويس کلاس میں ایک لڑکی تھی۔ اپنی آنکھوں لمبے بالوں، سانولی
رنگت اور میٹھی آواز کی وجہ سے کلاس بدرجہ وہ 'بگالی بنیا' کے نام
پر مشہور تھی۔ اُستایاں پیار سے اسے "خوش آواز پرندہ" کہا کرتیں۔
قوی سہیلیاں اسے "بیل" یا "کول" کہہ کر پکارتیں۔
وہ خوش آواز پرندہ میں تھا۔ ایسا لے اوروں سے اپنے بارے
میں بہت سنا سنا لیکن تبھی وہ سنا گیا تھا۔ ایک دن میں اپنی کرسی
پر بیٹھی۔ بے دلی سے کچھ کمن گناہی تھی۔ میرے بازو والے ڈریک پر ایک لڑکی
بیٹھی لائبریری سے لی ہوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ مجھے گن گناہ سن اس نے
کتاب بند کر دی اور کہا۔

"واحد ذرا زور سے تو بھی گاؤ۔"
میری نگاہ کتاب سے جا مل گئی۔ وہ ننھی پریم چند کا ناول 'سو' تھا۔
میں نے ذرا اچھٹک کر کہا۔
"ایک شرط پر۔"

"کون سی شرط؟ وہ جیران ہو کر بولی۔
"میں تمہیں گانا سناؤں گی اور تم بدلے کے طور پر مجھے یہ کتاب

پڑھے کو دد لگی ۔

شرط ایسی کوئی کر دی نہ لگی اسے ۔ میں نے اسے ایک فلمی گیت سنایا ۔
نگر سی میری کب تک پونہی بر باد رہے گی ۔ اور پھر غالب کی وہ مشہور غزل
— نسلیں کو ہم نہ روئیں جو کتاب میرے ہاتھوں میں تھی !

یہ سودا مجھے بہت سستا پڑا ۔ کیونکہ اس طرح گانا سنا دینے سے
میرا کچھ نہ بگڑتا تھا مگر مجھے بدلے میں کتابیں مل جایا کرتیں ۔ پانچویں چھٹی
ساتویں ، آٹھویں اور نویں کلاس کی تمام لڑکیوں سے یہی سودا بیچنے لگا ۔
جتنی کتابیں میں ۔ نہ ان دنوں پڑھیں ۔ ان کی تعداد تنہائی مشکل ہے دینا
اتنی وسیع ہے ؛ کتنے ہی رائٹر ز گزرے ہیں جنہوں نے کیا کچھ مہیں
لکھا ہے ؛ میں نے کیا پڑھا ۔ کچھ مہیں ۔ کچھ بھی تو نہیں ۔ مگر اپنے نام سادہ
حالات کے باوجود میں نے جتنا کچھ پڑھ لیا ہے اس پر فخر کرتا ہوں ۔
(حالانکہ میں نے سمندر سے قطرہ بھی نہیں اٹھایا ہے)

پھر پولیس ایشن ہوا ۔ پھر سے شہر میں سہلہ ڈھچا ۔ ایک سبھی
پاکستان چل دیئے ۔ ایک آگے ہی وطن میں تعلیم پوری کرنے چلے گئے تھے
نہ دماغی چین سنا ، نہ جسمانی آرام ۔ ہوا یہ کہ نتیجہ میں ہم بہنوں کو اسکول
سے اٹھالیا گیا ۔

”کیا میں پونہی جاہل رہ جاؤں گی ۔“ یہ سوال رہ رہ کے میرے
مجروح دل اور دماغ کو عجوبے کے دیتا ۔ مجھے تو تعلیم حاصل کرنے کا بچپن
ہم سے انسا شوق تھا کہ جہاں دوسری بہنیں گریاں اور ہنسنے لگیں
کھیلا کرتیں ہیں علم کے بچوں کو لے کر اسکول لگا یا کرتی ۔ پھر اندھیا
کا یہ ستم کیا تھا ۔ مافی اماں سمجھاتیں ۔

”بیاتم لوگ نید ہو۔ اللہ کے پیارے۔ اور اللہ انہی کو آزمائش میں ڈالتا ہے جو اسے پیارے ہوتے ہیں۔“

اللہ میاں سے اسی مارے بچپن سے ٹھنی رہی۔ نماز آج بھی پنج وقتہ پڑھتی ہوں۔ ہمیشہ نماز پڑھ کر بوں محسوس ہوا گو یا اللہ پر احسان فرمایا ہے۔

”وکیلہ لیانا آپ تو ہمارے لئے کچھ نہیں کرتے مگر ہم آپ کے حضور سر جھکائے جاتے ہیں۔“

ثانی اماں حج کر آئی ہیں۔ جب کبھی خد کو برا کہا انہوں نے کان پکڑا کر تو بہ کر دائی اور ہمارے گناہوں کی معافی خود مانگی۔ مگر اللہ میاں کو ”تا انصاف“ کا خطاب جو میں نے بچپن میں دیا تھا کبھی واپس نہ لیا۔

”بس فیس“ میں دیر ہوئی تو اسکول کی بس آئی بند ہوئی۔ کلاس فیس میں دیر ہوئی تو پہلے کلاس باہر، پھر اسکول باہر چلے قصہ ختم میٹرک، پھر ایف۔ اے، پھر بی۔ اے اور اب ایم۔ اے سب پرائیویٹ پڑھانے والا کوئی نہیں۔ کبھی ایک مہینے تک کے لئے کسی کی ٹیوشن نہ لی۔ جو پڑھا، دل سے پڑھا۔ امتحان دیا۔ پاس ہوئے اور خدا کا شکر بجالائے۔

ایف۔ اے کا امتحان جیتے دیا۔ دل ہی جانتا ہے۔ نہ کتا میں تھیں۔ نہ کتلا کو تھا۔ ان دنوں راشن سے چنے اور کچھ ہوئی کھجوریں ملتی تھیں۔ جن کے پاس تھا وہ تو خرید کر بلیک سے اناج حاصل کر بھی لیتے۔ ہم جیسے کہاں سے لاتے؟ جس دن امتحان دینے چلی یہ حال تھا کہ پیٹ میں اناج کا دانہ نہ تھکے نہ تھا۔ کتا میں بھی نہ مل سکی تھیں۔ معاشیات کا پرچہ سن۔ ہر لکھا تھا آج بھی یاد ہے۔ سوشیا لو جی کا پرچہ بھی یونہی کیا۔

پورے پرچے میں اشعار، سرمایہ داری کو نکالیاں۔ ایک آپا قریب سے گزریں اور سوشیا لوجی کے پرچے میں شعر لکھا پایا تو جھک کر پڑھا۔ ہنس کر بولیں۔

”کیونٹ ہو گیا۔“

میں جل کر بولی تھی۔ ”تن پر کپڑے نہ ہوں، پرٹ میں روٹی نہ ہو اور کوئی کہے کہ میں نہ لگا ہوں۔ بھوکا ہوں اور آپ اسے کیونٹ نہ کہتی ہیں تو بے شک میں کیونٹ ہوں۔“

نتیجہ آیا۔ آج تک حیرت ہوتی ہے میں پاس کیسے ہوئی! وہ نام نہاد سورج، جس کے دم سے روشنی کا تصور قائم ہے کبھی میرے آسمان پر نہ چمکا۔ میں نے جب کبھی آنکھیں اٹھا کر آسمان کو دیکھا وہاں گھٹائیں ننھی ہوئی دکھائی دیں۔ بی۔ اے کے وقت بھائیوں نے کہا۔ ”اردو بھی کوئی لینے جیسی چیز ہے۔ انا کس ہونا؟“ تو نا۔ کچھ قدر بھی رہے۔ ”بہکا دے میں آگئی۔ جس وقت کو لیچن پیر پانٹے کی بیل بھی اور پردیسر نے کہا۔

”جس جیسا انا کس میں ہو کھڑی ہو جائیں۔“ تو پورے ہال میں عرف ایک لڑکی کھڑی تھی۔ وہ بھی ایک پرائیویٹ کینڈیڈیٹ اور وہ میں تھی۔

یہ میری زندگی کی پہلی شکست تھی۔ پہلی تعلیمی شکست۔ میں آج تک کبھی فیل نہ ہوئی تھی۔ بچپن سے اب تک ہمیشہ اونچے نمبرات نے تھے۔ اتنا غم ہوا کہ آنکھ نم بھی نہ ہوئی۔ مگر اس میں کیا بری اپنی ذہانت کا قصور تھا۔ مجھے تو ڈھنگ کی ایک کتاب بھی نہ مل سکی۔ پڑھنے والے

بھلے ہی یقین نہ کریں، مگر میں نے زندگی میں کون بات جھوٹ کی ہے۔
 دوسری بار پھر لی۔ اسے میں بیٹھی۔ پھر لڑھکی۔ میرے خدا! "مجھ میں
 بہت محنت ہے کم از کم تعلیم تو ضرور پوری کروں گی اپنی۔" میں نے اپنے
 دل کو سنایا۔ ان دنوں کی بات بتاؤں، تن پر حروت ایک جوڑا ہوا کرتا تھا
 جھائیوں کی قمیص پنلون پہن، میم صاحبہ، وہ جوڑا دھوتی اور پھر
 امتحان دینے سے دھلی دھلائی ساڑھی پہن کر جاتی۔ غریبی کے
 داغ کس نے دیکھے ہیں۔

اچھی طرح یاد ہے سچ پرچہ تھا۔ رات کو ہم لوگ بھوکے ہی سوئے
 تھے۔ اچانک وطن سے بھائی آچکے۔ یہ بھائی بڑے دھیت واقع
 ہوئے ہیں۔ اتنے ہی کہا۔

"بڑی بھوک لگ رہی ہے۔ کھانا لاؤ۔"

میں رضائی سے چہرہ باہر نکالے چیت کو دیکھتی پرسی تھی۔ ان کی
 بات سنکر بیٹھے چہرہ بھی رضائی میں چھپا لیا۔ تھوڑی دیر تک تو وہ بیٹھے
 انتظار کرتے رہے، پھر جانے کیا سمجھ کر اٹھے اور باہر نکل گئے۔ باہر سے
 آنے تو ہاتھوں میں کیک، پیسری اور ساٹی اسٹیکس کے پکیٹ تھے۔ میں
 نے آہٹ پا کر آنکھیں کھولیں۔ انہیں لدا پھندا دیکھا تو پھر سے سو گئی
 بیج میری آنکھیں خون رنگ تھیں۔ سب کہتے ہیں۔ میں اپنی ماں پر گئی
 ہوں۔ میرا رنگ مائل ہے مگر اس صبح میں نے آئینہ دیکھا تو چہرہ زرد
 چاند مر رہا تھا۔

میں نے امتحان دیا۔ نتیجہ آیا۔ پاس بھی ہو گئی۔ زندگی کی کافی
 بڑی تمنا تھی کہ گریجویٹ ہو جاؤں۔ ہو سچی گئی۔ مگر ولی کو جیسے گھن لگ گیا۔

زندگی سے دل بھر گیا۔ ہر وقت روتی رہتی۔ دو ایک بار خودکشی کی کوشش کی۔ ایک بار زہر کی بوتل منہ تک لے بھی گئی۔ مگر افروز (میری چھوٹی بہن میری دوست) نے دیکھ لیا۔ روتے روتے آنکھیں دھندلا گئیں۔ میرے انتہائی لمبے لمبے بال، جن کی وجہ سے میں بچپن میں چڑیل اور پھر بعد میں ”لمبے بالوں والی واجدہ“ کے نام سے مشہور تھی۔ جبراً جھڑکا کر ڈیڑھ ہاتھ کے رہ گئے۔ کھانسی رہنے لگی۔ اور دن دن بدن گھٹنے دکھ۔ نانی اماں ایک دن ڈاکٹر کے پاس لے گئیں۔ اس نے صاف کہہ دیا۔

”اگر بٹیکے علاج پر توجہ نہ دی تو خطرہ ہے۔ یہ راستہ ایک نڈانگ گھاٹی میں جا کر ختم ہوتا ہے۔“ نانی اماں سہم گئیں۔ ڈاکٹر کہہ رہا تھا۔ ”مری کے چوروں کا سوپ پلائیے۔ سپل دیجئے۔ دودھ پلائیے۔ اور۔ اور۔ اور۔ اب میں یہ آپ سے بتا رہی ہوں کہ ڈاکٹر نے ٹانگ اور گولیاں لکھ کر دیں۔ لڑکے۔ بچے۔ ان دنوں پہلے ہال کیم کھاری کھانا پکتا تھا۔ پہلے یا بعد کا سوال ہی باقی نہ رہ جاتا تھا۔ دڈا ٹانگ اور گولیاں مدتوں پڑی رہیں۔ ابھی کچھ دنوں پہلے میں، افروز اور آپلی مل کر گھر کی صفائی کر رہی تھیں تو میں نے دڈا ٹانگ اور گولیاں پھینکی ہیں۔ (مگر ان یادوں اور آہوں کو نہ پھینک سکی جواتنے ہی دنوں سے دل کو چھید رہے ہوئے ہیں)

آہی دنوں دلی سے ایک ویکی ”آئینہ شائع ہونے لگا۔ اس میں ایک مسترل عنوان ہوا کرتا تھا۔ میری یادداشت سے۔ اس کے تحت کوئی ناقابلِ فراموش واقعہ انہی یادداشت سے چن کر لکھنا پڑتا تھا۔

میرے بیٹے بیٹھے ایک دن یونہی وہ واقعہ لکھ ڈالا جو مجھے انسر کا امتحان دیتے وقت پیش آیا تھا۔ اس دن مجھے ایسا سکون ملا جو میں کبھی نفلوں میں بیان نہ کر سکوں گی۔ اس احساس کو، اس کیفیت کو بیان کرنے کے لئے شاید مجھے نئے الفاظ وضع کرنے پڑیں گے۔ جو میرے اپنے بس کا روگ نہیں۔ اس رات جب وہ روداد لکھنے کے بعد میں اپنے بستر پر لیٹی تھی تو مجھے یوں لگا تھا جیسے میں، جو ایک مدت سے کڑی دھوپ میں چلتی آرہی ہوں، آج ٹھنڈے سائے تلے آگئی ہوں۔!

یوں میری افسانہ نگاری کا آغاز ہوا۔

میرے اپنے ذاتی دکھ کے علاوہ بھی کئی واقعے اور حادثے ایسے تھے جنہوں نے میرے دل کو کمرچی کمرچی کر رکھا تھا۔ اب میں بڑے انہماک سے انہیں نفلوں کا روپ دیتی اور چھپوانے کو بھیج دیتی۔ ابھی میری چند کہانیاں ہی چھپی ہوں گی کہ اکدم سے جیسے تہلکہ مچ گیا۔ ادبی حلقوں کا ذکر میں یہاں نہیں کر رہی ہوں، اپنے خاندان والوں کی بات: رہی ہوں۔ ممکن ہے آپ سوچیں کہ خاندان والے اب اتنی بھی اہمیت نہیں رکھتے جتنی گما رہی ہوں۔ مگر یہ سوچئے! ہم آٹھ بہن بھائیوں کو نانی اماں نے پالا۔ اکیلی جان اور آٹھ وجود۔ ماں باپ مرے اس وقت سب سے بڑی اولاد دس برس کی تھی۔ اتنے سارے روتے ٹکلاتے بچے، بن کی تعلیم تربیت، دکھ درد، اچھے برے میں بس نانی اماں ہی ستمیں۔ کوئی کسی کا سنگی سا تسلی نہیں ہوتا اس لئے میں خواہ مخواہ رشتے داروں، خاندان والوں کو یہ کہہ کر شرمندہ کیوں کر دوں کہ انہوں نے ہمارا ساتھ نہیں دیا۔ ہر انسان کی اپنی اپنی قیمت ہوتی ہے۔

اور اس کے اعمال اس کے اپنے ساتھ کسی پر یہ فرض عائد نہیں ہوتا کہ کسی کا ساتھ دے، اس کی قسمت بنائے۔ مگر نانی اماں خاندان والوں سے یوں ڈرتی تھیں کہ اگر کھانا کھلاں کو ہم جاہل رہ جاتے اور میری صحت میں پڑ کر ناسارہ ہو جاتے تو یہی خاندان والے طعنے دیتے کہ "دیکھا ہے؟"۔
 کیسے اولاد کی تربیت کی ہے۔ "اس ایک طعنے سے بچنے کے لئے نانی اماں نے کیا کیا جتن نہ کئے۔ "نانی اماں خاندان تھیں مگر میں نے انہیں سجدے کئے ہیں، تو جناب میں آپ سے تیار ہی ہوتی کہ اب ادھر ادھر جو دو چار میری کہانی لکھیں تو گویا زولہ ہی آگیا۔

"واجبہ بیگم نے تو عمت کو سبھی مات دیدی۔"

"ارے یہ افسانے کہیں شریفنا بہو بیٹیوں کے پڑھنے کے لائق ہیں؟"
 "اس کے افسانے تو شادی شدہ عورتیں بھی نہیں پڑھ سکتیں۔"
 "دیکھنا ایک دن، باپ کی ناک کھو اگے رہے گی۔"

"میری بیٹی اب اسے لکھتی تو اپنے ہاتھوں گلا گھونٹ دیتی۔"

یہ مقدمے دھیرے دھیرے نانی اماں کی عدالت میں آنے شروع ہوئے پہلے تو بات دہلا دلی رہی پھر زور و شور سے میرے خلاف جمانے لگے کسی سلسلے میں نانی اماں وطن گئیں، وہاں لوگوں نے خوب مان بھرے، واپس آئیں تو نانی اماں مجھ سے سخت برہم تھیں۔

انہی دنوں میری کہانی "تین جنازے" چھپ کر آئی تھی۔ نانی اماں پرچہ لے کر آئیں اور ڈٹ گئیں کہ "میں تو یہ کہانی ضرور سنوں گی۔"

تھا تو کیا لکھتی ہے؟ "کہانی آپ کے سامنے ہے، بتائیے سچا میں یہ کہانی شاکستہ تھی۔ میرا قصور یہ تھا کہ میں نے اس سچ حقیقت کو کہانی کا روپ دیا۔"

اب میرا کام یہ تو نہ تھا کہ کہانیاں سناتی چھرتی۔ میرے نہ سنانے پر نانی اماں کو شبہ ہو گیا۔ بلکہ یقین ہو گیا کہ یقیناً ”ایسی ویسی“ کہانیاں یہ کھنتی ہے تب ہی تو سنا نہیں سکتی۔ میں نے گھبرا گھبرا کر اپنے ڈیفنس میں کچھ کہنے کی کوشش کی، مگر بے سود۔ اب جناب یہ معیبت کہ جہاں میں نے قلم کا غدہ باندھا یہ لیا نانی اماں آ موجود ہوئیں۔ ”تاکہ لکھ رہی ہے؟ سنا کیا لکھ رہی ہے؟“ نانی اماں پڑھی لکھی نہیں ہیں مگر انہیں چلا دینا بڑا مشکل کام ہے۔ اگر میرے ہاتھوں میں لیا چوڑا کاغذ ہے یا کاغذ دلہا پلندہ ہے اور میں نے کہہ دیا کہ خط لکھ رہی ہوں تو وہ کبھی یقین نہ کریں گی۔

”خط اتنے بڑے بڑے لکھ جاتے ہیں۔ ضرور کہانی لکھ رہی ہے۔“
اب معیبت یہ رہی کہ ایڈیٹر دل کے جو خط آتے اور جاتے سب کچھ نانی اماں سنس کرتیں۔

محترمی ایڈیٹر صاحب۔

آپ نے کہانی مانگی ہے۔ اس وقت تو نہیں ہے۔

جب لکھوں گی فوراً بھجوا دوں گی۔

”کیا لکھا۔ جب لکھوں گی۔ مگر یہ کہنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟“

پھر کسی نامراد، بکتے۔ بیوقوف ایڈیٹر کا خط آگیا کہ کہانی مل گئی۔
اے کمبخت مل گئی تو بلا لالہ دینا کوئی غرور تھا یہ جیسے اب نانی اماں سن رہی ہیں۔

”کہانی مل گئی۔ آپ نے کمال کر دیا ہے۔ وہ دن دور نہیں جب

آپ آسان ادب کا سورج بن کر چمکیں گی۔“

”یہ کہانی کب سمجھوائی تھی۔“

یہ کڑا محاسبہ۔ اسجد از زندگی اجیرن ہو گئی۔ میں نے دل سے، حالاً سے سمجھوتہ کر لیا۔ ”اب سے کبھی کوئی چیز نہ لکھوں گی۔ کون یہ جو حکم مولیٰ ہے۔ کوئی زندگی سی زندگی ہے۔!“

کئی دن گزر گئے، میں نے کچھ نہ لکھا۔ ایک دن ماموں لشرٹیف لائے پاسٹری سے بڑا راکٹاؤ ہے۔ انہیں۔ میرا ہاتھ دیکھا۔ پہلے تو خاصی بکواس فرماتے رہے۔ پھر سیرس ہو کر بولے۔

”اڑی سچ ملکہ تیرے ہاتھوں میں ایک خاص بات ہے۔ تجھے ضرور شہرت ملے گی۔ اور مہبت ساری۔“

میں نے آزدہ ہو کر اپنا ہاتھ کیٹنے لیا۔ ”ماموں میرا دل نہ جلیجے ہاتھ آجیا موقع تو کھو گیا۔ اب کون شہرت کا تک ہے۔“

اس شام نانی اماں کہیں مہمان گئیں تو میں اپنی قسم سچول گئی اور ایک کہانی نوراً لکھ ڈالی۔ ”آگ میں سچول۔“ لفافے میں بند کر کے کھ سبھی لی۔ دوسرے دن چوری سے نوکر سے ہاتھ میں لفافہ دیا تو جانے کیسے نانی اماں کی نظر پڑ گئی۔

”یہ کیسے۔“ وہ ڈپٹ کر بولیں۔

وہ جھوٹ کیوں بولتا۔؟ صاف کہ گیا۔ ”ملکو بی بی نے کھٹائیے بولے غیب چپ ڈال کر آجا۔“

اس سگھت ”غپ چپ“ نے وہ آگ لگائی کہ پوچھے نہیں۔ دوسرے ہی لمحے آگن جی آگ اور سچول بکھرے نظر آ رہے تھے۔ میرے خدا۔ میں سہم کر رہ گئی۔ بزدل رہ گئی۔

پھر ایک سچو سچی آئیں۔ میرا ذکر بیچ میں آیا۔ میرا نام زیر بحث آیا۔
"اچھا تو اسی کا نام واجدہ تبسم ہے۔"

ابو نے میرا نام واجدہ بیگم رکھا۔ امی کو جلنے مجھ میں کیا رایل ہونے
کے آثار نظر آئے۔ کہا میں تو اپنی اس بیٹی کا نام ملکہ رکھوں گی۔ بچہ ماں کا
زیادہ ہوتا ہے۔ باپ کا کم۔ اسی کا رکھا نام چل نکلا۔ بگڑا فوکسی نے ملکہ کہنا
شروع کیا کسی نے سنا دیکھی نے ملکی۔ مگر جب اسکول میں داخلہ کی نوٹ آئی
تو بیاد الا نام لکھا گیا۔ "واجدہ بیگم"۔ مگر جب میں نے لکھنا شروع کیا تو خود
کو واجدہ تبسم بنایا۔ صاف بیدھی بات ہے، زندگی نے مجھے غم ہی غم دے دیے
میں اپنی زندگی میں مسکراہٹیں بھر لینا چاہتی تھی، زور یہی کیا بھی۔ اس طرح
خود میرے خاندان میں بھی پہلے پہل بہت کم لوگوں کو پتہ چلا کہ میرا ہی نام،
"واجدہ تبسم" ہے۔

ہاتھوں ہاتھوں بس "تین خزارے" کا ذکر آگیا۔ کہنے لگیں۔ "کہانی تم لے
ہی نکھی ہے نا۔"

میں ڈر کر صاف جھوٹ بول گئی! جی نہیں دے تو نکر تو خوس نے لکھی ہے،
جن زمانے میں شاہراہ میں وہ کہانی چھپی اسے فکر صاحب ایڈٹ کیا
کرتے تھے۔ گھبراہٹ! اب جو منہ سے نکلا وہی کہہ گئی۔ "مگر کہانی پر نام تو تمہارا
دیا ہوا ہے۔"

اب کے میں بہت معترا نڈاز سے جھوٹ بیچانے لگی۔ "مجھے نا وادھل
ہوتا یوں ہے۔۔۔" میں نے اس قدر الٹ پلٹ بانیں کیں کہ بعد میں خود اپنی بے بسی
پر بھی کور و نا آگیا۔ کتنی عجیب بات تھی کہ میں انہی کہانی کو اپنی نہیں کہہ سکتی
تھی۔ دل کا سارا اعتبار آنکھوں کے راستے نکل پڑا جاتے جاتے جب وہ سمجھانے

لگیں تو یہ بھی کہا۔ "دیکھو بیٹا ہم تمہارے ہی بھلے کی کہتے ہیں۔ تمہارا خاندان دیکھو۔"

ابھی وہ کچھ کہتی تھیں کہ آدم واجدہ زور سے بول پڑی۔ "کہے گی تو میرے باپ کی ناک کاٹے گی، آپ کا کیا بچہ بیگا۔ جب میرا باپ مرا تھا اور نانی نالہ اکیلی رہ گئی تھیں، تب آپ کو ہمارے بھلے کی نہ سوچھی۔ اب ہم کسی قابل ہوئے ہیں تو آپ کیوں اپنا سلیت خٹانے آن پہنچی ہیں؟"

وہ یقیناً بہن نہ تھیں۔ واجدہ تھی۔ جو ایک کہانی کہنے والی تھی۔ بڑا بچہ مستقبل کے لئے جدوجہد کرنا چاہتی تھی۔ کیونکہ مجھے اعزاز تھا کہ میں جو ہوں تو ایک بہت ہی بزدلی لڑکی ہوں۔ ہاں جناب! اس دن ڈول چھلکا، اور البیا چھلکا کا کچھ کسی لے میرے سامنے کچھ نہ کہا۔ مگر میرے پیچھے تو کہتے ہی رہے۔ وہ بھی جو کہنا چاہیے۔ اور وہ بھی جو نہ کہنا چاہیے۔

میں پہلے واجدہ تھی۔ پھر تبسم بنی۔ مگر اس ایک مسکراہٹ کے لئے آٹھ مہریں آنکھوں سے پٹکے۔

ایک بار ایسے ہی کسی موقع پر میں نے ایک اور نام نہاد عزیز سے کہا۔ "حقاً۔" جی آپ تو آپ ہیں۔ اگر تیرے میرا باپ اٹھ کر آجائے تو بھی میں اٹھ کر لکھنا نہیں چھوڑوں گی۔"

یہ بڑی عجیب و غریب بات ہے کہ یہ ساری باتیں چار سال پہلے کی ہیں۔ اور جو پہلے ڈرتے تھے کہ واجدہ خاندان کی، رشتہ داروں کی ناک کٹا دے گی، اب میرے پیچھے اپنے طے والوں سے فخر یہ کہتے پھرتے ہیں کہ "ارے وہ واجدہ تبسم! میری بھینجی ہے۔ بڑی بوہنہ لڑکی ہے۔"

ہاں ہاں وہ واجدہ تبسم! میری عزیز ہے۔ بڑی اچھی کہانیاں لکھ رہی ہے۔

اس کے باپ تو میرے دوست تھے۔ خاندان کا نام روشن کر دیا بیٹانے۔
 آپ یقین کریں مجھے ان باتوں سے نہ خوشی ہوتی ہے نہ فخر محسوس
 ہوتا ہے۔ رنج بھی نہیں ہوتا، غصہ فردا آتا ہے۔ اور میں تو بچپن ہی سے
 تنگ مزاج ہوں۔ بس جی چاہتا ہے جو لوگ میرا نام لے لے کر فخر محسوس
 کرتے ہیں ان سے کہہ دوں۔

”معاف کیجئے آپ سے میرا کوئی رشتہ نہیں ہے۔“

پہلے کے مقابل اب حالات کافی بدل چکے ہیں۔ مگر سچ بھی نانی
 اماں مجھ سے تھوڑی بہت بدگمان فرور ہیں۔ انہیں ایک بستی بیت یہ ہے
 کہ میں انہیں انہی کہانیاں نہیں سناتی۔ اور صاف سیدھی بات تو یہ
 ہے سبھی اپنا پوتا نہیں جو نانی اماں کو کہانی سنا سکیں۔ ایک بار، بار بار
 کے کہنے پر، افرور نانی اماں کو میری کوئی کہانی سنانے بیٹھی۔ اس میں لونا
 محبت اس انداز سے آیا کہ نانی اماں گر پڑ گئیں۔

”ہیں۔ کیا پڑھا، محبت۔ کس کو محبت۔ کس سے۔ اچھا
 تو یہ بات ہے۔ یہ عشق عاشقی کی کہانیاں لکھی جاتی ہیں۔ ہوں تو یوں کہو۔“
 اسی لئے میں کہانیاں سب سے چھپ کر لکھتی ہوں۔ ایک بے حد
 نازک اور اندھیار سے گزرنے میں۔ اگر آئین سے ہو کر کوئی اس کمرے میں
 آئے تو دکھائی بھی نہیں دے سکتا کہ کوئی تنہا تنہا ہے۔ بانو
 (جیلانی بانو) جب پہلی بار مجھ سے ملنے میرے گھر آئی تو اس نے وہ جگہ
 دیکھنی چاہی، جہاں بیٹھ کر میں ”ادب تخلیق“ کیا کرتی تھی۔ پہلے تو اسے
 یقین ہی نہ آیا کہ ایسی داستان جگہ بیٹھ کر کوئی سانس بھی لے سکتا ہے۔
 مگر جب میں نے اسے لٹا ہوا پین، رنگ آلود چاتو، چھوٹی ٹیسی دوات،

وال آدمی پنسل کا ٹکڑا ادا کرتا نہ آئے ہوئے رسالوں کے ساتھ فرشتے پر بے شمار سیاہی کے جھپٹے پڑے ہوئے دکھائے تو اسے یقین کرنا پڑا گھر جا کر اس نے لکھا تھا۔

”دجو چندا۔“

بیرا مشورہ ہے کہ تم اس کو نئے سے نکال کر آسمان تلے آ جاؤ
اگر سورج کا اجالا بھی تمہاری کہانیوں میں آ جائے تو
کیا کہنے۔“

میں نے اس سے کہا تھا۔

میں کسی سورج کی مرہونی منت نہیں ہونا چاہتی۔ میں خود سورج
شکر اس کو نئے کو منور کر دوں گی۔ ”سو منہ بن جائے گی یہ تمنا میرے دل
میں آج بھی موجود ہے۔“ باؤ کے منادہ اور سبھی بیرون نے مجھ سے یہ بات
کہی ہے۔ میں مرث گھر بلو کہانیاں لکھتی ہوں۔ ”یری کہانیوں میں کوئی
خارجی مسئلہ نہیں ہوتا۔ آخر دنیا میں اور بھی تو موضوع ہیں۔“

یہ بات نہیں کہ مجھے غور توں کا ایسی کہانیاں لکھنا پسند نہیں جن
میں کسی بڑے اہم موضوع کو سمجھایا ہو۔ جیسے امن، جنگ، ہڑتال، یہاں
کسی موضوع کی قید نہیں۔ ہزاروں موضوع اور مسائل ایسے ہیں جن پر لکھا
جا سکتا ہے۔ مگر میں یہ کہتی ہوں کہ اگر ہم گھر میں بیٹھ کر چر لہا بانڈی کر سکتے
والی عورتیں، جنہوں نے بازار کی شکل تک نہیں دیکھی، یوں ایسی کہانیاں
کہنے لگیں جن میں امن کا ذکر ہو۔ کسی جنگ، کہ تو عیسیٰ ہر یا کید و نرم یا کسی اور
اوم کا پردہ پگینڈہ ہو تو کسی قدر غلط سی بات ہوگی۔ یہ بات طے ہے کہ آپ
اس وقت تک کسی مسئلے پر کامیابی سے نہیں لکھ سکیں گے۔ جب تک کہ آپ

نے شے متعلقہ سے گہری واقفیت حاصل کر لی ہو۔ اگر میں یہاں چید رآباد
دکن میں بیٹھ کر کراچی کے غنڈوں پر کوئی کہانی لکھنا چاہوں تو کیسی ہمورد
بات ہوگی۔ میں کسی کے میدان کو محدود نہیں کرتا چاہتی، صرف اپنے
متعلق کہہ رہی ہوں کہ میں ایسے کردار کبھی نہیں چنوں گی جن کے بارے
میں مجھے کچھ بھی علم نہ ہو۔ کرشن چندر "ہمالکشی کا پل" ایسی کہانی بڑی
خوبصورتی سے لکھ سکتا ہے۔ کیونکہ اس نے نہ صرف سچی دیکھی ہے، بلکہ
وہ مرد ہے اور اس نے ہار کی سیر بھی کی ہے۔ ایسے میں اس کے قلم سے جو
کہانی نکلے گی بڑی پختہ ہوگی۔ کوئی بات ایسی نہ ہوگی جس کے متعلق کہا
جاسکے کہ "سٹر آپ نے کبھی بھٹی کی گلیاں دیکھی ہیں؟ کبھی نعرے لگائے
ہوئے جلوسوں کے ساتھ گھومے ہیں۔" برخلات اس کے اگر آپ
کرشن سے پوچھیں کہ "بریاں ہیں کتنی سرخ مرچیں ڈالتے ہیں؟" اور وہ
یہ جواب دیں کہ "سیر سبکی بریاں ہیں، آدھو پاؤ مرچیں" تو یہاں ان کے
"مشاہدے اور تجربے" کی پول کھل جائے گی۔ آپ جانیں بریاں ہیں
مرچ تو پڑتی ہی نہیں۔ کرشن بریاں نہیں پہا سکتا، میں ہمالکشی کے پل
پر کوئی کہانی نہیں کھڑی کر سکتی۔ کیونکہ ہم دونوں کے میدان الگ
الگ ہیں۔ خود اپنے سے بھی، اور بڑھتے دالوں سے بھی، یوں بے ایمانی
کہہ کے فائدہ ہی کیا ہے؟ کیا اس سے اچھا یہ نہیں ہے کہ ہم صرف انہی
موضوعات پر قلم اٹھائیں جن کے بارے میں ہم اچھی طرح جانتے ہیں اور
ہمارے دلی کو یہ ڈبکا بھی نہیں رگارتنا کہ ہمیں ہم ادب کے نام پر دھوکہ
بازی تو نہیں کر رہے ہیں۔
لوگ مجھ سے کہتے ہیں۔ "تم کب تک گھر کی چار دیواری میں بیٹھی

رہوں گی۔ باہر نکلو، دنیا میں گھوم پھر کے دیکھو کیا ہو رہا ہے اور پھر
 اچھی اچھی کہانیاں لکھو۔ تمہاری کہانیوں میں تو آج کے وہی انجیل سی
 بنائیں ہیں۔ ”چلے مان لیا کہ میری کہانیوں میں وہی ایک سی باتیں ہیں۔ مگر
 دنیا یہ بھی سنبھلے۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ میں ہوش و حواس کے عالم
 میں، ریل میں پہلی بار، صرف تین سال پہلے بیٹھی ہوں۔؟ پارٹیشن کے
 وقت تو پتہ نہیں کیسے ہم جید ریل واد تک آ پہنچے، مگر جہاں تک ہوش و
 حواس کا سوال ہے میں نے ریل کی شکل صرف تین سال پہلے دیکھی ہے۔
 یہ سوال آپ کو قطعی غیر ضروری نظر آئے گا۔ مگر آپ یوں بھی تو سوچیں کہ
 وہ لڑکی، جو خود کو بڑھیا کہتی ہے، جو پہلی بار بڑھاپے میں ریل میں
 بیٹھی ہو۔ وہ دنیا کے متعلق کیا سوچ سکتی ہے۔؟ کیا لکھ سکتی ہے شاید
 ریل میں بیٹھنا نصیب ہوتا بھی نہ، مگر سبیا کی شادی ناگپور میں ٹھہری۔
 برات لے کر توجانا ہی تھا۔ میں نے پلیٹ فارم کے بارے میں بڑے بڑے
 اندازے لگا رکھے تھے۔ لیکن جب دیکھا تو سخت مایوسی ہوئی۔“ ارے ہاں
 اسی دہائیات سی چیز کے اتنے ڈھنڈورے تھے۔؟ پلیٹ فارم ایسا
 اور پلیٹ فارم دیا۔ خاک بھی گلیم نہ تھا کم بخت میں!“ اب ریل میں
 بیٹھی ہوں تو یہ عالم ہے کہ مارے ڈر کے دم نکلا جا رہا ہے، کیونکہ ریل پل
 پر سے گزر رہی ہے۔ گھر گھر دھڑ دھڑ کی وحشت ناک آوازیں! اور
 مجھے ہر لمحہ یہ ڈر محسوس ہو رہا ہے کہ بس ابھی ابھی ریل پانی میں گر پڑے گی۔
 قریب بیٹھا ہوا ایک کرسمسین جھٹاکر بولا۔

“O Gosh! The most Coward Creature I've
 ever Seen!”

(ادگاش — دی موٹ کا ورڈ کیمپچر آہیو ابورسین !)

جس راکی کے بارے میں ایک غیر ملکی یہ دیوارک پاس کرنا ہے، اس سے

آپ یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ باہر کی دنیا پر کہانیاں لکھے، یا نابا بانا — یہ ہم سے نہ ہوگا۔ ایسا کیا ہم مرے جا رہے ہیں۔ جب وقت آئے گا اور دنیا کو گھوم پھر کر دیکھیں گے، تب لکھ لیں گے ایسی کہانیاں۔ جب مرنے کا سیزن بنتا۔ تب تو نہ مرے، اب کیا مر سیکے۔ اب تو جینے کے دن آرہے ہیں۔

دیجے آپ یقین مانئے آپ میرے کوئی میری کہانیوں کو برا کہنا ہے تو مجھے ذرا سبھی دکھ نہیں ہوتا۔ (اور آپ میں سے بہت کم ایسے ہیں جنہوں نے میری کہانیوں کو برا کہا ہے۔) اگر اب اچھا کہہ دیجئے ہیں تو خوشی بہت مل جاتی ہے۔ اور یہ خوشی مجھے یوں ملتی ہے کہ میرے جن کرداروں کو آپ کے سامنے پیش کیا ہے انہوں نے کسی نہ کسی طرح آپ کو متاثر ضرور کیا ہے۔ ایسے میں اس دکھ اور کرب کو بھول جاتی ہوں جو کہانی لکھنے سے مجھے پیش آیا تھا۔ (میں نے آپ سے کہا ہے تاکہ مجھے کہانیاں لکھنے میں کسی قسم کی "محنت" نہیں کرنی پڑتی۔ میں نے اپنی طویل سے طویل کہانیاں سبھی ایک ہی *Silencing* میں لکھی ہیں!) "غیر ممنوع" میری وہ کہانی ہے جس کے کردار مجھ سے، میری زندگی سے، میرے دل سے سب سے زیادہ قریب رہے۔ یہ کہانی میں نے بڑی مشکل سے لکھی ہے۔ آپ میرے دکھ کا اندازہ شاید نہ لگا سکیں کہ جب یہ کہانی لکھ رہی تھی۔ میرا دل کیسے کیسے روتا تھا۔ (پڑھنے والوں نے مجھ سے کہا کہ "اے کہانی شاید اب تم کبھی نہ لکھ سکو گی۔" (مگر مجھے اپنی زندگی کی سب سے زیادہ غمناک اور خون دلائے والی کہانی جو محسوس ہوتی ہے وہ "گلستان سے قبرستان تک" ہے)

کالے بادل " لکھتے سے میں جس کرب اور امتحان سے گزری اس نے مجھے تین چار راتوں تک سونے نہ دیا۔ پیسہ کتنی حقیقت ہے۔ مگر پھر بھی اس کو سجدے کے جلنے ہیں۔ لیکن عجیب و غریب بات ہے خدا نے خود ہی انسان کو پیدا کیا اور خود ہی اس کی زندگی میں غم ہی غم بھر دیئے۔ ہم کوئی ہیں؟ کیوں ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ اس دنیا میں کس لئے بھیجے گئے ہیں؟ یہ سب باتیں سوچتے سوچتے کبھی کبھی میں *Parade* ہونے لگتی ہوں۔ پھر سوچتی ہوں اگر میں خدا ہوتی تو؟ شاید میں دنیا کو اتنی تباہ حال نہ رکھتی۔ میں سمجھتی ہوں حالات سے مغلوب ہو کر ہر دکھی دل ایک نہ ایک بلکہ خدا بن جانے کے بارے میں سوچنا ضرور ہوگا۔ مگر پھر خیال آتا ہے کہ بڑی اچھی بات ہے جو میں خدا نہیں ہوں، ورنہ مجھے ایسے دکھی دلوں کی اتنی باتیں سننی پڑتیں کہ چوتھے ہی دن آسمان سے انزائی اور سیدھی سادی، واجدہ تبسم بن جاتی۔ مگر انسان بن کر تو کہیں جائے فرار نہیں۔ اس دنیا میں اپنی جہلہ محرومیوں اور ناکامیوں کے باوجود رہنا ہی پڑتا ہے۔ جنیا ہی پڑتا ہے۔ مسکرا نا ہی پڑتا ہے۔ بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ تو میں یہی کہہ رہی تھی جناب کہ مجھے کہانی لکھنے میں عینت تو نہیں کرنی پڑتی، ہاں شدید کرب سے اکثر گزرنا پڑتا ہے۔

"شہر ممنوع" "گلستان سے قبرستان تک" "ساتواں شہزادہ"۔

"کالے بادل"۔ "پاندان"۔ "گناہوں کی پاداش"۔ "آگ میں پھول"

یہ اور ایسی کتنی ہی کہانیاں کہانیاں نہیں جتنی جاگتی حقیقتیں تھیں جنہیں میں نے لفظوں کا جامہ پہنایا اور آپ نے کہانیوں کا نام دیا۔

ابھی چار سال پہلے ہی کی تو بات ہے کہ ۲۶ ستمبر کو میری

پہلی کہانی چچی ختی۔ اور اب چار سال بیت گئے ہیں۔ ان چار سالوں میں داد بہت ملی۔ ”بے داد“ کچھ نہیں۔ خود ستائی نہیں کر رہی ہوں۔ لیکن جانے کیوں محسوس ہوتا ہے کہ مجھے اپنے مستقبل سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ یہ جانتی ہوں کہ میں نے ابھی کچھ نہیں لکھا ہے، کچھ سچی نام پیدا نہیں کر سکی ہوں۔ لیکن سوچتی ہوں نا کوی کی انیٹوں سے ہی تو کامیابی کا محل کھڑا ہوتا ہے۔ پیچھے رٹ کر دیکھتی ہوں تو اتنی ساری کٹھنایاں اور مصیبتیں جمیل کر ٹرے چلے آنے کا احساس شدید سے شدید تو ہو جاتا ہے اور یہ یقین پختہ ہونے لگتا ہے کہ اب میں زندگی سے کبھی باز نہیں مان سکتی۔

رہی آپ کی یہ بات کہ مجھے اور دوسرے موضوعات پر بھی لکھنا چاہیے۔ تو میں آپ سے تباؤں، دنیا کو قریب سے دیکھنے اور لکھنے پھرنے کی تمنا تو میری بہت پرانی تمنا ہے۔ میری یہ تمنا پوری ہو جائے، میں آپ کی خواہش کا ضرور احترام کروں گی۔ ابھی ابھی تو ایک کچھ پیچھے اڑنا سیکھا ہے۔ اگر آپ ابھی سے اس سے یہ توقع کرنے لگیں کہ وہ آسمان تک پرواز کرنے لگ جائے تو بے چارہ تھک کر زمین پر نہ آ پڑے گا۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ ”عجیب ہے یہ لڑکی سخی۔ اپنے تعلق سے جو کچھ کہلانا تھا، سب خود ہی کہہ ڈالا۔“

جی ہاں بس میں یہی نہیں چاہتی کہ کوئی میرے متعلق وہ سب کچھ کہے جو بہت ہی فارغ ہوتا ہے۔ ہمارے ادب میں ’پیش لفظ‘ کی دیا بہت عام ہورہی ہے۔ مجھے ہمیشہ سے پیش لفظ پڑھنے سے چڑھ رہی ہے۔ مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس طرح قاری کی رائے ہمیشہ متاثر ہو جاتی ہے۔

وہ اپنی بیچ سے الگ ہٹ کر سوچنے لگتا ہے۔ اور یوں عادی کی بات جانے
 بھی دیجئے تو مجھے سرے سے یہ سلسلہ ہی نا پسند ہے۔ بھئی آخر کیا فرد
 ہے کہ ہم نے جو کچھ بھی لکھا ہے اس پر کسی نہ کسی ”بڑے آدمی“ کے نام کا
 لیبل بھی ضرور لگا ہوا میں نے تو ان ”راہوں“ کو بھی روا نہیں رکھا
 ہے جو ڈسٹ کو پر بڑے بڑے ادیبوں اور نقادوں کی طرف سے چکا
 دی جاتی ہیں۔ ویسے آپ یقین مانیں کہ میرے پاس کسی ”بڑے لوگوں“
 کے ایسے ایسے خط موجود ہیں جن میں میری افسانہ نگاری کے تعلق سے
 بڑی خوبصورت باتیں کہی گئی ہیں۔ یوں بھی میرے آس پاس اتنے سارے
 شفیق اور مہربان چہرے موجود ہیں کہ ان سے اگر سبوتوں بھی ”کچھ“
 لکھنے کو کہہ دیتی تو بلا مبالغہ وہ ایک طویل سا پیش لفظ میرے لئے لکھ دیتے۔
 لیکن مجھے اس تصور سے ہی الجھن ہوتی ہے۔ پیش لفظ دراصل پڑھنے والوں
 کو بہکانے کا خوبصورت طریقہ ہے، اور مجھے چپ قسم کی سبیلٹی سے ہمیشہ
 بڑی نفرت رہی ہے۔ انسان میں اگر آگے بڑھنے کی دھن ہے تو اسے چاہیے
 کہ اپنے ہی بل بوتے پر بڑھے۔ کسی کی کار میں بیٹھ کر راستہ طے کرنے کی بجائے
 میں اس چیز کو کہیں زیادہ پسند کروں گی کہ لڑکھڑاتے ادیبوں سے نعم
 ہی اپنی منزل کو پہنچوں۔ !!

واجدہ تبسم
 ۲۹ دسمبر ۱۹۵۹ء حیدرآباد دکن

فاختہ

میا ابھی ابھی لیٹر پر سے اٹھ کر گئی تھی۔ اس کے بدن کی گرمی سے لیٹر گویا جھلس رہا تھا۔ سر کے دباؤ سے تکیہ کے بیچ میں ایک گول سا نشان پڑ گیا تھا۔ چوٹی جو پیٹھ کے نیچے دب گئی تھی اس نے چادر پر اپنا بل کھایا ہوا نقش چھوڑ دیا تھا اور پورا لیٹر سجینی سجینی خوشبو سے مہک رہا تھا۔

شیر میاں جوتے اتار کر لیٹر پر بیٹھنے لگے تو اکدم انہیں مانوس سی خوشبو کا احساس ہوا۔ لیٹر پر بیٹھے تو اسے بڑا نرم نرم، گرم گرم سا پایا، جیسے فاختہ کے پر۔

”سوں“ کمر کے انہوں نے زور سے سانس لی اور ناک سے ہوتی ہوئی خوشبو ان کے دل تک اتر گئی۔ اکدم وہ بو کھلا سے گئے۔ یہ کیفیت تو ان پر کبھی نہ گزری تھی۔ ایسا لگا گویا فاختہ کے گدگدے اور تپتے ہوئے پردوں میں دھنس گئے ہوں۔ وہ لیٹر سے اٹھ گئے۔ منی اور ارشد کمرے کے باہر کھیل رہے تھے۔ انہوں نے بڑی ہنسی ہوئی آواز سے پکارا۔

”اے منی۔ اے ارشد۔ ذرا ادھر تو آؤ۔“

منی سجا گئی ہوئی آئی اور آنکھوں پر سے بال ہٹائی ہوئی بولی۔

"ہیں بلا با ابا میاں - ۱"

"بیٹی تم میرے بستر پر سوئی تھیں۔ ۱" انہوں نے حد درجہ

مادرِ امانت لہجہ میں پوچھا۔

"جیسی جی۔ ہم تو جب سے باہر کھیل رہے ہیں۔"

"اچھا تو شاید ارشد سویا ہو گا۔" اور انہوں نے ارشد کو پکارا۔

"داد جی۔ ہم تو اکیس منی کے ساتھ کھیل رہے ہیں۔ ہم نے تھوڑے

ہی گندے پیر آپ کے بستر پر۔ ہاں آپا ابھی ابھی سو کے اٹھی ہیں۔"

شیر میاں سن ہو گئے۔ ۱ بستر پر چھلتی ہوئی خوشبو نے انہیں

آپ ہی تباہ کیا تھا۔ "میں منیا کے پاس سے آئی ہوں۔ ۱"

انہیں یاد آیا ممائی بی سدا منیا کے لئے چکی میں خوشبودار مصالحے

پسویا کرتی تھیں۔ اور منیا ہمیشہ صابن کی بجائے مصالحوں سے نہاتی

ہے۔ تبھی تو اس کے بال اتنے لمبے لمبے ہیں اور چلنے میں اس کے پاس سے

مٹی ٹوہلی دھنوں کی سی خوشبو آتی ہے۔

گولی پریچ دار زینے پر مانوس کھٹ کھٹ منائی دی اور سپر ڈبی

باریک سی، علام سی۔ میٹھی آواز آئی۔

"اے خانا ماں کھانا لگا دو۔ میاں آگئے۔"

آج شیر میاں کو یہ آواز باکل نہی تھی۔ لہجہ باکل نیا لگا اور وہیں

بیٹے بیٹے لہجے رہے۔ "اے خانا ماں کھانا لگا دو۔ میاں آگئے۔"

ممائی بی منیا کو کئی بار ٹوک چکی تھیں کہ "اے بیٹا اپنے سے بڑوں کو رشتہ

لگا یا کرتے ہیں۔" مگر جہاں جہاں بھی رشتہ لگانے کا موقع آیا منیا کی

زبان ہرکھلا گئی۔

شبیر میاں ممانی بی کے سگوں میں سے ہوتے تھے۔ ایسا بہت دور کا رشتہ بھی نہ تھا۔ شادی ہوئی تو دہرا رشتہ ہو گیا۔ جہانجے لگتے تھے اور ممانی بی کہتے منہ سکھاتے تھے۔ ممانی بی کو بھی ان سے بڑی محبت تھی۔ کوئی کمار ہو، کوئی کاج۔ ہر کام میں شبیر میاں کی رائے لی جا رہی ہے، شبیر میاں بلائے جا رہے ہیں۔

جہاں کوئی اچھی سی چیز کچی رکا بیوی میں دگا۔ سرپوش طعک، جھٹ سے نمبین بوا کے حوالے کشتی کی کہ "جاجلدی سے شبیر میاں کے ہاں پہنچا آ۔"

شبیر میاں بھی ممانی سے ایسے گھلے ملے تھے کہ ماں سے بھی اتنی نہ رہی ہوگی۔ اور جب سے توان کی جاگیر کا قصہ ختم ہوا تھا یہ انپا کاؤں چمور کر میہیں آئیے تھے۔ ممانی جمی کے ہی پردس میں چھوٹا سا مکان تھا۔ وہیں رہنے۔ شادی شدہ تھے بشریٰ خانہ انی بیوی بھی، دو بچے، مزے سے کٹ رہی تھی۔ اپنے کام کاج سے فرصت پائیں تو رقیعہ بگم بھی گھڑی دو گھڑی کو ممانی کے پاس آ بیٹھتیں۔ مینا سے ان کی بڑی دوستی تھی۔ دل سے دل ملنے میں کیا دیر لگتی ہے، یہ نہیں کے اندر تھیں اور مینا تو سولہوی سنڑ ہو رہی ہیں ہی تھی۔ پھر بھی دونوں ایسی گھلی ملی تھیں گویا ساتھ کی کھیلی سہیلیاں۔ گھنٹوں سر جوڑے بیٹھی باتیں کرتی رہتیں۔

نبیا کو شبیر سے افسر کا پیام آیا تو انہی کی کوششوں سے ہی "نہ" ہوئی تھی۔ اب لاکھ ممانی بی کہتی ہیں۔

"وابی۔ اچھا کماؤ لڑکا ہے۔ گن کا، ڈھنگ کا۔ اب اور کیا

دیکھیں گے۔“ مگر رفیعہ بیگم کی ایک نہیں تو لاکھ نہیں۔ مانی بی نے کہا بھی
 ”اے تم ایسی جنم جنم کی دشمن کا ہے سے ہو گئی ہو لڑکی کہ منہ توڑا ہمارے
 جاتی ہو۔“ ہنس کے بولیں۔ ”اے مانی بی! ہماری مرضی نہیں تو آپ کیوں
 مجبور کر رہا ہیں۔“

اصل میں مانی کی مرضی نہ تھی۔ کیوں نہیں تھی۔؟ بس نہیں تھی۔
 اڑتے اڑتے اتنا ضرور سنا تھا کہ صاحبزادے ذرارنگین مزاج
 ہیں۔ مانی بی اتنی روشن خیال بھی نہ تھیں کہ بیٹی کے منہ سے صاف
 ’نہیں‘ سن سکیں، اس لئے رفیعہ بیگم نے اپنی طرف سے توڑ جوڑ کر کے
 بات بنا دی۔ مانی بی بھی کھٹک گئیں۔ سوچا۔ ”اپنی طرف سے تو یہ زور
 زور می سے کہہ نہیں سکتی، ہو گی دونوں کی ملی سمجھت۔“ خاموش رہ گئیں
 ویسے سچ بات تو یہ تھی کہ مانی بی اتنی لکیر کی فقیر بھی نہ تھیں۔

انہوں نے تو آپ ہی بہت سی دیواریں گرا دی تھیں ”عصمت“ تو خیر بہت
 زمانے سے آنا تھا۔ اب تو رسالوں کی دور بند ہو گئی تھی۔ جہاں کسی لئے پہچے
 کا نام سنا اور نیلے چہرہ جیسا۔ اتنا یقین تو انہیں بیٹی پر ضرور تھا۔

اوندھی سیدھی کتابیں تو خیر نیلے نہیں پڑھیں، مگر یہ انہوں نے خود
 کہہ کھائی کہ لے کے ایک مصنوع لکھ ڈالا۔ اب نصیب ہی اوندھے ہوں تو کوئی
 کیا کرے۔؟ وہ چوہا بھی گیا۔ سارے خاندانے بہا دے دے دے

ہوئی کہ مانی بی سے تو منہ چھپا تا بھی نہ ہن پڑ سکا۔ پانی ایک ہی بار زور
 نہ بڑکے راہ نہالے تو پھر تو سبھی جگہ سے مبتلا چلا جاتا ہے۔ پہلی بات تھی۔

سجھوں میں دھوم سی ہو گئی۔ مگر اب بعد میں تو یہ عالم ہو گیا کہ نیلے باقلم
 انگریزی بھی پڑھو والی۔ بہشتی زیور اور دینی مسائیل تو پڑھے ہی پڑھے

تھے۔ اٹھے سیدھے نادل، کہانیاں بھی پڑھنی شروع کر دیں۔ سب سے پہلے جو کتاب گھر میں آئی "دولت پر خربانیاں" تھی۔ پھر تو گویا کھلی چھٹی ہی مل گئی۔

مگر اب اٹھے سیدھے نادل پڑھنے کا یہ بھی مطلب نہیں ہے سرے سے ناک کاٹ ڈالی ماں باپ کی۔ مگر ہاں اپنا مستقبل ضرور بنالیا۔ ساتھ ہی ساتھ پرانی بانوں کا ٹوٹ بھی اسی نے توڑا۔ چار کئی کے کھڑے پانچوں کے پا جابوں اور بند گلے کی کرتیوں کی بجائے وہ ساڑی پہنتی تھی۔ کانوں میں ممائی بی کے جھینر کی بالیاں تو اس نے سرے سے پہنی ہی نہیں۔ جگ جگ مگ مگ کرتے ٹاپس پہنتی تھی۔ جھوکا جھولی چندن بار اور چوسری کی بجائے گلے میں بدکا پھلکا نکاس ڈال لیتی، اور یہ بھی روز رد نہیں۔ کسی کے ہاں آنا جانا ہوا تو ماں کے اصرار پر پہن لیا۔ نہیں تو وہی اپنے بھونڈے ہاتھو، بھونڈا انگلا۔ آنے جانے والیاں ٹوکتی تھی "اے کنواری اور سہاگن سے ہی گھر کی رونق ہے۔ یہ ٹھوٹھوٹھے ہاتھوں کی کیا چال اٹھائی ہے بی۔" یہ مسکرا کر رہ جاتی خاندان والے نو، علی الاعلان کہتے کہ "اے بی بی بیگم نے تو نوٹڈیا کو کھلی چھٹی دے رکھی ہے۔" گھپ اندھیرے میں نوردار اجالا گھس پڑے تو آنکھیں پہلے تو مچ مچ کر نے لگتی ہیں، پھر اسی چپک چپک اجالے کی عادی ہو جاتی ہیں ممائی بی کو تو احساس ہی نہ ہوتا تھا کہ واقعی ان کی بیٹی اور خاندان والیوں سے اتم ہے۔

ممائی بی کے سیکے ہیں، اور اب میاں سسرال میں بھی، اتنا سخت پردہ تھا کہ مردوں کی تصویر تک دیکھنا گویا پردہ توڑ دینے کے برابر تھا۔

جیتا کو بھی حسبِ قاعدہ سب سے پرہیز کرنا چاہتا۔ مگر اس نے جو ادھر ہاتھ پاؤں اچھپالے تو بھی جبریل کاٹ سمیٹ لیا۔

رفیعہ بیگم کا زچہ خانہ ہونے والا تھا۔ درووں سے بے حال پریا تھیں۔ ڈاکٹر، لیڈی ڈاکٹر کا نوکدھر گزر رہا تھا، محلے کی دائی کو بلا یا گیا۔ وہ بھی آخر کو انارٹی علی کیجھ بچھ پڑا۔ لچھ نہ پڑا۔ اس نے آٹے ٹیڑھے ہاتھوں سے لچہ زچہ کو ایسے جھجھوٹے دینے کے لئے لینے کے دینے پڑ گئے۔ بڑی خبر بہ کار ہوڑ بھال بھی ہاتھ مل کر رہ گئیں۔ دائی بی کو بھی کچھ نہ سوچھا۔ مینا اپنے گھر ہی پر تھی۔ کنواری بالی چھوکر پول کا ایسے موقعوں پر کام بھی کیا۔ مگر شہر میاں کو تو معلوم تھا کہ بیٹا کافی نکلھ پڑھ گئی ہیں۔ جیہو خالہ کا بیٹا حتمی بیگم پڑا تھا۔ تو انہوں نے اوندھ لٹا کے سارا پانی نکھوایا تھا۔ مہتموئی کی رانج لے کاٹا۔ یہ انڈرائل ہونے تک نیم کی پٹیاں بار بار چھپاتی رہیں۔ مگر یہ رفیعہ بیگم کو بھی کوئی دالگ جائے۔ اسے مان لیا۔ کڈا کرٹی نہیں تھیں۔ سچیر بھی تھوڑی بہت دوا دارو دینی تو آتی ہی تھی۔ دوڑے دوڑے آنے۔ وہیں پر دے کے پاس کھڑے کھڑے نصیب

ہو اسے کھلوایا۔

"چھوٹی بی بی سے اسبو ہوئی کی طبیعت اچھی نہیں۔" ساری ماٹ پوری ہونے سے پہلے ہی نصیب بن ہوا چھپا سٹی۔ "اے میاں! تمہاری عقل سلامت ہے؟ بالی چھو کر ہے۔"

بات پوری ہونے سے پہلے ہی نصیب خود دروازے تک پہنچ گئی اور وہیں سے لڑی۔ "بھری انہی ذاتی رائے یہ ہے کہ آپ فوراً کسی لیڈی ڈاکٹر کو بلو لیجئے۔" اور ایک ڈاکٹر کی کا پتہ بھی نہا دیا۔

شیر میاں اٹھے پاؤں والیں ہوئے۔ جانے کیا بات یاد آئی تو پھر لوٹ کر آئے، آواز دی اور کہا۔

”میں تو یہ سمجھا ہی گیا تھا کہ وہ نہیں کیا لے گی۔!“ ابھی یہ بات منہ میں ہی تھی کہ پھر بولے۔ ”اور نہیں کا کیا ہے! جان سے بڑھ کر تو پیسہ نہیں ہوتا۔ اللہ جانے وہ آتی ہے یا نہیں۔“ پھر بس کیا کر دیا۔

اور ان کی آواز بھرا گئی۔ لاکھ آدمی ضبط کرے مگر بوری کا ساتھ کچھ ایسا کچا بندھن تو ہوتا نہیں۔ اب یہ اور بات ہے کہ ان کی بی بی ان کا کہنا ذرا کم مانیں اور بات پیچھے منہ کو منہ دیئے چلی جائیں۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ یہی منہ چار سے اٹھاتا ہے اور یہی منہ چار میں بٹھاتا ہے مگر اب یہ بات بھی نہ تھی کہ اتنی اتنی سی باتوں کو لے کر وہ کھڑے کھڑے کہہ دیتے کہ ”جاؤ بی بی میں نے تین بار تمہیں طلاق دی۔“ میان بی بی کی زندگی بچوں کا کھیل تو ہوتی نہیں کہ جب دل بھر گیا ایک نے سب کو مخاطب کر کے کہہ دیا۔ ”کھیل ختم، پیسہ مفہم۔“ ایسا تو نہیں ہو سکتا کہ بغیر دھوپ کے لکڑی جلے۔

نبیا کو بھی خیال آ گیا کہ اللہ جانے ددا بھار ہی کر دے بھڑکیا ہوگا۔ لپک کر باہر ہی تو نکل آئی اور بولی۔

”پتے دونوں مل کر اسے بلالائیں۔“ اور اسی جھپاکے میں وہ

شیر میاں کے ساتھ ہو گئی۔

شیر میاں کی بی بی کی زچگی بھی گئی، چٹہ بھی نہالیا، بات پرانی پڑ گئی، مگر خاندان والوں نے کیا کیا مبتنان نہیں باندرھے۔ لیکن مینا نے ذرا شک نہ چڑھائی۔ مانی بی نے البتہ دو چار دن بیٹیا سے بول چال

فردر بند رکھی۔ بنگر پیٹ کی اولاد سے کوئی منہ پھیرے بھی تو کب تک؟
اب تو شبیر میاں کا آنا جانا بھی شروع تھا۔ اور دنیا بھی سامنے آتی
تھی۔ سلام کرنے کو ہاتھ اٹھانی مگر منہ سے کچھ نہ بولتی۔ بس چاندی کا
پنچہ چاند ایسے ماتھے سے چھو جاتا۔ عمامی بی مہنس کر پیار سے ڈانٹیں بھی۔
”پڑھ لکھ کر بالکل ہی چلن بدل دیا۔ یہ بھی کوئی سلام ہوا۔!“ دنیا
مہنس پڑتی۔

رفیعہ بیگم کی زوجگی بڑی مشکلوں سے ہو آ کر تھی۔ پہلا بچہ تو جیسا ہوا۔
ہوا۔ دوسرا اپنے وقت کا قبضہ تھا۔ ڈاکٹر نے عاف کہہ گئی تھی مگر
اب کے بچے ہو تو جان کا خطرہ ہے۔ مگر ڈھائی دو برس پیچھے پھر رفیعہ
بیگم امید سے رہیں، اور اب کے جو زوجگی کا وقت آیا تو بچہ بھی ضائع
ہوا اور ماں بھی۔ شبیر میاں بھری بھری دنیا میں تنہا رہ گئے۔

جہلم پر عمامی بی نے بہت آغوش بہائے۔ دل تو شبیر میاں کے لئے
بہت بڑک رہا تھا۔ مگر کمر تھی بھی کیا بیچاری؟ جوان بیٹی کا ساتھ
تھا اور ہر ایک کے پیچھے شیطان لگا ہے۔ دنیا دکھا دے کو منہ سے کہا
”بھی کہ“ میاں اب نہ دیکھ بھال دالا کوئی نہیں، ہمارے ہاں اٹھ آؤ نا۔
مگر شبیر میاں بھی ان کی مجبوری کو سمجھتے تھے۔ سر ہلا کر اٹھا کر دیا۔
دنیا کو ان پر بڑا ترس آتا۔ بیچا بے ادل ہی تو اللہ میاں کی کائنات
تھی۔ اب نہ بالکل ہی موم ہو کر دگئے تھے۔ دونوں بچے الگ ڈھائی
ڈھائی پھرتے۔ دنیا ہاتھ دیکر کہہ منہ ہاتھ دھلا دیتی۔ ناشتے کے
وقت آتے تو ساتھ بٹھا لیتی۔

ایک دن شبیر میاں بھی آئے بیٹھے تھے۔ دونوں بچے بھی ساتھ تھے۔

ممافی بی نے ہر پھیر سے ذکر چھیڑا۔ "اے میاں لوگ تو کہتے ہیں بیوی کی موت کہنی کی چوٹ ہوتی ہے۔ لکٹی بڑے زور سے ہے مگر ذرا دیر میں درد غائب۔ تم کب تک بوہنی رہو گے۔ یا ماشاء اللہ خود بھی جان جوان ہو، ننھے ننھے بچے ہیں، کوئی تو ہو دیکھ بھال کر نہوالا۔"

شیر میاں بولے۔ "ممافی بی رنج و غم کی بات تو جانے ہی دیجئے میں سوچتا ہوں آلے والی بچوں سے سگی ماں کا سا برتاؤ نہیں کر سکے گی اور میں یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکوں گا۔" ان کی آواز سوہینگ سی گئی۔ پھر شیر کر بولے۔ "کیا گھر کا گھروا ہو گیا ممافی بی۔ اب تو دھول اڑتی ہے ہر طرف باہر سے آؤں تو کوئی منہ دھلانے والا بھی نہیں۔ پانی وانی کی فردرت پڑے تو خود اسٹھ کر لوں تو لوں، ورنہ کوئی اس کا بھی روادار نہیں کہ پیاس ہی بجھا دے بچے الگ تباہ حال۔!"

میاں کا دل اندر سے پچھل اٹھا، بولی۔

"آپ ہمارے ہاں آجائیے نا۔ میاں اماں بھی ہیں، بچوں کا جی

بھی مہل جائے گا۔"

"میں آنو جاؤں، مگر...." شیر میاں کی زبان گنگ ہو گئی۔

ممافی بھی بات کا رنج دیکھ کر خاموش رہ گئیں۔ مینا پھر بولی

"خاندان والوں سے ہی ڈر رہے ہیں نا آپ؟ اپنے کام سے کام لکھئے کنوئی کا کام بھونکنا ہے۔ بھونکتے ہی رہتے ہیں۔"

شھوڑی دیریوں ہی ہاں ہاں ہوتی رہی۔ پھر ممافی بی نے

بھی زور دیا تو شیر میاں اسی دن اٹھ آئے۔ مینا کا وقت اب بڑا

اچھا کٹ جاتا۔ تمام دن بچوں میں اٹھی رہتی، بچے بھی ہل مل گئے تھے۔
انہی ماں کو بھول کر بھی یاد نہ کرنے کی بھی کبھار ایسے ہی منیا کے جسم پر کوئی
خول بصورت سا کپڑا یا زلیہ رد کیوہ لیتے تو کہتے۔

”امی جی بھی ایسا ہی کرتا میں ہنسی سٹھیں۔“

”ہماری امی کے پاس بھی ایسا ہی ہاڑ تھا۔“

شبیر میاں گھر میں رہتے ضرور۔ نگر لیں، جیسے رہتے ہی نہ ہوں۔
نہ چٹ نہ پٹ کیسی ادھی آواز سے بولتے۔ نہ قہقہہ لگا کر ہنستے۔ ماما جی
جس ڈر سے انہیں اپنے گھر بلانے سے ڈرتی تھیں وہ بالکل ناممکن سی
بات تھی۔ ایسے بھولے بھائی تھے کہ بھولے سے بھی منیا کو آنکھ بھر کر نہ
دیکھتے۔ ایک دن بانوں ہی بانوں میں ماما جی بولی تھیں۔ ”بچپن میں
میری بٹیا منیا کی طرح چمکتی تھی، بس میں نے یہی نام ڈال دیا۔“
اس پر شبیر میاں نے آنکھیں اٹھا کر ضرور اسے دیکھا اور بڑی سادگی
سے بولے۔

”واقعی اچھا نام دیا آپ نے منیا بڑی پیاری ہنسی ہنسی ہیں۔“
منیا کے چم چم چمکنے والی گلابی گلابی یونٹوں میں چھپ گئے تھے
سادگی سے جواں بڑا سچ کہہ دے تو اس سے کوئی خطرہ نہیں ہر سکتا۔
شبیر میاں کے لہجے میں کوئی گہرائی نہ تھی۔

بڑے نانا کہتے تھے۔ کتوں کا رونا بڑا خفس ہوتا ہے۔ کتے کے رونے
کی آواز آئے تو صدقہ دلوا دینا چاہیے۔ اس رات رہ رہ کے کتے بھونکتے
رہے۔ اور صبح ہی صبح نصیبن بولنے لگے تازہ تازہ دودھ بالنے کے لئے
چولہے پر چڑھا یا تو وہ آپ ہی آپ سمٹ گیا۔ نصیبن بوا زمانہ دیکھ رہے

تھیں۔ منہ سے کچھ نہ بولیں، مگر مولیٰ کی دھائی مانگنے لگیں۔ چار دن کی بیماری میں ممانی بی چٹ پٹ ہو گئیں۔ اور منیا سے آلو بن گئی۔ اندھیاروں چھپتی روتی پھرتی۔ بستر پر اوندھے منہ پڑی پڑی سسکیاں لیتی رہتی بیسیوں ہی کو پیام اچھے برے آئے ہوں گے۔ مگر ماں کو پسند نہ آئے۔ اور جواں کو پسند آیا، بیٹی کو ناپسند ہوا۔ بیٹی کے بیاہ کا ارمان جی کے جی میں ہی لے گئیں۔ اب تو خاندان والوں کو موقع ہی مل گیا۔ جہاں دیکھو وہاں بنیا اور شبیر میاں موضوع بنے ہوئے ہیں۔ اوندھی بیڑھی، جھوٹی بستی نہراہی ہی باتیں اڑائی گئیں اور منیا ہول ہول جاتی۔ باپ کا سایہ تو مدت ہوئی اٹھ چکا تھا۔ ماں چھاؤں بن کر سہارے بیٹھی تھیں وہ بھی چل دیا۔ روپے پیسے کی کمی نہ تھی، مگر روپے پیسے ہی سے سب کام تو نہیں چلتے۔ بولنے والے بھی کہاں تک بولتے۔ تھک ہار کر خود ہی چپ رہ گئے۔

شبیر میاں اب بھی مینا کے ہاں ہی رہتے۔ باہر سے آتے ہی سیدھے اپنے کمرے میں پہنچ جاتے مگر می کے دن ہونے تو دالان میں نظر آتے۔ مونڈھا بچھا ہوا، اخبار منہ سے لٹکا ہوا۔ سردیوں اور بارشوں میں تو اتنا بھی نہ ہوتا۔ ان کے آنے ہی گول پیچ دار زینے پر مالوس سی کھٹ کھٹ ابھرتی اور پھر نرم نرم سی بیٹھی آواز۔

”اے خانساں کھانا لگا دو۔ میاں آگئے۔“

شبیر میاں اور منیا اسی زندگی کے عادی ہو گئے۔ نہ ان کے دل میں ان کے لئے کوئی جگہ تھی، نہ انہوں نے ان کو اپنے دل پر چڑھایا۔ ایک دن ارشد اپنی آنکھیں کھلانا ہوا آیا اور مننا کر بولا۔

”ہماری آنکھوں میں کھجلی ہوتی تھی تو اُمی کا جل رگادتی تھیں۔“

”ارے رے۔“ مینا نے اسے پیار سے گود میں اٹھالیا۔ ”تو بھی مجھ سے پہلے ہی کیوں نہ کہا۔ میں نہ بنا دیتی اپنے راجہ گڈے کے لئے کا جل۔؟“

مینا نے سکوری بھر کے ارنڈ کا تیل شیشی سے اڑھلا۔ روٹی کو بل دیکھتی بنائی اور کولے میں چراغ سا بنا کر اوپر سے مٹی کا ایک پیالہ اڑھلا دیا۔ گھنٹہ بھر کے بعد یہ اتنا بڑا کا جل جم گیا۔ مینا نے ڈلبہ میں کا جل پکڑا اور منے کو گود میں بٹھا کر اس کی آنکھوں میں سلائی پھرتی چاہی۔

”اں ہاں۔ امی کہتی تھیں آنکھوں میں لوہا نہیں پھیرنا چاہیے۔“

مینا سنس ٹپری۔ ”اچھا تو انگلی سے لگا دیں۔“

”ہاں۔“ ارشد نے سر ہلا دیا۔

مینا نے ارشد کی دونوں آنکھوں میں انگلی پھیری بخوڑا کا جل پھر بھی انگلی پر لگا رہ گیا۔ وہ اس نے اپنی آنکھوں میں سجر لیا۔ اور سہول بھی گئی کہ کا جل لگا یا نہ تھا۔

شام کو شبیر میاں آئے۔ گول پیچ دار زینے پر مانوس قدموں کی کھٹ کھٹ سنائی دی۔ پھر بیٹھے لہجہ میں آواز آئی۔

”اے خالسا مال کھانا لگا دو۔ میاں آگئے۔“

دستر خوان پر بیٹھے تھے کہ ارشد مینا کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا ہوا لے آیا۔

”ابا میاں آپا لے ہماری آنکھوں میں کا جل لگا دیا ہے۔ دیکھو

آپ لے۔“

”ہاں۔ ہاں۔ اچھی ہیں تمہاری آپا۔“ اور وہ اسی انہماک سے کھاتے رہے۔ کھانے کے بعد دالان میں نکل کر مونڈھے پر بیٹھے تھے کہ مینا آگئی۔ اخبار دیتے ہوئے بولی۔

”ذرا پڑھنے کے لئے لے گئی تھی۔ معاف کیجئے بغیر پوچھے ہی اٹھا
 یا۔“ شبیر میاں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی معذرت پر کچھ کہنا
 چاہتے تھے۔ مگر اکدم رک کر سادگی سے بولے۔
 ”ارے میں نے کبھی غور ہی نہیں کیا۔ مینا تمہاری آنکھیں کتنی خوبصورت
 ہیں۔“ اور اخبار لے کر یوں پڑھنے میں مہمک ہو گئے گویا کسی لڑکی کی
 خوبصورت آنکھوں کی تعریف نہ کی ہو۔ موسم کی تعریف کی ہو۔ ”واہ بھئی
 کیا اچھا موسم ہے!“

مینا بڑھلا کر الٹے پاؤں سجاگی۔ اس کا پیر ساری سے اچھو گیا
 اور وہ گر پڑی۔ شبیر میاں نے لپک کر اسے اٹھایا۔ نرم نرم، گرم گرم
 پردوں والی فاختہ گویا ہاتھوں میں آگئی۔ سادگی سے بولے۔
 ”ذرا سنبھل کے مہینے چلتیں، ابھی بڑی چورا ہو گئی ہوتی!“
 اور اٹھاتے میں مینا کا سر ان کی ناک سے اتنی قریب ہو گیا کہ سمجھنی بھینی
 سی خوشبو سے ان کا پورا وجود مہک مہک گیا۔

شبیر میاں نے اس دن اخبار پڑھا ضرور، لیکن اگر کوئی پوچھتا۔
 ”سناؤ میاں آج کی خاص خبر کیا ہے؟“ تو وہ سٹپٹا کے رہ جاتے۔
 مینا تین دن سے کھانسی نزلے میں پڑی گھل رہی تھی۔ شبیر میاں
 کو تین دن سے وہ مانوس کھٹ کھٹ سانی نہ دی تھی انہوں نے چاہا
 خبر لینے کو جائیں۔ مگر پھر ارادہ ترک کر دیا۔ جانے کا ارادہ کرتے تو لگتا کہ
 نرم نرم پردوں کے ڈھیر میں دھنسے جا رہے ہیں۔ گھبرا کر وہ باہر نکل آئے
 ”ادنبہ! اندام بھی کوئی بیمار ہی ہوئی جھلا۔ آپ ہی ٹھیک ہو جائیگا۔“
 ایک دفعہ وہ بخار میں سمجھ سمجھ کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ تو مینا نے

انہیں مشورہ دیا تھا۔

”آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے؟ آخر کوئی دیکھ سہال والا بھی تو چاہیے۔“

اب انہیں خیال آیا یہ دنیا شادی کیوں نہیں کر لیتیں۔؟ آخر کوئی دیکھ سہال والا بھی تو چاہیے نا۔! ”پھر انہیں دنیا اور مانی بی کے احسان یاد آ گئے۔ انہوں نے دل میں تہیہ کر لیا کہ دنیا کے لائق ہر دفعہ نکالیں گے۔ دنیا جو اتنی پیاری اتنی خوبصورت اتنی سگھر، اتنی تعلیم یافتہ ہے۔ اس کے جوڑ کو جوڑ تو لے۔ دنیا کا دل کننا نرم تھا۔ کئی بار وہ اس کی آنکھوں میں نمی دیکھ چکے تھے۔ بچوں سے باتیں کرتے کرتے وہ رفیعہ بیگم کی یاد میں آسو مہانا شردع کر دیتی۔ بچوں سے اتنی ہل مل گئی تھی کہ رفیعہ بیگم کی کمی بھلا دی۔ بچے اب صاف ستھرے رہتے۔ روتے بسور نہ تھے اور صورت پر مہار آگئی تھی۔

”لا حول ولا۔“ شبیر میاں نے سوچا۔ ”میں بھی کتنا کورا اخلاق ہوں کہ وہ تو مجھ سے، میرے بچوں سے اتنی ہمدردی کرے اور میں اس کی خبر تک نہ لوں۔“ اخبار مونڈھے پر رکھ کر اٹھے اور دنیا کے کمرے کی طرف چلے۔

دنیا نے سردی کے سارے سوٹر چڑھا لیا تھا۔ اب جو گرمی ہوئی تو اسے اتار پھینکا چاہا۔ سوٹر کھلے کھلے کا نہ تھا۔ گردن میں سے اتارنا چڑھانا پڑتا۔ دروازے کی طرف پیٹھ کر کے ساڑی کا آئینل دونوں گھٹنوں میں دبا کر وہ پیٹھ کے بل جھکے جھکے، زور لگا کر سوٹر اتار رہی تھی۔ شبیر میاں روایتی کانچ کی جوتی اور بالوں کی سنہری لٹ دیکھ کر

اندھا دھند عاشق ہو جانے والے شہزادوں میں سے تو تھے نہیں، مگر میاں ایک جگہ گاتی صبح دیکھ کر گھبرا اٹھے۔ ڈھیر سارے نرم گرم پروں میں ان کو اپنا وجود ڈونبا ہوا محسوس ہوا اور وہ ہڑبڑا کر لوٹ گئے۔

میانے قدموں کی چاپ سن کر منبکل سوئیر کھینچ کر چھینکا اور دیکھا تو شبیر میاں سر نیہوڑائے جلدی جلدی چلے جا رہے تھے۔

تین دن سے تو بخار رہا تھا — اور — تین دن میانے یوں ہی کمرے میں کاٹ دے۔ ہمت نہ پڑتی تھی کہ باہر نکلے۔ سائو بی دن اپنے کمرے سے باہر آئی تو سہی۔ مگر شبیر میاں سے یوں لجائی لجائی جیسے نئی نوبلی دہن سسرال دکھا دے کو دولہا سے شراٹے اور موقع ملنے پر وہ رد کے کن انکھیوں سے دولہا کو دیکھتی جائے۔

شبیر میاں چپ چاپ سے تھے۔ آگے بھی انہیں یہ خوشبو اپنے تئیکے پہ، بستر پر مل چکی تھی۔ جو اپنے منہ سے کہتی تھی۔

”میں مینلکے پاس سے آئی ہوں۔“

اب دنیا اتنی گئی گزری نہ تھی۔ کہ کسی کے بستر پر لوٹیں رگاتی پھرے سنی اور ارشد سونے کے لئے کمرے میں جاتے لو اسے بھی گھسیٹ لیتے۔

”آپا ہمیں ڈر لگتا ہے نا۔ آپ بھی ہمارے ساتھ چلیے۔“

نائب تک وہ سوئیں سوئیں، یہ بیٹھی کتا میں ٹیٹو لٹی رہتی کبھی کبھار پیٹھ سیدھی کرنے کو شبیر میاں کے بستر پر لڑھک جاتی۔ اُٹھی کا پلنگ اس وقت خالی ہوتا تھا۔

بدلی چھائی، برس تھی۔ آسمان پھر نیلا نیلا، دھلا دھلا تھا۔ وہی شام کی دالپسی، وہی بچوں کی شرارت، وہی مینا کی کھنکھتی ہوئی سنسی

اور گول پیچ دار زینے پر مانوس سی کوٹ کوٹ کے بعد ترم، ملائم، گھلی گھلی سی آواز۔

”اے خانسا مال کھانا کھا دو۔ میاں آگئے۔!“
 جاتے جاتے ایک دن شبیر میاں کہہ گئے۔ ”میاں ان کپڑوں کو
 ذرا دھوپ دکھا دینا، بیڑا نہ لگ جائے۔“

اس دن تو میاں سے نہ ہو سکا۔ دوسرے دن صبح ابھی شبیر میاں گھر
 ہی پہنچے تو سارا سامان لے کر بیٹھ گئی۔ کپڑوں کے صندوق میں زیورات کی
 صندوقچی بھی نکلی۔ بچے بھی آدمی کے۔ صندوقچی کھول کے یوں ہی بنیا بیٹھ گئی
 سامان الٹ پلٹ کرنے لگی۔ صندوقچی بھری پر سی تھی۔ زیور سے لے کر
 افشاں تک، بس جوں کی توں۔ بچے پاس بیٹھے اوندھی سیدھی باتیں کر رہے
 تھے۔ ایک بھی سوال انہوں نے اپنی ماں سے متعلق نہ کیا۔
 میاں خود ہی بول اٹھی۔

”امی کی یاد آتی ہے مے۔“ ارشد اور منی ایک زبان ہو کر
 بولے۔ ”اوں ہوں۔ آپ جواقی اچھی ہیں!“

”نگر میں امی کی برابر سی کہاں کر سکتی ہوں۔“ وہ ہنس کر بولی۔
 ”اوں،“ ارشد بولا۔ ”ہم تو آپ کو اپنی امی سمجھتے ہیں!“ میاں کا
 منہ لال ہو گیا۔ ہونٹ کانپ اٹھے۔ اس کی آنکھوں کے کونے گیلے گیلے
 ہو گئے۔ بڑی شکل سے مسکرا کر بولی۔ ”سچ۔؟“

”ہاں اور کیا۔!“ ارشد بولا۔

میاں نے صندوقچی کا بچلا خانہ کھولا۔ کالی پوت کا لچھا پڑا چمک
 رہا تھا۔ اس نے لچھا اٹھا کر میٹھی میں دیا لیا اور گھڑی کی طرف دیکھا۔

دس بچے بھی نہ رہ منٹ تھے۔ روز اسی وقت شبیر میاں گھر سے باہر جاتے تھے۔

دہنیری سے پسلی - زینے کے پاس تھوڑی دیر کی مٹھی کھولی اور سپردوڑتی ہوئی دروازے میں رک گئی۔ "سینے۔" وہ ٹھٹھک گئی۔
شبیر میاں بھی رک گئے اور ایک دم چونک گئے۔ دھانی ساڑی میں اس کا ہلکا پھلکا جسم کانپا جا رہا تھا۔ ساڑی کے آنچل کا ایک کونہ تیلے تیلے ہونٹوں میں دبا ہوا تھا۔ آنکھیں جھپکی ہوئی تھیں بلکپی لزر رہی تھیں اور گوری گوری گردن میں سالنوں کے زیر و بم کے ساتھ ساتھ کالی پوت کا لچھا کانپ رہا تھا۔
دہاٹک اٹک کر پولی۔

"سنگھار دان میں اور نورب چیزیں ہیں۔ مگر مٹی نہیں ہے۔" اور وہ منہ پلو میں چمپا کر شرما کر بھاگ گئی۔ شبیر میاں کے آس پاس نرم نرم فاختی پردوں کا ڈھیر سا لگ گیا اور وہ ڈوبتے ہی چلے گئے۔
شام کو جب وہ ہاتھ میں مٹی کی دہری پوڑی سلہنھالے گھر میں داخل ہوئے تو گول بیچ دار زینے پر مانوس سی کھٹ کھٹ ہوئی اور نرم، ملائم سی، شکر میں گھلی ہوئی میٹھی آواز گونجی۔
"اے خالسا ماں کھانا لگا دے۔" وہ آگے نہیں۔"

آدم اور حواؑ

چھک - چھک - چھک - ریل چلی جا رہی تھی -
 "ہاں جی - اگر میں اس چلتی گاڑی سے گر پڑی تو - ؟"
 عورت نے مسکراتے ہوئے پوچھا -
 مرد نے اخبار سے نگاہیں ہٹائے بغیر، ناگوار سی سے کہا -
 "او نہہ - وقت پڑنے پر دیکھا جائے گا -"
 ننھوڑی دیر بعد مرد نے اخبار تہہ کر کے رکھ دیا اور مسکراتے
 ہوئے پوچھا -
 "ہاں جی — اگر میں اس چلتی گاڑی سے گھر پڑا تو - ؟"
 عورت نے ایک لمحہ کو مرد کی طرف دیکھا اور دوسرے ہی لمحے
 وہ چلتی گاڑی سے کود پڑی -

پاندان

”بے میاں کل سپر آئے تھے۔“ بڑی بیگم نے چھالیہ کرتے کرتے آہستہ سے کہا۔

اشرف میاں اخبار میں ایسے منہک تھے کہ انہوں نے بڑی بیگم کی بات پر کان ہی نہ دئے۔ بڑی دیر بعد پڑھتے پڑھتے اکدم اچھل کر بولے ”ابھی تم نے بے کا نام لیا تھا۔؟“

بڑی بیگم نے سر اس انداز سے جھوکا لیا، جیسے کہتی ہوں۔ ”جی ہاں۔“
 ”اور صاحب زادہ کی کہاں تھیں۔؟“ انہوں نے نیز ہو کر پوچھا۔
 اب بڑی بیگم کی مل گئی۔ ”ودنی صاحب زادہ کی کہاں تھیں۔؟ خود انہوں نے ہی بے میاں کو لاکر اپنے کمرے میں بٹھایا۔ کمرے سے کہہ کر چائے بنوائی اور خود ہی ان کے سامنے کھڑے ہو کر پیالیوں میں انڈیلی۔ میں دھڑ سے گزری تو کیا دیکھتی ہوں۔ کہ چائے کی چسکیاں بھری جا رہی ہیں اور مزے مزے ہیں ہنس ہنس کر باتیں ہو رہی ہیں۔“

اشرف میاں نے جھٹکا کہ اخبار اتنی دور پھینکا کہ وہ بجائے مینز پر ٹککنے کے زمین پر جا پڑا۔

”اور تم نے کچھ بھی نہ کہا۔؟“

”اے لو۔ نبھلا میں کیا کہتی۔ کچھ صاحب زادی میرے ہاتھ کی ہیں۔ اب تو زمانہ ہی اٹسا ہو گیا ہے۔ کہ بجائے اس کے کہ چھوٹے بڑوں سے ڈریا اٹھے بڑے چھوٹوں سے کانپتے ہیں۔ کیا میری رت ماری گئی سستی کہ دو بولی بولی کر ان سے سترہ بانیں سنی۔“

”سترہ بانیں کیوں سنیتیں۔ کیا تم ان کی....“ وہ کچھ دیر رکھے، پھر اسی تمیزی سے بولنے لگے: ”کیا تم ان کی بزرگی نہیں ہو۔؟“

”اے ڈالو چولہے میں ایسی بزرگی کو۔ جب وہ باپ کا ڈر نہیں بانیں تو ہم تو نسیرے کو لے پڑے ہیں۔“

”نسیرے کو لے کیوں۔ کیا تم ان کی خالہ نہیں ہو۔؟“
 ”او نہ۔“ انہوں نے زور سے سروتہ پیچ دیا، ”ابا ہی بڑا حال کا مان ہوتا تو یوں کھلے خزانے....“ وہ بڑے ڈرامائی انداز سے جملہ ادھورا چھوڑ خاموش رہ گئیں۔

”کیا۔؟ کیا بات ہے۔؟“ اشرف میاں ٹہری بے تابی سے بولے۔
 ”دوئی بات کیا ہوتی۔ ہمارا منہارا ڈر ہوتا تو یوں آپ کو آپ اپنے دیدوں اپنا ہرنہ ڈھونڈ لیتیں۔“

سارے معاملہ اشرف میاں کی سمجھ میں آ گیا۔ ٹھہانی خون جوش کھا گیا۔ سرخ چڑکھ بولے۔

”یہ بالشت سیر کی چھو کر سمجھنی کیا ہے اپنے آپ کو؟ اس کا دانہ پانی نہ بند کر دیا تو کہنا منوجی! اب سے بڑے دروازے کو قفل ڈال کے رکھنا۔ ایک چابی منہارے پاس۔ ایک چابی میرے پاس۔ جس کو بھی باہر جانے کا کام پڑے۔ ہم دونوں میں سے کسی سے پوچھ کر جائے

سمجھ گئیں نا۔

بڑی بیگم ہوں گئیں۔ "دوئی کیسی بات کرتے ہیں آپ۔ جو ان
بچی بیویوں پابندی۔ کبھی جان پر کھیل گئی تو۔؟"

"اجی مہبت دیکھے ایسے جان پر کھیلنے والے۔" اشرف میاں
"تاؤ میں آکر بولے۔ مگر دوسرے ہم لکھے وہ ذرا رک گئے۔
"کیا کہاتم نے ابھی۔؟" وہ انگلی اٹھا کر بولے۔

"کہتی کیا۔؟ یہی کہ جان وان پر نہ کھیل جائے۔"

اشرف میاں کو خیال آیا کہ رضیہ ان کی کتنی لاڈلی ہے۔ کیلے اس
کی زندگی سے ان کی اپنی زندگی ہے۔ اور رضیہ کی ماں کی عزت کے بعد
سے تو وہ رضیہ پر یوں بھی زباندہ ہی جان چھڑنے لگے تھے۔ ویسے پہلے
ہی رنوسے وہ کیا کم محبت کرتے تھے۔ مگر اس کی ماں کی موت نے تو انہیں
رضیہ کا ہی بلکہ رکھ دیا۔ اور یوں تڑپا رہیوں پر بیٹی ہو تو اس کے لاڈ
پیار کا کیا کہنا۔؟

رضیہ جب ایک ماہ کی تھی تو یہ اس کی ننھی منی گھائی خزانہ انہیں
اپنے ہونٹوں میں دبا لیتے اور کھل کھل کر ہنستے۔ اور جب پیو ماد کی
ہوئی تو اسے تکبوں کا مہار دے کر ہونٹ سے میں ٹھما دیتے اور خود اس
کے سامنے شیریں کر ہاتھوں پریدوں کے سہارے چلا کرتے۔ اس کے
معصوم قہقہوں سے سارا گھر کھل کھلائے لگتا۔ پھر ایک سال کی
ہوئی تو یہ اپنے ہاتھوں اسے سہارا دے کر پلایا کرتے۔

"پاؤں پاؤں، سولنے کے پاؤں

رائی جاتی راجہ کے کھاؤں"

وہ تھرک تھرک کر چلتی اور ان کے دل میں سہول چٹکتے جاتے۔ پھر
یہ نہی ماہ و سال گزرتے رہے اور سہول چٹک چٹک کر گلزار ہوتے
رہے۔ جب روضہ اسٹارہ سال کی ہوئی تو ایک دن چپکے سے اس کی ماں
نے آنکھیں موند لیں۔ معمولی سامعیا دی بنجار تھا۔ مگر جس کی پوری ہو گئی
ہو اسے تو معمولی سامعیا نہ ہی کارگر ہو جاتا ہے۔

اشرف میاں کی دنیا لٹ گئی۔

کہاں تو وہ زندگی کہ گھر بھرے میں خوشیاں سمیکتی تھیں۔ دن
رات تھپتھپے اچھلتے تھے۔ یا اب یہ عالم کہ روضہ کھٹنوں میں سر دبائے جو
بیٹھی ہے تو ادھر کا سورج ادھر ڈھل جائے اور اس کا سر نہ اٹھے باپا
اپنے دفتر کچہری کے کاموں کو سہول سہال جو ہاتھوں میں منہ چھپا کر
بیٹھتے تو نہ کھانے کا خیال نہ پینے کی فکر۔ !

ذکیہ بیگم کی اجانک موت نے روضہ کی محبت ان کے دل میں لگنی
لگنی کر دی۔ ہر بات میں روضہ کا خیال، ہر وقت روضہ کی فکر۔ خود اپنا
یہ حال کہ سوکھ کے کاٹا ہوئے جا رہے ہیں مگر روضہ بی بی ہیں تو زندگی ہے۔
ورنہ کچھ نہیں۔ روضہ بی کا بی۔ اسے کا پہلا سال تھا۔ ابھی پڑھائی شروع
بھی نہ ہوئی تھی کہ ماں کا غم سر پر آ پڑا۔ تعلیم و علیم کو سہول سہال بس
اپنے کمرے میں پڑھی پڑھی چپکے چپکے روئے جاتیں۔ ادھر باپ بے حال،
ادھر بیٹی تباہ۔ جانے ٹہری بیگم نہ ہونیں تو اس گھر دائے کایا حشر ہوتا؛
پھر سے کے لئے گاؤں سے ذکیہ بیگم کی رشتہوں کی بہن روضہ بیگم
آئی تھیں۔ شادی اور سہاگ کے کوئی سترہ سال ٹہری ام منگوں اور خوشیوں
میں گزارے تھے۔ سات آٹھ سال بعد خدانے ایک بیٹا بھی دیا تھا،

اور بیٹیا دیکر میاں جبین لیا تھا۔ کوکھ ٹھنڈی کی تو سہاگ کی سرخی چھین لی۔ اوپر والا جو چاہے سو کرے آج کل کی بات بھی نہ تھی۔ برس گزے گئے تھے مگر غموں کی اڑی ہوئی تھیں۔ موت کی چوٹ ان کا دل بھی کھا چکا تھا۔ رضیہ کا غم بھی دیکھا نہ جاتا۔ نہ وہ ہوتیں، نہ رضیہ اور اشرف میاں کی زندگی ہوتی۔ ان دونوں باپ بیٹی کا کیا تھا۔ کچھ خبر بھی نہیں کہ دنیا میں کیا ہوا ہے اور کیا نہیں۔ اگر یہ کھانا پگھلائیں تو پکے، نہ کہیں تو دن دن بھر حویلیہ ٹھنڈے، بڑے ہیں۔ کھانا میز پر لگ کر ٹھنڈا ہو چکا ہے مگر نہ انہی جاگے سے ملتی ہیں نہ وہ۔ چلو میز پر آکر بیٹھ بھی گئے مگر یہ نوالہ توڑتی ہیں نہ وہ۔ ایسے بھی کہیں زندگی گزرا رہی جاتی ہے؟ وہ ہوتیں نہ دوبارہ سے اس گھر میں نہ زندگی نہ لڑکائی۔ ایسے غیر محسوس طریقے پر وہ اس گھر کے ماحول میں رچ بسائیں کہ ان کے بغیر اب دنیا بھی نہ ہلتا۔ گھر کا انتظام آپ آپ ان کے ہاتھوں میں چلا گیا، اور ادھر رضیہ کا دل بھی چینو کے ساتھ مہلتا گیا۔

دن اور رات کی سنگت نے اب یہ احساس مٹا دیا تھا کہ رضیہ کی کوئی ماں نہیں۔ بڑی بیگم ماں تھیں، اور ایسی ماں تھیں کہ اب ایک کی بجائے انہیں چھ چہرے بچے تھے۔ لڑکوں سے دل بہتر نہیں ہوتا۔ مگر لڑکیوں کے مقابلے میں ان کے دل ذرا سخت ہی ہوتے ہیں۔ سچائی بھر بھی بڑے بڑے تھے اور دنیا کی اچھی خاصی سمجھ رکھتے تھے۔ ماں کا غم تو بس کچھ رضیہ کے جی کو ہسی لگا۔ بڑے دو بیٹے تو ماں کی زندگی میں ہی پاکستان سدھار چکے تھے۔ دو چھوٹے علی گڑھ میں تعلیم پاتے تھے۔ جس وقت ماں مرے بڑے بیٹے کو سٹ میں تھے اور چھوٹے مری میں تار سمجھوائے ضرور گئے مگر ماں کو سٹی دنیا نصیب نہ ہوا۔

رضیہ نے دل توڑ غم سے آنکھیں کھولیں تو سامنے بس بڑی بیگم کو پایا۔ ادرا ب دی گزرنے پر لو وہ یوں سمجھنے لگی کہ گویا وہی اس کی ماں ہو۔ کبھی بھول کر بھی نیالی نہ آنا کہ ایک ماں تو خیر چھوڑ کر چلتی نہیں۔ یہ بھی کبھی دور ہو سکتی ہیں مگر ایک دن جب بڑی بیگم نے اپنا بستر باندھتے ہوئے جانے کا اعلان کر دیا تو رضیہ کے ہاتھوں سے کتاب چھوٹ گئی۔

"آپ جا رہی ہیں خالہ بی۔" اس نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

"اور کیا بیٹا کوئی کسی کا عمر بھر کا سائزہ سٹوڈے ہی دے سکتا ہے، بس ادھر والے کی نگاہ رہے۔" انہوں نے ہولڈال کے بند کستے ہوئے بڑی رفت بھری آواز سے کہا۔

"اور پھر یہاں ہم لوگوں کا کیا ہو گا۔؟" رضیہ نے بڑے دکھ سے سوال کیا۔

بڑی بیگم نے کوئی جواب نہ دیا۔

رضیہ نے اپنے آپ میں کہنا شروع کیا۔ "اچھا ہے، بھائی عا اور بھائی جان تو پاکستان میں خوش ہیں۔ ارفاط بھائی اور چھوٹے بھیا ہوٹل میں مگن۔ ایک ہم بد نصیب ہیں۔ اونہ۔! مرے لڑکیا، بیٹے لڑکیا، بڑی بیگم لے ذرا کرب سے اس کی طرف دیکھا۔

"وئی بی بی یہ مخوس بانیں کیسی کر رہی ہو۔؟"

چنوپاس دبھیا اپنے چھوٹے لڑکے میں کپڑے ڈال رہا تھا۔

وہیں سے چلا کر بولا۔

"تو پھر آپ رک کیوں نہیں جاتیں۔"

رضیہ چنوسے مخاطب ہو گئی۔ "خالہ بی کو ہم سے محبت ہوتی تب

رکتیں۔ وہ تو.....“

”ٹری بیگم نے بیک کر اس کا منہ بند کر دیا۔“ ہتھارسی پائیں بھی نہ رہی
ہوتی ہیں۔ میرا کون ہوتا بیٹھا ہے جس میں اپنا جی اٹکا دے گی۔“
ماں کی موت کے بعد سے رضیہ کے منہ پر ہنسی نہ آتی تھی۔ بس آنسو
ہی آنسو تھے کہ اڑے آتے۔

ٹری بیگم نے ہر تہہ دکھ سے رضیہ کو دکھایا۔
”میں چلی تو جاؤں، مگر پھر کوئی تو نہ ہو گا کہ آنسو ہی پونچھ دے۔“
انہوں نے ہولڈال کے بند کھول دیے۔
دن چوٹی کی چال گزرنے لگے۔

ٹری بیگم رکنے کو نور کھینچیں، مگر اپنے آپ میں کھپائے جاتیں۔
اگر رضیہ کے آنسوؤں کا واسطہ نہ ہوتا تو کبھی کا گھر چھوڑ چھاڑ کر چلی
جاتیں۔ اشرف میاں ایسی سیلڈی ناک کے تھے کہ کوئی چیز میاں کے من
نہ سمجھاتی۔ پٹھان تھے اور گورے چپے بھی۔ بات بات پر سرخ پڑ جاتے۔
خون جوش کھانے لگتا۔ ٹری بیگم کی مردت ماننا تو کچھ سمجھنے سی نہ تھے۔
یوں ان سے بڑناؤ کرنے جیسے یہ تو ان کا حق ہی تھا۔ انسان کچھ تو غیر اور
اپنے دلے بن نہیں رکھتا ہے۔ مگر وہ تو ان پر اپنا حق سمجھے بیٹھے تھے۔ مگر
دن گزرے تو وہ بھی ان کے مزاج کی عادی ہوئی گئیں اور اب تو یوں
ہونے دگا کہ وقت پڑے پر خود اشرف میاں سے صبر کر کے اپنی بات
منوا لیتیں۔

اشرف میاں شہر میں وکیل تھے۔ نام بھی بڑا تھا۔ اور ساکھ بھی
خود بھی تعلیم یافتہ تھے۔ بیٹوں کو بھی تعلیم دلوائی اور بیٹی کو بھی۔ پردہ

جبرہ برائے نام ہی تھا۔ روشن خیال لوگ تھے، پرانی باتوں کا چلنا ان کے ہاں نہ تھا۔ نہ رضیہ کو کسی بات پر پابندی تھی، نہ کہیں آنے جانے پر روک ٹوک۔ کالج بھی جاتی تو کھلی موٹر بیس۔ یوں خوبصورتی اور دکھائے کو ریشمی پردے بھی پھڑپھڑاتے تھے۔ مگر ان سے پردوں کا کام نہ لیا جاتا۔ ذکیہ بیگم شہر میں بیاہی گئی تھیں۔ جیسا ماحول انسان کو ملتا ہے۔ اسی کا عادی ہو جاتا ہے۔ ذکیہ بیگم کا بھی وہی چلن ہو گیا۔ جوان کی سسرال کا سقا۔ بڑی بیگم رہیں گاؤں والی، وہاں آئیں تو عجب ترقی پسندی دیکھی۔ بولیں، کچھ اپنے گھر کی سی بات تو نہ تھی۔ پردے کو آئی تھیں، خواہ مخواہ گھر کے معاملات میں دخل اندازی کر کے ٹکوکیں ملتیں۔ ایک دن بڑی بیگم پورچ میں کھڑی ہیں۔ کوئی چار ساڑھے چار بجے ہوں گے کہ اکدم موٹر آ کے رکی۔ رضیہ اندر ہی۔ چہرے پر مہنسی بکھری ہوئی۔ منہ تھمارہا تھا۔

بڑی بیگم لے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ ماں کی موت کو اتنے دن گزر گئے تھے۔ کبھی کبھو لے بسرے بھی مسکراہٹ منہ پر نہ ٹھہکتی تھی۔ آج تو انگ انگ مسکرا رہا تھا۔

”چھپے چھپے چلتی چلتی اس کے کمرے تک آئیں۔ رضیہ نے کتا بیا مین پر پیچ دیا اور مہنسی کر بولی۔

”خالہ بی آج کالج میں مشاعرہ تھا، بس مزہ آگیا۔“

بڑی بیگم کو اس میں تو مہنسی کا کوئی پہلو ہی نظر نہ آتا تھا اجرت سے بولیں۔ ”پھر۔؟“

”ارے خالہ بی۔ بڑے اچھے اچھے شاعر آئے تھے۔ اس قدر

ہنگامہ رہا آج۔ آپ بھی چلتیں، بڑا لطف رہتا۔“
 ”نہ بابا۔“ خالہ بی کانوں پر ہاتھ رکھ کر بولیں، ”غیر مردوں کے
 سامنے جانے سمجھنا کچھ اچھا لگتا ہے۔“

رضیہ دور سے منہسی۔ ”واہ خالہ بی یہ اچھی سائی۔ پھر یہ تو
 دیکھیے کہ اتنے سارے لوگوں میں کون کسی کو دیکھنا بیٹھتا ہے۔“
 ”اے واہ! دیکھنا کیسے نہیں۔“ نگاہ پڑھی جاتی ہے۔“
 رضیہ کا چہرہ گلا بی گلا بی ہو رہا تھا۔ ”آپ بھی کیسی پرانے قوتوں
 کی بنی باتیں کرتی ہیں۔ اچھا دیکھیے کسی دن اپنے ہاں شاعرہ منعقد کرئیگی۔“
 ”نہ بی بی،“ بڑی بیگم ہوں گیئیں، ”ایسے غیر مردوں کا جگمگ اپنے
 ہاں نہ لگا بیٹھنا۔ خدا رسول کا بھی کچھ خوف ہے کہ نہیں۔“
 غیر مردوں کا جگمگ تو خیر دکیل صاحب کے ہاں نہ لگا، مگر ایک
 دن رضیہ کا لچے سے لونی ٹنوا اس کے ساتھ ایک نوجوان بھی بیٹھا ہوا
 تھا۔ گوار رنگ، بڑے بڑے نہرے بالی۔ دونوں منہس منہس کر باتیں
 کر رہے تھے۔

منہسی کی غیر مانوس آواز سن کر بڑی بیگم نے کمرے کی کھڑکی سے
 جھانکا۔ رضیہ موٹر کے دروازے میں اندر کی طرف سر ڈالے کھڑی تھی۔
 اور سنبھے جا رہی تھی۔

”اس دن آپ کی نظم تو واقعی سب پر چھپا کر رہ گئی تھی۔“
 ”آپ کی درد گوازی ہے، ورنہ ایسی کوئی قابلِ تعریف نظم تو
 تھی نہیں۔“
 ایک دلکش قبضہ بلند ہوا۔ ”اب یہ آپ کی کسر نفسی ہے۔ ورنہ

آپ خود جانتے ہیں کہ بار بار آپ کو پڑھوایا گیا۔ اور آپ نے جو ربا عیاں پڑھی تھیں۔ وہ ... " اکدم وہ رک کہ بولی۔ " ارے میں نے آپ سے یہ بھی نہیں کہا کہ اندر چل کر بیٹھیے۔ آپ بھی سوچیں گے میں کتنی بدتمیز ہوں۔ " اور موٹر سے نیچے اتر " اودہ۔ " وہ مسکرایا۔ " ایسی کوئی بات نہیں۔ " اور موٹر سے نیچے اتر آیا۔ سفید قمیص، سفید نپلون، اونچا سا قد، نہت ہوا چہرہ۔ بڑی بیگم کو اس میں کوئی برائی نظر نہ آئی۔ مگر یہ کیا کم برائی تھی کہ رضیہ اس سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ ایسے غیر مرد سے جو نہ ماں کا سگائے نہ باپ کا سگائے۔
توبہ۔

رضیہ کے چہرے کی دیرانی اور وحشت اب دیر ہو گئی تھی اور اس کی جگہ مستقل سرخی چھائی رہنے لگی۔ یا تو سدا خاموش خاموش رہتی تھی۔ یا اب اپنے آپ میں مسکرائے جاتی، گنگنائے جاتی۔

ایک دن رضیہ صبح سے جو کالج گئی تو نوٹ مٹک نہیں لوتی۔ رات کے کوئی دس ساڑھے دس کے انداز میں موٹر کے گھڑا گھڑانے کی آواز آئی اور موٹر سچا ٹک میں داخل ہوئی۔ بڑی بیگم نے اپنے کمرے سے جھانک کر دیکھا، رضیہ اتر رہی تھی۔

سفید ساڑی، سفید بلاؤز، گھونگھریالے بالوں کے چھیلے اس کی پٹیان کے دونوں طرف جھلک آئے تھے۔ اس نے ذرا آگے بڑھ کر طلائی پر بندھی ہوئی نازک سی گھڑی میں ٹائم دیکھا۔ پورچ کی دودھیا روشنی میں رضیہ خطرناک حد تک حسین اور معصوم نظر آ رہی تھی۔

" ایسی پیاری صورت پر تو کوئی بھی آسانی سے عاشق ہو سکتا ہے۔ "

بیگم نے گہرا کر سوچا اور ان کی نگاہوں کے سامنے ایک ہیولا سا بھر
 آیا۔ اونچا قد، بڑے بڑے نہرے بال، سفید قمیض، سفید تپلون،
 مسکراتا چہرہ۔
 بڑی بیگم اپنے کمرے سے نکل آئیں۔ رضیہ بڑی منوالی چال چلتی
 اپنے کمرے کو جا رہی تھی۔

"سنو بیٹا۔" انہوں نے ذرا سہاری آواز سے کہا۔

"جی۔" رضیہ ٹھٹھک گئی۔

"تم اب تک کہاں تھیں؟"

"بنے کے ساتھ۔" وہ بڑی معصوبیت سے بولی۔

"بنے۔؟ بنے کون۔؟" خالہ بی نے حیرت سے پوچھا۔

رضیہ ہنس دی۔ "وہ اس دن جو آئے تھے نا۔" پھر خالہ بی
 کے حافظہ میں یاد کو ابھارنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"وہ۔ وہی اونچے اونچے سے ہیں۔ پھلنے جنہیں چائے پلائی

تھی۔ ارے جو شاعر ہیں۔"

خالہ بی کو یاد آگیا۔ ذرا تلخی سے بولیں۔ "کیا کر رہی تھیں اس

کے ساتھ۔"

"شام غزل، کے نام سے ایک ادبی پروگرام ہونے والا ہے سارا

دن اسی گورکھ دھندے میں ختم ہو گیا۔ ان کس برسی طرح ٹھٹھک گئی

ہوں۔" وہ پاؤں جھٹکتے ہوئے بولی۔ مگر اس کے چہرے پر جھکنے کوئی

آثار نہ تھے۔

بڑی بیگم نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور آہستہ سے بولیں۔

”تم خود سمجھدار ہو بیٹی۔“

اشرف میاں کو بیٹی سے اتنا ہی سروکار تھا کہ اس کے کھانے

پینے، پہننے اور بھینے کا۔ ہر ہر بات کا خیال رکھیں۔ یہ نہ سوچیں کہ جوان لڑکی کیسے کدھر آتی جاتی ہے۔ نہ یہ دیکھیں کہ بن بہار کے یہ گانوں پر گلاب کیوں کھل رہے ہیں۔ جہاں کسی چیز کی ضرورت پڑی یہ باپ کی پیٹھ سے جا کھڑی ہوئیں اور باپ نے جھٹ چیک ساٹ دیا۔ پھر یہ نہ پوچھیں کہ ”بیٹی یہ ضرورت کیوں پڑتی ہے۔؟“ بس بیٹیا کا دل نہ ٹوٹ جائے۔

”بیٹے تو خود ہی پڑھ لکھ کر کمائی کرتے ہیں، انہیں کیا روپے پیسے

کی ضرورت۔؟ ہاں بیٹیوں کا دل نہ ٹوڑنا چاہیے۔“

کبھی تو منہ اٹھا کر نہ پوچھا کہ ”بیٹی تم کن گلیوں کے چکر کاٹی ہو۔؟“

رضیہ بی کے واحد غم خوار اور راز دار چنوبیاں تھیں۔ کالج سے لوٹ

کر گھر پر چوٹا نم گزرتا، انہی کی صحبت میں۔ بڑی بیگم ایک دن باہر تخت

پر بیٹھی آلو جھیل رہی تھیں، اندر رضیہ اور چنوبیاں باتیں ہو رہی تھیں۔

”اچھا بتائیے جی چنوراجہ آپ نے اب تک اسکول میں کیا کیا

پڑھا ہے۔؟“

”اب آپ کو سارے کا سارا کیسے بتائیں۔ آپ کچھ پوچھتے تو جواب

دیں۔!“

”اچھا کیو پڈ کے بارے میں کچھ پڑھا ہے۔؟“

”کیو پڈ۔؟“ چنوبیاں حیرت سہری آواز خالہ بی کے کانوں سے ٹکرائی۔

”ہاں ہاں کیو پڈ۔ جو اندھا ہوتا ہے اور بس پیٹھ پر نرکش دھرے

تیر پتیر چلتا نا پھرنا ہے۔“

”جانے کیا تک رہی ہیں آپ۔“ وہ جھنجھلا کر بولا۔ ”تو وہ بن بات
تیر کیوں چلاتا رہتا ہے۔؟“
”بس بڑی نہیں۔“ رضیہ ہنسنے لگی۔

”کچھ بتاتی تو ہیں نہیں، بس سننے جا رہی ہیں۔ میں کیا سمجھوں۔؟“
”بہت دیر تک رضیہ کی کھٹکھٹاتی آواز آتی رہی۔ پھر بڑی ہی
ننگفتگی سے بولی۔

”سن چنو، لوگ کہتے ہیں وہ بڑا ہونٹا ہے نا! تو بس کسی کے
دل پر بھی زبرد چلا دیتا ہے۔ چاہے بڑا بڑا ہو، جوان ہو۔ لڑکا ہو کہ لڑکی۔“
”بڑی بیگم نے بڑی ناگواری سے اس کے کمرے کی طرف دیکھا۔
چنو بڑی معصومیت سے پوچھ رہا تھا۔
”کہیں آپ کے دل پر تو زبرد نہیں لگ گیا۔“ اس کی آواز میں
ہلکا سا خوف چھایا ہوا تھا۔

رضیہ سنجیدہ ہو گئی۔ ”وہی میں بھی سوچ رہی ہوں چنو۔ جانے
سردی کا اثر ہے یا کیا ہے، ان دنوں سینے میں درد ہوتا رہتا ہے۔“
”کس لاؤں۔؟“ چنو باہر دوڑنے لگا۔

رضیہ ارے ارے ارے کرتی رہ گئی۔ مگر چنو باہر دوڑ گیا۔
”بڑی بیگم کچھ سمجھیں، کچھ نہ سمجھیں۔ مگر وہ اپنے کو دوسرے بڑی بیگم
ناشتہ کی میز پر لے لیں۔

”ہاں بیٹا تم ڈاکٹر کے ہاں کیوں نہیں چلی جاتیں۔؟“

”کس لئے۔؟“ رضیہ حیرت سے بولی۔

”تمہارے سینے میں تکلیف جو ہے۔ رات تم چنو سے ذکر بھی تو کر رہی

تھیں نا۔ ؟

رضیہ کو منہسی آگئی۔ "نہیں نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔" وہ اگلے اگلے بولی۔

اشرف میاں نے اپنے چپے کے اوپر سے جھانکتے ہوئے کہا۔ "نہیں لیٹا اگر کوئی تکلیف ہے تو جلدی سے دوا منگو الو۔ بیماری میں ڈھیل دینی ٹھیک نہیں۔"

بڑی بیگم کی عجیب مصیبت تھی۔ رضیہ بی کے رنگ نہانے تھے کہ وہ کچھ کر گزریں گی، اور باپ تھے کہ ہر طرف سے بے فکر۔ اگر کچھ منہ ہلاتی ہیں تو رضیہ بی منہ پھلا لیں گی۔ "سبھی یہ کون ہوتی ہیں مجھے ٹوکنے والی۔" بات ٹھیک بھی تھی۔ سگے باپ نے جب ڈھیل دے رکھی تھی۔ تو یہ تیسرے کو لے کر صحرے سننے کی حق دار تھیں لاکھ خالہ خالہ حاجی تھیں۔ مگر تھیں تو پرانی سی۔ باپ جو سر پر موجود تھے! مگر آنکھوں دیکھتے ان سے صبر بھی نہ ہونا تھا۔

"کچھ نہ کچھ نافرور ہو کر رہیگا۔" انہوں نے گہرا کر سوچا۔

"خدا خیر ہی کرے۔ جوان بیٹی کا معاملہ ہے اور یہ کمبخت گھر انہ ایسا ہے کہ نہ پردے کی فیدہ کہیں جانے آئے پر پابندی۔ ورنہ کہیں یہ سبھی کسی نے سنا ہے کہ جوان بیٹیاں خود موٹر پر اڑاتی پھر رہی ہوں۔ مشاعرے میں کھیلے بندوں شرکت کر رہی ہوں، اور موٹر کے دروازوں میں سر ڈال ڈال کر کہتی ہوں۔" آپ کی نظم تو واقعی سب پر چھا کر رہ گئی تھی۔"

بڑی بیگم کو بس آجا کے یہی حل سوچا کہ بی رمنو کے ہاتھ پیلے کر دیں۔

انہی دنوں ایک حج صاحب نے اپنے بیٹے کے لئے رضیہ کو ساگنا بھی تھا۔ بڑی بیگم کو دھن لگ گئی کہ جس قدر جلد یہ کار سلجھ جائے بہتر ہے۔ رضیہ کی موجودگی میں ایک دن کھانے کی میز پر قصداً انہوں نے یہ ذکر چھیڑا۔

”حج صاحب کے بیٹے کے بارے میں آپ نے کیا سوچا ہے؟“
 انشرف میاں نے ہاتھ روک کر حیرت سے دیکھا اور بولے۔
 ”ابھی سے۔؟ سبھلا اتنی جلد۔؟“

”اے لو۔ اسے جلد ہی کہتے ہیں۔ بیس کی ہونے کی تو سوچ رہی ہیں صاحبزادی اور باپ کہتے ہیں ابھی سے۔“
 ”مگر سچ بھی اسے تسلیم تو پوری کر لینے دو۔ بی۔ اے کا آخری سال ہے، کم از کم گریجویٹ تو ہو لے۔“
 ”اوہ نہ! تعلیم کا کیا ہے؟ شوق ہے تو شادی کے بعد بھی پڑھ ہی لے گی۔“

رضیہ نے سبھنا کو بڑی بیگم کو دیکھا۔
 ”ابھی بچہ ہے۔“ باپ بول رہے تھے۔
 ”بچہ ہے۔؟“ بڑی بیگم حیرت سے بولیں۔ ”ابھی شادی کر دو تو اس بچے کو بچہ ہو جائے۔ ہو نہ۔“ انہوں نے تیزی سے چیخ مچا۔
 ”ہر باپ کو اپنی بیٹی سدا بچہ ہی نظر آتی ہے۔“
 رضیہ نے نوالہ ہاتھ میں تنھاے تنھاے بڑی لاپرواہی سے کہا۔
 ”ابھی تو میں بی۔ اے کروں گی۔“

بڑی بیگم کے ہاتھ کا نوالہ بھد سے رکابی میں جاگرا اور سالن

کی سرخ سرخ چمپٹیں ان کے کرتے پر بکھر گئیں۔ "دوئی یہ کیسی میٹھی ہے کہ اپنے منہ سے شادی کے معاملہ میں دخل دے رہی ہے۔"

اشرف میاں نے انسی بڑی بات پر سنجیدگی سے غور نہ کیا۔ بڑی منانیت سے بولے۔

"ٹھیک ہی تو کہتی ہے۔"

ادھر رخصتہ بی کو باپ کی شدہ کیا ملی کہ اب کھلے غزانے بی۔ اے کی اسٹڈی ہونے لگی۔ گھر گھر کر کے موٹر رکنتی اور ایک دروازے سے بنے میاں اور ایک دروازے سے رخصتہ بی ڈرائیونگ روم میں شر شاعری پر مباحثے ہوتے، ادبی بحثیں پھرتیں، نعلین غزلیں پڑھی جاتیں اور چائے پی جاتی۔ بڑی بیگم نے اپنے منہ میں مونگ بھر لئے۔ کوئی۔ نہتا ہی نہیں تو بولیں سچی کس ہے۔

ایک دن رات کے آٹھ بجے جب میز لگ چکی تھی اور سب کھانا کھانے میں مشغول تھے کہ تار والے نے آواز دی۔ بڑی بیگم کا جی اڑنے لگا اور اشرف میاں منہ کھولے تار کے معنون کا انتظار کرنے لگے۔

"بڑے سجائی صاحب اور سجائی جان پاکستان سے آج سے چوتھے روزہ میاں پہنچ رہے ہیں۔" رخصتہ بی بڑھ کر سنایا۔

جمال میاں اور حامد میاں کے یوں یکا یک آنے کی غرض و غایت کسی کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ مگر پھر بھی گھر بھرے ہیں خوشی سمیل گئی۔

باپ نے علی گڑھ تا کر دایا کہ مٹھوڑے دونوں کے لئے چھوٹے بیٹے بھی آج آ رہے ہیں۔ پھر جیلا پاکستان سے روزہ روز کوں آئے ہیں یہاں تو پرمٹ اور وزیر کی جنٹل ہی مہینوں تک ختم ہونے میں نہیں آتی۔

جمال میاں ، حامد میاں آئے تو ان کی بیٹیوں بچوں سے گھر میں
 ہنگامہ مچ گیا۔ بڑی بیگم گھنٹوں دونوں بھائیوں سے سر جوڑے
 باتیں کرتی رہتیں۔ اب کہیں جا کر ان کا دل ہلکا پڑا۔
 یوں تو دونوں بھائی کوئی آٹھ ماہ کا پرمٹ بنوا کر بندہ
 آئے تھے ، اور ابھی جانے کو تو دن پڑے تھے ، مگر چاہتے یہی تھے کہ جلد
 سے جلد بہن کی شادی طے ہو جائے۔ پھر کون جانے بعد میں طے ہونے
 پر شامل ہو سکیں ، نہ ہو سکیں !

جج صاحب کے بیٹے کے علاوہ اور بھی دو چار پیام نگاہ میں
 تھے۔ اس لئے غور و خوض ہونے لگا۔ کہ بی رخصت کو کس کے ساتھ بیاہا
 جائے۔ ادھر بی رخصت تھیں کہ شاعر میاں کے ساتھ جنم کرم تباخ کے
 بارے میں طے طور سے طے کر چکی تھیں۔ جان پر کھیل جاتیں مگر
 کسی اور کا ہاتھ نہ تھا متیں۔ جمال میاں ان سے بڑے فرور تھے ،
 ... ، مگر دشمن خیال گھرانوں میں جو بے تکلفی ہوتی ہے وہ یہاں
 بھی بہن بھائی میں موجود تھی۔ بھائی نے ایک دن بات شروع کی۔
 " رخصت جانتی ہو یا میاں بوڑھے ہو رہے ہیں۔ کچھلی بار جب میں
 ہندوستان آیا تھا تب سے اب تک ان کی حالت میں زمین آسمان کا
 فرق ہے۔ اس پر امی جان کی موت نے الگ اثر کیا۔ موت زندگی کا کیا
 بھروسہ ہے۔ ؟ خالہ بی اپنے گھر کی ، ہم رہے پاکستان میں سبھی تم ہی
 شادی کر ڈالو۔ ایسے موقع پر ہم موجود ہیں دراصل ہم اسی لئے
 آئے ہیں کہ تمہاری شادی کر دیں۔ "

" ہوں۔ تو خالہ بی نے بلوایا ہو گا۔ " رقبہ نے منہ سے کچھ نہ کہا۔

بس بھائی کو دیکھتی رہی۔

"ایک حج صاحب کے صاحبزادے ہیں۔ ایک وہ پردیسر تھا۔ اور ایک چھوٹی سی ماں کے بیٹے۔ تم خود بھی پڑھی لکھی ہو، عقل رکھتی ہو، اپنا برا سجدہ سمجھتی ہو۔ تم کس کو اپنے لئے مناسب سمجھتی ہو۔" "اگر مناسب سمجھنے کا سوال ہے تو پھر میں بے سے شادی کر دیتی۔" رقیبہ نے معصومیت سے جواب دیا۔

"بے سے؟" بھائی صاحب اپنی جگہ سے اچھل پڑے۔ "خالہ بی نے آگے ہی شاید مہبت کا بی بھر دیئے ہیں!" حیزی سے بولے۔ "بے سے شادی کر کے کیا لوگی؟" رقیبہ بڑی سادگی سے بولی۔ "وہی جو حج صاحب کے بیٹے سے ہوں گی۔"

"کمال ہے!" وہ غصے سے بولے۔ "ابا میاں کی پوزیشن کا کچھ تو خیال کرو۔ وہ اتنے بڑے آدمی ہیں، ان کا اتنا بڑا نام اور صاحبزادی شادی کر رہی ہیں ایک شاعر سے کہ جس کے پاس بیوی کو پالنے کے لئے کوئی مستقل آمدنی بھی نہیں۔ اس سے تو شادی کرنے سے بہتر یہ ہے کہ ساری عمر کنواری ہی رہو۔"

"تو کیا میں اس کی آمدنی سے شادی کر رہی ہوں؟" "سرکچہ کرو دگی نبوبی۔ جب فاقے پڑیں گے تب تپہ چلے گا۔ ابھی ابا میاں سنیں گے تو گولی داغ دیں گے۔"

بڑے شاعرانہ انداز سے رقیبہ بی بولیں۔ "مگر محبت کے سینے پر کون گولی داغ سکتا ہے!"

”اچھا۔“ جمال میاں غصہ میں سمجھ کر بولے، ”تو یوں کہیے کہ جنابہ کو محبت ہو گئی ہے شاعر اعظم سے۔!“
رضیہ نے ناگوار سی سے سجائی کو دیکھا۔ ”آپ مجھ پر جبر نہیں کر سکتے سجائی صاحب۔ مجھ میں اتنی ہمت تو یقیناً ہے کہ اپنا گلا آپ گھونٹ سکوں۔“

باپ کے کانوں تک پہنچتے دیر نہ لگی کہ مہاجرادی نے کون سا راستہ اختیار کر رکھا ہے۔ پٹھانی خون جوش کھا گیا اور کانوں کی لوہی سرخ پڑ گئیں۔

”ہم بھی سمجھ لیں گے مہاجرادی کتنے پانی میں ہیں۔“
مگر وہاں تو تپہ ہی نہ چل سکا کہ واقعی کتنے پانی میں ہیں۔
سجائیوں، سجادوں، بھتیجیوں سے بات نہ چیت۔ گھر سے کالج، اور کالج سے گھر۔ بس منہ لپیٹے پڑی ہیں۔ کہاں تو خالہ بی بجائے ماں کے تھیں یا اب انہی خالہ بی کی صورت زہر ہو گئی تھی۔

ایک دن کالج سے آکر یونہی پڑی تھیں۔ منہ اترا ہوا، آنکھیں کھینچی ہوئیں۔ چہرے پر محرم برس رہے تھے۔ جب سے سجائی صاحب سے بات چیت ہوئی تھی ادھر بنے میاں کا آنا جانا بالکل بند ہو گیا۔
خفا۔ مگر اس دن شام کو بنے میاں وارد ہو گئے۔ مرد لوگ تو کسی جگہ ملنے گئے ہوئے تھے، بس گھر میں عورتیں ہی عورتیں تھیں۔ رضیہ ہی کی عید ہو گئی۔

دوڑتی ہوئی چھاٹک تک گئی۔ ڈرائیونگ روم میں لا کر بٹھایا
آدر کر مین سے چائے کا کہہ دیا۔ چائے بن کر آئی تو مہنوں نے خود اپنے

ہاتھوں چائے پیالیوں میں اٹھ بیٹھ کر بنے میاں کے ہاتھ میں تنہائی۔
 ”کیا بات ہے۔؟“ چہرہ اتنا اداس اور رویا رویا سا کیوں ہے
 تنہارا۔؟“ وہ غور سے ان کے چہرے کو پڑھتے ہوئے بولے۔

رضیہ فی معصومیت سے بولیں۔ ”دیکھو نا۔! یہ سب لوگ
 کہے میں کہ میری شادی حج صاحب کے بیٹے سے کر دیں گے۔ بھلا میں
 کیا کروں گی ان کے ساتھ شادی کر کے، صبح سے شام تک اس
 بچہ کو سنبھالنے کی طرح بس اسٹریٹ لائٹس کی روشنی میں رہوں گی کیا۔؟“
 بے میاں ہنس پڑے۔ ”لوہ لینے کو چھوڑا۔“ تو ہوا کیا؟ اچھے
 امیر گھر پر رہی ہو، کرو یا۔؟“

رضیہ نے لبس آنکھیں اٹھا کر دیکھا۔ وہ سے کچھ نہ کہا ہے
 میاں اپنے آپ نیسے رہے۔

خالہ بی کسی کام سے ادھر سے کچھ دیر بعد گزری تو کمرے سے
 دھیمی دھیمی بانوں کی آواز آرہی تھی۔ سنا چاہا، مگر کان تو پٹ نہ
 اننی دور کی بات بھلا کیا سمجھ آئی۔

دوسرے دن صبح انہوں نے، جب اسٹریٹ میاں اخبار لے
 بیٹھے تھے۔ رات کی بات کہہ سنائی۔

”بے میاں کل سچہ آئے تھے۔!“
 اسٹریٹ میاں کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔

ہاں چھڑکنے والے باپ کیا سے کیا ہو گئے کہ اب صورت نک
 دیکھنے کے روادار نہ تھے۔ یا تو ہر دن باہر جاتے ہوئے پوچھ جاتے تھے۔
 ”بلیا کو کوئی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔؟“

خبر منوع

”ہاں سمجھی۔ بیٹا کے لئے کیا لاؤں۔؟“
 پھر شام کو واپسی پر ساتھ میں کبھی تو کپڑوں کا بندل لپٹاتا
 کبھی کتا بوں کا پارسل، کبھی بیا کلیٹ تو کبھی سچل۔ اب کہاں کے سچل
 اور کدھر کی مٹھائی؟ بڑی بیگم اور مہال میاں سے دو چار بار کہلوا یا
 بھی، مگر وہ تو یونہی بند نہی رہی۔

”شادی تو بس دنپے سے ہی کروں گی۔“

”بہٹی ذات کو اتنی شہ دینا مناسب نہیں، مگر ہم کہیں بھی تو
 سنے کوں۔؟ رات بے رات، دیر سویر گھر کو ٹوٹنا، چائے پارٹیوں میں
 شریک ہونا۔؟ شاعروں میں شرکت کرنا۔؟ عزم ردی کے ساتھ گھومنا
 یہ کوئی شریف بیبیوں کے رنگ ڈھنگ ہیں۔؟ میں کہوں ایسی بھی
 کیا آزاد ہی۔؟ اب بیٹھے ہیں نا ہاتھ پر ہاتھ دھر گئے۔“
 بڑی بیگم، دونوں مہو کوئی کلمے سامنے دل کے چھپھوٹے پھوٹنے۔
 گھر میں جادھر جاتے ادھر یہی پہنچنا بڑ۔ تنگ تنگ ہو کے
 اشرف میاں نے اعلان کر دیا۔

”میں نے حج صاحب کے ہاں حامی بھر دی ہے، شادی کی

تیاری شروع کر دو۔“

گھر میں ادھر جھم جھم لپے کوٹے چپکنے لگے اور ادھر جھم جھم آلتو
 بی رضیہ کی آنکھوں سے گرنے لگے۔ اس دن پہلی بار اس کی آنکھ
 سے آنسو ٹپکا۔ اور یوں رو دھو کر انہوں نے بارمان لی۔

اس دن کالج کو چھٹی تھی۔ رضیہ بی دن بھر سے اپنے کمرے
 میں ہی تھیں۔ شام کو کوئی ساڑھے چار بجے اپنے کمرے سے باہر نکلیں۔

سفید ساڑھی، سفید بلاؤز۔ چال میں ہم آہنگی چہرے پر سحر پور
الہیائیں، یوں جیسے حالات سے سمجھوتہ کر لیا ہو۔ اتنے دنوں سے
آنے جانے پر پابندی سختی اور یوں بڑی میگم سے بول چال بھی جھوٹ
چکی تھی۔ مگر اس دن قریب جا کر لو لیں۔

”خالہ بی میں ذرا اپنی سہیلی کے ہاں جا رہی ہوں۔“
”کیوں؟“ انہوں نے ساڑھی پر ہاٹاٹاٹے ٹانگتے ہی پوچھا۔
”اس کا رسم ہو رہا ہے آج منگنی کا۔“

”وہ تو کوئی ایسے خوشی کے موقعوں پر سفید ساڑھی پہن
کرتا ہے۔“ کوئی رنگین جوڑا پہن لو۔“

”نہیں، مجھے سفید ہی کپڑے اچھے لگتے ہیں۔ وہ لا پر وائی
سے بولی۔“ شام تک لوٹ آؤں گی۔ شاید ابامیاں کو کہیں جانا ہو
اس لئے سکاڑھی نہیں لے جا رہی ہوں۔“

شام کے سات آٹھ بجے کے انداز میں ایک لڑکا ایک جھٹی لیکر
آیا۔ رضیہ کی تحریر تھی، اپنے باپ کے نام۔

ابامیاں! آج شام پانچ بجے میں نے اپنی پسند سے بنے سے
شادی کر لی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کو اس خبر سے بہت
دکھ پہنچے گا۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی یقین ہے کہ آپ
میرا اس خطا کو معاف کر دینگے۔ آخر میں آپ کی اکلوتی
بچی ہوں اور بچپن سے آپ میری خطائیں معاف کرتے
آئے ہیں

آپ کی دعاؤں کی طالب
رضیہ

آٹھ دن سے رونیہ گھر سے باہر تھی، اور اشرف میاں کا یہ عالم تھا کہ مارے غصے کے انگاروں کی طرح پھینکنے جا رہے تھے۔ گھر کی فضا ہی بدل گئی تھی۔ نہ کوئی کسی سے بات کرتا تھا، نہ کسی کے مزاج ملتے تھے۔ بس اپنی اپنی جگہ چلے جا رہے تھے۔ ایک دن بڑی ہمت کر کے بڑی بیگم نے اشرف میاں سے کہا۔

”اب میں کہوں غصہ پتہ کر کے فائدہ بھی کیا ہے؟ جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ اب ہمارے غصے سے شادی تو ٹوٹنے سے رہی۔“

”شادی نہیں ٹوٹ سکتی۔ ٹھیک ہے مگر میں اس کمبخت کو بند دق سے چھو تک تو سکتا ہوں۔ اس کی اتنی ہمت ہوئی تو کیسے؟“ مارے غصے کے ان کے منہ سے بات نہ نکل رہی تھی۔

”مارے بھی فائدہ کیا ملے گا۔؟ اچھا ہی ہوا اپنے گھر کی ہو گئی تنہائی بڑی بری ہوتی ہے۔“

اشرف میاں نے فوں فوں کر کے ان کی طرف دیکھا۔

”کوئی حماقت سی حماقت ہے! خود بھی کہے جا رہی ہیں اچھا ہوا۔ کیا اچھا ہوا؟“

”مرد کے سہارے کی ضرورت تو ہر عورت کو محسوس ہوتی ہے۔ کیا یہ اچھا نہ ہوا کہ اس نے اپنی پسند اور چاہت سے یہ سہارا ڈھونڈ لیا۔ عورت اگر تنہائی محسوس نہ کرے تو دنیا میں مرد کی ضرورت ہی نہ پڑے۔“ وہ خالی خالی لنگا ہوں سے اشرف میاں کو دیکھ رہی تھیں۔

اشرف میاں نے ایک لمحے کو ان کی اور دیکھا۔ لمحہ سبھرا موشی رہی اکدم وہ سبھر کر بوئے۔ ”بال سبید ہو رہے ہیں مگر عقل نام کو نہیں۔“

”اتنے غصے تھے سے بھی کام نہ چلے گا۔ پریٹ کی اولاد ہے آخر، مٹا
کیوں نہیں کر دیتے۔“

”معاف کر سکتا ہوں، مگر اس صورت میں کہ وہ سپر کبھی اپنی
سسرال نہ جائے۔“

”اے لو! کیا بیٹیاں اسی لئے سہاگ کی چاہت کرتی ہیں کہ
گھر بیٹھ جایا کر رہا۔“

”تو سپر جہاں اس کمبخت کو کبھی معاف نہیں کر سکتا۔ زندگی بھر
اس کی صورت دیکھنا مجھ پر حرام ہے۔“

”ہے ہے ایسی بڑی بڑی قسمیں نہ کھینٹے۔ کیسے باپ ہیں؟ ہم جہاں
نہیں آنا۔ قصور تو اولاد سے ہوتا ہی ہے۔ کیا پوہنی قسمیں کھالیا کر رہے ہیں۔“
”ایسا قصور تو کوئی بھی نہیں کرنا ناگزیر۔“ وہ ذرا نرم پتہ کر بولے۔
”نامراد نے عزت مٹی میں ملا دی ساری۔ ان آٹھ دنوں میں آدھا بھی
نہیں رہ گیا میں۔“

”لو سبھلا عزت کا ہے سے مٹی میں ملا دی؟ کیا کوئی حرام کا پیٹ
گر! یا ہے یا کوئی نا جائز بچہ جنا ہے۔ ایس پنڈر سے شادی ہی کی ہے نا۔
اس میں کیا گناہ ہو گیا؟ یہ تو زندگی کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔“

اشرف میاں نے غور سے ان کی طرف دیکھا، سپر بولے۔
”مگر میں تو اپنی جگہ اب تک یہی سمجھتا رہا کہ کوئی نہ کوئی گڑا بڑ ہو گئی
ہو گی۔ اسی کو چھپانے کے لئے شادی رچا لی۔“

”جانے کس کس کے مہکا دوں میں آ جلتے ہیں آپ۔ گھر میں چلتی پھرتی
دیکھ کر کبھی تو مجھ پر بھیج دیکھتا۔ بالکل بے قصور ہے بچاری۔ بس اتنا

ہی تصور کہ انہی پسند سے بچنا ہے۔ اچھا ہی کیا۔ زندگی تو اسی کو گزارنی
 تھی۔ اگر ادھر ادھر پکڑ کر باندھ دیتے تو کیا ہوتا، جیتے جی مرجاتی۔ اب
 میں کہتی ہوں سبھی طرح معاف کر دیجئے اور چار لوگوں کے سامنے رخصتی
 کر دیجئے۔ شادی تو ہو ہی گئی۔“

اشرف میاں پھر بدک گئے۔ ”ہاں ہاں رخصتی کر دوں۔ اکیوں کر دوں۔
 مجھے معلوم ہے اس کمبخت نے میری بچی سے اسی لئے شادی کی ہے کہ
 جہیز اور زیور اس کے ہاتھ لگے۔ محبت و محبت خاک نہیں۔ آج کل کے
 لونڈوں کو کسی سے محبت نہیں ہوتی۔ بس۔“

”ہے ہے کیسی نا سبھی کی باتیں کرتے ہیں آپ! اس بے چارے کو
 لالچے ہوتی تو یوں کھڑا کھڑی شادی کا بے کور چاتا کہ حرف جسم کے جوڑے
 سے کتنی سستی رہو۔ نہ کوئی سبھاری جوڑا، نہ جسم پر مائٹے کا جھلہ۔ خواہ
 محواہ کی بدگمانی بھی ٹھیک نہیں۔“ بڑی بیگم کی آنکھوں میں بے بات مٹی
 گھل رہی تھی۔

اسی دن شام میں رضیہ آئی۔ اشرف میاں الماری سے کتاب نکالتے
 کھڑے تھے۔ یہ جا کر ان سے ٹپٹ گئی۔ پیٹھ موڑ کر دیکھا تو رضیہ سستی۔ کہاں
 تو بندہ دق سے پھونک دینے کا عزم کئے بیٹھے تھے یا اب گلے سے لپٹا لیا اور
 پھوٹ پھوٹ کر روئے لگے۔ مرنے لگے جھینپتے بنے میاں بھی آئے چوٹوں کی
 طرح کھڑے تھے۔ بسر نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

”آؤ بیٹھو نا میاں۔ اب تو تم ہمارے داماد ہوئے۔“
 شادی کا اصل ہنگامہ اب نکاح خوانی کے پندرہ بیس دن بعد پھر
 اشرف میاں بڑی حیثیت کے مالک تھے اور روپے پیسے کی کمی نہ تھی۔ بیٹی

کا جینز کچھ تو پہلے ہی سے تیار تھا۔ کچھ اب ہو گیا۔ سب اپنے اپنے کاموں میں لگے ہوئے تھے۔ بڑی بیگم جینز کے کمرے میں ایک ایک چیز لاکر رکھتی جاتیں۔

”دیکھئے یہ ساڑیاں آپ دلی سے لائے تھے۔“

”یہ پاندان مراد آباد کا ہے۔“

”یہ چوڑیاں آگرے کی ہیں۔“

ان کی سفید ساڑی کا پلو بار بار گرتا اور وہ بار بار سمجھا لیتیں۔

”ارے — یہ پاندان کیوں رکھ دیا وہاں۔ رضیہ بھلا پان

کب کھاتی ہے۔؟“

”اے واہ تو کیا ہوا۔ آخر دو لہے کو بنا کر دے گی تو ہسی۔“ ان

کے چہرے پر شعلہ سا جلا اور اسی لمحے بچھ بھی گیا۔ وہ پھر سامان کی اسٹا

ٹنچ میں جت گئیں۔

ایک زعفرانی ساڑی انہوں نے میز پر پھیلائی۔ ”یہ آپ لکھنؤ

سے لائے تھے نا۔ دھیان سے مجھے نہاتے جایئے۔ جانے بے چاری

ذکیہ کے ہاتھ کی چیزیں کہاں کہاں رکھی ہیں۔“

”زعفرانی رنگ تو سانولی رنگت پر خوب کھلتا ہے۔ رضیہ تو

اچھی خاصی گوری ہے۔ جانے کیوں خرید لی تھی۔“

سامنے کے سنگھار دان میں بڑی بیگم کو اپنی سانولی رنگت تیزی

سے سرخی میں بدلتی دکھائی دی۔ وہ جھٹ سامنے سے ہٹ گئیں۔

ڈھم ڈھم ڈھم ڈھول پٹے۔ اور رضیہ چار لوگوں کی موجودگی

میں بے میاں کی ہو گئیں۔ رخصتی ہو گئی۔ رضیہ بی اپنی ساس، نند

اور دولہا کے ساتھ سسرال چلی گئیں۔ سنان گھر میں پھولوں کی
مہک اور مرجھائی کلیاں باقی رہ گئیں۔ گھٹی میں اب تک زور زور سے
باجے بج رہے تھے۔

آخر ف میاں بوجھل قدموں سے گھر میں داخل ہوئے۔ بیٹی بیٹی
رہے تو دل بوجھل، آٹھ جائے تو چھاتی بوجھل۔
بڑی بیگم بار بار اپنی آنکھیں پونچھتیں اور آنسو پھرا سی
نیز گ پھراتے۔

”گھر کیا سنان ہو گیا ہے۔“ وہ بھرے گلے سے بولیں۔
”ہاں اب سنان ہی سنانی ہے۔ رضیہ اپنے گھر کی ہو گئی،
بیٹے باہر کے۔ تم تھیں سو ایک رضیہ کی وجہ سے۔ بس اب ہم ہی ہم ہیں۔“
پھو بیگم نے ان کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی عمر سے کہیں بوڑھے نظر
آ رہے تھے۔

”ہاں رضیہ کی وجہ سے بڑی بستی تھی، مگر بیٹیاں بھلا کتبک
ساتھ دیا کرتی ہیں۔؟“
”بیٹیوں کا کیا ہے؟ کوئی بھی تو نہیں دیتا۔ چار دن رہ کر سب
اپنے اپنے ٹھکانوں پر چلے جاتے ہیں۔“ انہوں نے جلدی جلدی لپٹیں
حبہ کا کر بڑی بیگم کو دیکھا اور اکدم کچھ یاد کر کے بولے۔
”ہاں جی تم تو خود رضیہ اور بنے کی شادی کے اتنے خلاف تھیں۔
پھر تمہی نے کیسے ان کا ساتھ دیا۔؟“

”میں نے۔؟“ وہ جبرت سے بولی۔
”اور کیا میں نے۔؟ کبھی کہتیں رضیہ کو معاف کر دو۔ کبھی کہتیں

خمنی کر دو۔ کبھی پیچھا اٹھاتیں کہ دونوں کو گھر بلاؤ۔ کبھی کہتیں بے اچھا
خاصا لڑکا ہے اور کبھی۔
بے تکے انداز میں بڑی بیگم بولیں۔

”میں نے سوچا ہو سکتا ہے تنہائی کا بھوت جس طرح مجھے ڈستا
رہتا ہے اسی طرح رضیہ کو بھی ڈستا ہو۔ پھر یہ مجھے اپنی زیادتی ہی لگی۔“
”زیادتی۔؟“ اشرف میاں حیرت سے بولے ”وہ کیسی۔؟“
”رضیہ کو کسی دکنی کا سہارا تو ہوتا ہی تھا، سو اس نے ڈھونڈ لیا۔
رضیہ کی کیا بات ہے، کوئی بھی عورت بغیر سہارے کے نہیں رہ سکتی
پھر اس میں ناراضگی اور غصے کی کون بات۔؟ اور پھر بے چارہ بے اچھا
خاصا سمجھ دار لڑکا ہے۔“

”تم نے اس کے دل میں جھانکا ہے جو بولیں کتنی ہو۔؟ کیا پتہ وہ
تیز مزاج ہی ہو۔ بھلا رضیہ کو کہاں سہارا ہو گی کہ مرد کی گھر کیاں سنے۔“
سوئے سوئے لہجہ میں وہ بولیں۔ ”ہومبہ۔ سہارا کہاں ہو گی۔“
مرد کی گھر کیاں کھانے میں کیا برائی ہے بھلا۔؟ اور پھر عورت جس سے
پیار کرے اس کی گھر کیاں سننے میں مزہ آتا ہے۔“
وہ آپلی آپ چونکیں۔ ”کیا کہا میں نے۔!“

”تم کہہ رہی تھیں کہ تمہیں مجھ سے پیار ہے اور تمہیں میری
گھر کیاں کھانے میں مزہ آتا ہے۔“

وہ گہرا گئیں۔ ”واقعی میں نے یہ کہا۔؟“

اشرف میاں نے ان کی طرف غور سے دیکھا۔ بڑھاپا نہ جان
سے کہہ رہا تھا۔ ”میں آ رہا ہوں۔ میں آ رہا ہوں۔ میں۔۔۔“

اکدم اشرف میاں زور سے بولے -
 "ارے تم نے وہ زعفرانی ساڑھی رقبہ کے ساتھ کر دی کیا؟"
 "اگر کیا رکھ سکتی؟ جبیز کی تھی۔ جبیز میں رکھ دی۔" وہ دھیرے
 سے بولیں۔

"لاحول ولا قوۃ۔" وہ تیز ہو کر بولے، "اب بھلا رقبہ پر کیا کھلے گی
 وہ ساڑھی۔ اکدم گوری ہے رقبہ۔ تم منہتیں تو کس قدر اچھی لگتیں۔"
 اکدم بڑی بیگم کی نگاہ میں پرٹ پڑے ہوئے پانمان سے جا ٹکرائی۔
 "اے ہے، پانمان یہیں رہ گیا۔"
 "وہ نہیں گیا۔ میں نے رکھ لیا۔"

"کیوں؟" بڑی بیگم تعجب سے بولیں۔
 "منہارے لئے۔" وہ ذرا سا مسکرائے۔

"دوئی میں کب پان کھاتی ہوئی بھلا۔"
 "نہیں کھاتی تھیں تو مجھے تو بنا کر دو گی۔"

بڑی بیگم نے گھبرا کر منہ اوپر اٹھایا۔ اشرف میاں ان کے
 چہرے پر جھکے چلے آ رہے تھے۔

سارے میں سچو لوں اور صندل کی مہک بہکا رہی تھی۔ ڈھم ڈھم ڈھم
 باجوں کی تیز آواز ان کے کانوں میں گھس کر پردے سچاٹنے لگی۔

گناہوں کی پاداش

”ہائے اس ٹوٹی لے تو میری جان لے لی۔“
 شبیم شیو کو کہنے کہ تے گرد بڑا کر اٹھا اور دروازے پر آکر بولا۔
 ”ارے کیا کیا ٹوٹی لے۔؟“
 برآمدے میں نمریا جھلائی ہوئی کھڑی تھی۔
 ”دیکھئے نا پڑوسی کے بچے کو اتنی زور سے پتھر مارا کہ سارا خون
 نکل آیا۔“

”تو اس میں تمہاری جان کیسے چلی گئی۔؟“ شبیم جبرست سے بولا۔
 ”ہائے ہائے میری جان کیسے نہ جائے بھلا۔؟ شرمندگی کے پھیکرے
 تو میرے ہی سر آکے پھوٹتے ہیں نا کل رزاق صاحب کے کہتے کو اس زور
 سے کلڑی ماری کہ وہ لنگڑا ہو گیا۔ رحمت علی کی بنی کو چھت پر سے نیچے
 پھینک دیا۔ ڈاکٹر صاحب کی بچی کے ہاتھ سے موٹائی چھین کر کھا
 گیا۔ اور یہ سب منقدمات آتے ہیں میری عدالت میں۔ یہ کوئی بات
 ہی نہیں ہوئی۔؟“
 ”قسم خدا کی تریا، تم سبھی بس بات کا تینگڑ بنا ڈالنی ہو۔ الے

بچے شور شرارت کرتے ہی رہتے ہیں۔“

”مگر شرارت بھی شرارت جیسی ہو۔ تین سال کا تو ہو گیا۔ اور۔“
 شمیم جھٹکا کر بولا۔ ”تم تو یوں کہہ رہی ہو جیسے تین سال کا نہیں
 تیس سال کا ہو گیا ہو۔ آخر تین سال کے بچے سے اور کیا توقع رکھی
 جاسکتی ہے۔؟“

”ارے یہ بچہ ہے۔؟ آپ اسے بچہ کہتے ہیں۔؟ اس نے تو بڑے
 بڑوں کے کان کاٹ دیئے ہیں۔ میں تو اس بچے سے عاجز آ گئی۔“
 شمیم نے حیرت سے دیدے پھاڑ کر بیوی کو دیکھا۔
 ”تم۔ تم۔ تم اچھے بچے سے عاجز آ گئیں۔؟“

”اور کیا۔؟ جب دیکھو تب شرارت۔ جب دیکھو تب شرارت۔
 آخر دنیا میں اور بھی تو بچے ہوتے ہیں۔“
 ”پھر تمہارا ارادہ کیا ہے آخر۔؟“

”میں اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دوں گی رسی سے۔“
 ”اچھا۔؟“ شمیم ہنس کر بولا۔ ”بہت بڑے بڑے ارادے باندھ
 رہی ہیں حضور۔“

”تھریا بچھر گئی۔
 ”پھر وہی ہنسی۔ آپ کی اس ہنسی نے ہی اسے شیرنا کر رکھ دیا ہے۔“
 ”میری ہنسی نے؟ میں جھٹکا کرتا ہوں۔؟“

”تھریا تیری سے ہاتھ چلا چلا کر لوٹنے لگی۔“ اس دن ڈاکٹر صاحب
 کی موٹیوں کو پکڑ کر کھینچ رہا تھا تو آپ ہنس رہے تھے کہ نہیں۔؟ پچھلے
 دن ابا جان کی داڑھی کو دیکھ کر بولنے لگا۔ نا نا میاں آپ کی داڑھی تو

باپ ساڑھے پانچ سو اور کس لئے کماتا ہے۔؟“
 ثریا نے حیرت اور غصے سے میاں کو دیکھا۔ ”ہائے تو آپ ساڑھے
 پانچ سو اسی لئے کماتے ہیں۔؟“

”ظاہر ہے ہر باپ اپنی اولاد کے لئے ہی کماتا ہے۔“
 ”ایسا باپ تو آج تک میری نظروں سے نہ گزرا۔“
 ”تو جانم یہ تو بتاؤ کہ آج تک تم نے کتنے باپ برت ڈالے ہیں؟“
 فقیم مشرات سے بولا۔

”آپ کو تو مذاق ہی سوچھتا ہے۔ قسم خدا کی آپ کے بیٹے کے
 یہ کارنامے اب مجھ سے برداشت نہ ہوں گے۔“
 ٹوٹی میاں اتنے میں باپ کی گود میں جا سوار ہوئے تھے۔ باپ ان
 سے ہنس ہنس کر بانیں بھٹکا رہے تھے۔ ثریا کی جان جل گئی۔
 ”دینا کے سارے شریر بچوں کو بگاڑنے کی ذمہ داری صرف باپوں
 کے سر جاتی ہے۔“

”ہونہ۔ اور جیسے مائیں تو بڑی سمجھدار مخلوق ہوتی ہیں نا۔؟“
 ”دینا کا نہیں کہتی ہوں، میں تو کم از کم آپ سے لاکھ درجہ اچھی
 ہوں۔ اگر میں فوج نہ دوں تو یہ بچہ نہ جلنے کیا کر دکھائے۔“
 ٹوٹی میاں نہ برینگا ہوں سے ماں کی طرف دیکھ جا رہے تھے۔
 جانے باپ نے انہیں شہو کا دیا یا خود ہی مدد معاشی سوچھی کہ ماں کو زبانی
 چمڑا بیٹھے۔ ثریا کے ضبط کی ساری طاقت جاتی رہی۔ شمیم کی گود
 سے ٹوٹی کو گھسیٹتی ہوئی بولی۔
 ”یہ ایسے تو مانے گا ہی نہیں۔“

اور اس نے ٹونی کو کھینچتے ہوئے لے جا کر کھیمے سے رسی کے ساتھ
باندھ دیا۔
نسیم کو ثریا کی پریشانی دیکھ کر منہ ہی آ رہی تھی، وہ سر جھٹکنا ہوا
منہ دھوئے چلا گیا۔
شام کو نسیم واپس ہوا تو دیکھا کہ ثریا کا منہ اسی طرح پھولا
ہوا ہے۔

”کیوں اب کیا ہو گیا۔؟“ وہ منہ سے کہہ لیا۔
”ہذا کیہ؟“ میں نے رسی سے باندھ کر چھڑ دیا۔ وہ جناب آخر
کس باپ کی اولاد ہیں؟ جانے کس طرح زور کا لگا کر رسی کھول ڈالی۔
اور سیدھے گھر سے باہر بھاگ گئے۔ ثریا غصے سے جھاڑ کے نیچے مری
ہوئی مرغی کی طرف اشارہ کر کے بولی۔ ”دیکھئے شکاری باپ کے شکار کا
صاحبزادے مرغی مار کر لائے ہیں۔ تین روپے ڈنڈ ہو گئے۔ اب کہیے نا
بڑا ذہین ہے۔“

”ارے باس۔ تین روپے کے لئے اتنی جھنجھٹ میں بھی سمجھا
شاید تین سو روپے برباد کر ڈالے۔“ وہ بس کو لمبا کرتے ہوئے بولے۔
باپ کے اس رویے سے ثریا کے تلووں میں لگی تو سر ہی میں جا کر کھجی۔
”میں تو باپ بیٹے کو دیکھ کر دنگ ہوں خداوند۔“
”کیوں؟ بہت غیر معمولی مخلوق ہیں کیا ہم دونوں؟“ باپ
منہ سے کہہ لے۔

ثریا بڑی سنجیدگی سے بولی۔
”کیوں جی۔ بچپن میں آپ بہت شرمیلے تھے کیا۔؟“

”یہ تو اسی جانبیں۔ ویسے کوئی خاص تو نہیں۔ بس اپنے ٹوٹی جیسی معمولی شرارتیں بوجہی دل بہلانے کو کر لیا کرتے تھے۔“

”ارے خدا۔ یہ شرارتیں معمولی ہیں۔“ ثریا سینے پر دو ہتھ مار کر بولی۔ ”گھبرانے کی بھی ضرورت نہیں۔“ شمیم ہنس کر بولا۔ ”آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔ ماشاء اللہ دوسرے صاحبزادے بھی دنیا میں آنے کیلئے بری طرح ہاتھ پاؤں چلا رہے ہیں۔“ وہ اس کے ہڑے سے پیٹ کو دیکھ کر ہنستے ہوئے بولا۔

”میں تو انہی سے بیزار ہوں۔“ وہ سچ سچ بیزاری سے بولی۔ شمیم سنجیدہ ہو گیا۔

”یہ تم کہہ رہی ہو ثریا۔ تم۔؟“

”جی ہاں میں۔ میں اپنی ثریا۔“

”یعنی تم ایک ماں ہو کر ایسا کہہ رہی ہو۔“

”جی ہاں، جی ہاں۔“ وہ طعن سے بولی۔

”اصل میں خدا نے تمہیں بن مانگے ہی اولاد دے کر اچھا نہیں کیا۔“

”تمہیں معلوم ہی نہیں لوگ اولاد کے لئے کیسے ترستے ہیں۔ اگر تمہیں بھی اتنی ریاضتوں اور عبادتوں کے بعد ایک بچہ ملتا تو قدر کرتی۔“

”اولاد کیا ہے۔ سبھی کو دیر سویر ہو جاتی ہے۔ خود میرے بیکے

میں ڈھیر سیر بچے تھے۔ ایسا کیا دنیا کے سوا بھی کو بچہ ہوا ہے۔؟“

”ارے تم کیسی ماں ہو۔؟ مائیں تو اولاد کی شرارتوں پر بھی یوں

خوش ہوتی ہیں۔ ہر آنے گئے سے تذکرہ کرتی ہیں کہ مجھ کو اس لئے ایسا کیا،

اس لئے ویسا کیا۔“

”میری اولاد نے تو بس مشرندہ کر دانا ہی سیکھا ہے۔ پر سوں ڈاکٹر صاحب کے ہاں گئے۔ پہلے تو حجاب نے چائے کی میز پر وہ ادھم مچایا کہ وہ بھی یہ سمجھ ہوں گے کہ اس کے ماں باپ نے کبھی اس کو چائے پلائی ہی نہ ہوگی۔ وہاں سے اٹھے تو ان کے بچوں میں جا کر گھس گئے اور ایک سرے سے بھی کی ٹیانی کر ڈالی۔ لڑکیوں کے کمرے میں جا کر گر ڈیا توڑ ڈالیں۔ کھلونے بکھیر ڈالے۔ رہی ہی کسے باغ میں جا کر پوری کر دی۔ سارے پھول توڑتاؤ کر چنیک دے۔ سارے گھر میں رونق ہی رونق بکھرا دی۔ میں نے ڈانٹ بتانی چاہی تو ڈاکٹر صاحب کی بیوی بولیں۔ ‘اے ہے بچے ایسا کرتے ہی ہیں۔ مگر وہ بھی جھجلائی ہوئی دیکھ رہی تھیں۔ یوں کہنے کو تو کہنا پڑتا ہی ہے۔‘

”آخر ان سب باتوں سے ہمارا مطلب کیا ہے۔؟“ شمیم الجھ کر بولا۔

”مطلب .؟ ہونہ، آپ تولیوں ہی دھونس دکھا رہے ہیں۔ جو کہتا ہے وہی جانتا ہے۔ ایسا ہی ہے۔ تو ذرا دن سبھر سنبھال کر بنا دیجیے۔“

نب کہوں کہ ہاں باپ ہیں۔“

یہ تو شمیم صاحب کی مردانگی کو کھلا چیلنج تھا۔ ڈٹ کر بولے۔

”اب استا گیا گزرا ابھی نہ سمجھ لو۔ ایک کے بعد ایک گیا رہ پے جن ڈالو اور سب کو بائیں ہاتھ سے سنبھال کر نہ تباؤں تو شمیم نہ کہنا۔“

”جو گرجتے ہیں وہ کبھی نہیں ہرستے۔“ ثریا تاؤ کھا کر بولی۔ ”جیے میں جھوٹ ہی تو کہتی رہتی ہوں بمشیں پر ذرا سیون کر لے کو تو بیٹھیے۔“

کبھی تلگے گی گتہ سی بحال کر سچینک دے ہے تو کبھی کپڑا ہی کھینچے۔
 کیا بحال جو ایک کپڑا ایک ہفتے میں سبھی پورا کر لوں۔“
 ”سینا، یہ نہ آتا ہوگا۔ ورنہ کون سگڑ ایک کپڑا ہفتے بھر تک
 لئے بیٹھی رہتی ہوگی۔“

”تھریا پاؤں بیچ کر بولی۔“ دیکھئے شمیم صاحب مجھے غصہ نہ دلائیے۔
 ”ار سبھی غصہ کون دلا رہا ہے۔؟ سیدھی سچی بات پر تم خود ہی غصے
 ہو جاؤ تو میرا کون قصور۔!“

”آپ کا مطلب ہے مجھے سینا نہیں آتا۔ پھر یہ کرتا جو آپ پہنے
 ہیں کس نے سیا ہے۔؟ یہ آپ کا لاڈلا جو نمبیس پہنے پھر رہا ہے۔ کس سچوٹ
 لئے سیا ہے۔؟“

بازار سے خیر بد کر بھی پہنا دیا اور یہ کہہ دو کہ میں نے سیا ہے تو
 میں کیا جانوں۔!“

”ہاں ہاں میں تو ایسی ہی چھوٹی ہوں نا۔ اور یہ حضور جو سوٹیڈ
 ڈاٹے سپر رہے ہیں تو کس نے آنکھیں سچوٹ سچوٹ کر بنا ہے۔؟“ رک
 دم تھریا نو کچھ یاد آیا۔ تیزی سے بولی۔ ”اور ننھے کے لئے کوئی تین ہفتوں
 سے موزے بنے مشدع کر رکھے ہیں۔ مگر آپ کا یہ جگہ گوشہ کچھ تو سوچنے
 دے کبھی تو ملی کے بلونگڑوں کی طرح گولوں کے پیچھے ایک کراون الجھا
 ڈالے اور کبھی سلاخیاں پھینک دے۔“

شمیم ذرا اکاؤٹ سے بولا۔ ”یہ ننھے کی فکر کیوں ہو رہی ہے حضور
 کہ۔؟ وہ سبھی تو آخر ٹوٹی کا بھائی ہوگا۔؟“
 ”نمبر باکے چہرے پر ذرا سی شرم آئی، مگر وہ دوسرے ہی لمحے

ڈھٹائی سے بولی۔

"تو بس اب معاملہ ختم ہے۔ اب آگے کون اس جھنجھٹ میں پڑے۔"

"کیوں۔؟ معاملہ ختم کیسے ہے۔؟" شمیم حیرت سے بولا۔

"بس میں کوئی دوا کھالوں گی کہ بچے ہی نہ ہوں۔"

شمیم کو غصہ آگیا۔ "دیکھو ثریا بی بی تم میرے بچوں کو دنیا میں لانے

سے منع نہیں کر سکتیں۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ باپ تو انپاکام کر کے چلتے بنے اور تم

ٹوٹے ماں کی جان پر۔ بھلا بچے پیدا ہونے میں آپ کا کیا جاتا ہے۔؟"

"اور آپ کا کیا جاتا ہے جناب۔؟"

"پیدا کرنا پڑے تو پتہ چلے۔"

"اور کیا ہم اتنی مشکل سے پیدا نہیں کرتے تو کیا تم کرتی ہو۔؟"

شمیم ہنس کر بولا۔

"ہائے اللہ۔!" ثریا آنکھیں سچاڑ کر بولی۔ "آپ بھلا کیا کرتے

ہیں۔؟ خواہ مخواہ منہ کو آ رہے ہیں۔"

"آ تو نہیں رہا ہوں، اگر تم چاہو تو غنہارے منہ تک آ سکتا ہوں۔"

شمیم معنی خیز ہنسی ہنس دیا۔

ثریا الجھ کر بولی۔ "یہی اثرات تو اولاد میں سمجھی ہیں۔"

"ارے شکر کروڈیر۔ اگر دنیا کی اور ماؤں کو ایسی اولاد ہوتو

وہ شکر کے مارے سجدے سے سر نہ اٹھائیں۔"

"وہ پاگل عورتیں ہوتی ہوں گی۔ اپنی تو جان آدھی ہو گئی۔ میں نے

تو طے کیا ہے کہ سیزن شروع ہونے سے کاونٹ میں داخل کر دینگی۔"

ہائیں۔ " شمیم صاحب حیرت سے بولے، " ابھی سے؟ ارے
ابھی تو وہ اتنا سا ہے۔ ابھی سے پڑھائی کا بار اس کے سر۔؟ "
" ہاں ہاں اتنا سا ہے، مگر شرارتیں تو دیکھیے۔ زمین آسمان ایک
کر رکھا ہے۔ "

" آخر تم اس سے اتنی بیزار کیوں ہو۔؟ "
شریانے میاں کو گھورا۔ " جیسے مجھے دیوانے کتے نے کاٹا ہے نا جو
جان بوجھ کر خواہ مخواہ اس کے پیچھے پڑ گئی ہوں۔ "
" جتنی میری تو سمجھ میں نہیں آتا۔ آخر نوکر کیا کرتا ہے۔؟ "
" جی، ہاں ایسا ہی آپ کا لاڈلا نوکر سے سنبھلے والا چھپرا۔ اسے
تو جوتی کے بدل نہیں گنتا۔ وہ وہ گھولنے اس کے سر اور پیچھے پرکتے
ہیں کہ جان جوان آدمی اور بلبلا ہی جائے۔ پس تو آپ کے لاڈلے تمہیں
سال کے۔ مگر چھ سال سے کم کے نظر آتے ہیں۔ نہ حرکتیں ہی ایسی ہیں کہ ننھے
گنائے جاسکیں۔ " بڑی بے بسی سے وہ بولی۔
" جانے کس گناہ کی پاداش میں اللہ نے ایسا بچہ میرے پیٹ
میں دے دیا۔ "

اب تو شمیم صاحب کے صبر کا پیمانہ چل چل چھلک پڑا۔
" اچھا تو یہ ٹوٹی آپ کے گناہوں کی پاداش ہے۔ "
" بالکل۔ "

" تو سپر سپنیک کیوں نہیں دینیں اٹھائے۔؟ "
" وہی تو سارا جبرگڑا ہے کہ پیٹ کی اولاد کو کوئی پینکے تو کیے۔؟ "
" تو کیا مچ مچ ہی اس سے بیزار ہو۔؟ "

”تو آپ کے خیال میں میں اب تک مذاق فرما رہی تھی۔“
 ”اچھا یہ بات ہے تو اپنے بچے کو ہم سنبھال لیں گے۔“
 ”آپ۔!“ ”ٹریا سنس کرو لولی۔“ ”ارے آپ۔؟“
 ”کیوں اس میں ہنسی کی کیا بات ہے۔؟ کیا باپ بچوں کو سنبھال
 نہیں سکتے۔؟“

”کیوں نہیں صاحب، کیوں نہیں۔ ضرور سنبھال سکتے ہیں۔
 ضرور سنبھال سکتے ہیں۔“ ”ٹریا لعنہ سے بول رہی تھی اور سننی بھی جارہی
 تھی۔“

”وہ ڈاکٹر صاحب، رات کو بچے پشیاب کر دیتا ہے تو اٹھ کر
 پوٹر ابدل دیجے ہیں۔ اور رحمت علی خود میری آنکھوں کے سامنے انہی
 بیٹی کو کوڈر پر بٹھا رہے تھے۔ اور رزاق صاحب ایک دن قتل سے
 منی کو دودھ پلاتے بیٹھے تھے۔ میں کون ایسا گیا گزرا ہوں۔“
 ”مگر جناب آپ رہے دن بھر آفس میں، اور آفس والے کیسے یہ
 کام کر سکتے ہیں۔؟“

”اجی کر لے والے دنیا کے کام کر سکتے ہیں، بس ہمت چاہیے۔“
 ”تو آپ ٹوٹی کو آفس لے جایا کریں گے۔؟“ وہ حیرت سے بولی۔
 ”ظاہر ہے۔“

”اور کام کون کرے گا آپ کا۔؟“
 ”ہم ہی کریں گے اور ہم سنبھالیں گے۔ آپ نے کیا بالکل ہی بدھو
 سمجھ رکھا ہے۔“
 ”ٹریا خوشی خوشی بولی۔“ ”پھر تو سچ مجھے بڑا سکون مل جائیگا۔“

میں دن بھر چین سے کام کیا کروں گی۔ اپنی سہیلیوں کے ہاں جایا کرونگی۔
 کپڑے سنیا، سوئیٹر بننا، اورے بھی کچھ سکون سے کر سکوں گی۔“
 شمیم صاحبہ جیٹ سے بولے۔ ”اور وہ یاد نہیں آئے گا۔“
 ”ارے یاد آنے کی کون بات ہے۔ شام کو تو آ ہی جایا کر گانا۔“
 ”اور جو کبھی وہ نہیں یاد کرے تو۔“ وہ ذرا پریشانی سے بولے۔
 ”اونہ، وہ بے ایمان باپ کی اولاد۔ مجھ سے ایسی کون لگی
 لیٹی رہتی ہے کہ میری کمی محسوس کرے۔؟“

دوسرے دن آفس چلے کا وقت آیا تو شمیم صاحبہ نے خود
 اپنے ہاتھوں ٹوٹی بیٹے کو کپڑے بدلوائے۔ شتر موس میں دن سہرے کیلئے
 دودھ رکھا۔ بسکٹ کا ڈبہ، چاکلیٹ، سارا الم غلم پلاسٹک کے بیگ
 میں بھر لیا۔ موٹر سائیکل کے پیچھے ایک گدی رکھ لی گئی کہ ٹوٹی میاں
 آرام سے بیٹھ سکیں۔

”اچھا چلو بیٹے۔“ باپ نے پکارا، ”مئی کو ٹاٹا کر لو۔“
 ”ٹاٹا۔“ وہ اپنی باریک اور شرمیلے آواز سے چلائے۔ ”بٹیا
 مئی کو یاد تو نہیں کرو گے۔؟“ انہوں نے لاڈ سے پوچھا۔
 جواباً ٹوٹی میاں نے سامنے کھڑی مئی کو پورسی کی پورسی زبان
 چڑادی جیسے ”اونہ، مئی میں کیا دھرا ہے کہ انہیں یاد کیا جائے۔“
 ثریا کا مزاج عاتار ہا۔ ”دیکھا، دیکھا۔ ان گنوں کے صاحبزادے
 ہیں۔ بھلا انہی ماں کو کوئی زبان چڑایا کرتا ہے۔؟“
 باپ کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر جب وہ جانے لگے تو تیز بھاگتی
 ہوئی موٹر سائیکل پہ بیٹھے بیٹھے مڑ کر انہوں نے قصداً ماں کو ادراک

بارزبان چڑا دی۔
 "ای۔ ای۔ ای۔" "شریائے بھی جل کر ساری کی ساری بان
 نکال دی۔"

شام کو شمیم صاحب واپس آئے تو ٹونی صاحب پوچھتے ہوئے
 پہلے کے پہلے ماں کے کمرے میں گھس آئے۔
 "پاپائے تو ہمیں مٹھائی بھی دی۔ ہاں ہاں۔" اور وہ مارے
 اترا ہٹ سے راک اینڈ رول کرنے لگے۔

شریائے ذرا جھلا کر میاں کی طرف دیکھا۔ "کیوں جی۔ اس نے
 وہاں ستا یا نہیں۔؟"

"ستا نا کا ہے کو۔؟ تم کو دراصل بچہ پالنا نہیں آتا۔ خواہ مخواہ
 اس کے پیچھے پڑی رہتی ہو۔ وہ تو اتنی شرافت سے بیٹھا کہ پوچھو نہیں
 سارے کلمہ کون نے اسے ہاتھوں ہاتھ کر لیا۔"
 "ای لے نا کہ بوس کا بچہ تھا۔ در نہ کون ایسے شریہ بچے کو نہ

لگتا ہے۔؟"
 "ارے قسم سے یہ بات بالکل نہیں سچی۔ وہ خود ایسا پیارا ہے۔
 حرکتیں اتنی پیاری ہیں کہ سب دل چموڑ بیٹھے۔ اور ہمارے کاظم صاحب
 نوے بار بار یہی جبرت کر رہے تھے کہ ہائیں کس قدر کرتا ہے۔ ورنہ یہ
 سال کے بچے تو ایک لفظ بھی نہیں بول سکتے۔"
 ان اکتا کر بیٹے سے مخاطب ہو گئی۔ "کیوں پیارے دن کیسے

گزارا۔؟"
 ٹونی صاحب لاکھ گئے گزرے تھے، جھوٹ بولنے کی عادت نہ تھی۔

دن سبھ کی کاگز اری سانے پر تل گئے۔

”میں بہنے اٹکل کی ناک پکڑ کر کھینچی، پھر ایک دو انٹ سپور ڈالی۔ وہ موٹے کا جم صاحب کی کاہنی سپاڑ کر ٹوکری میں پھینک دی اور ان کو تپ بھی نہ چلا۔“

ثریا نے فحتمندی سے میاں کی طرف دیکھا۔ ”کیوں جی۔؟ آپ تو کہتے تھے یہ چین سے رہا۔“

”ارے بچہ ہے تو کیا اتنی بھی دھم دھوم نہ کرے۔ مگر تم جتنا، پراسگینڈہ کرتی تمہیں اتنا دھم تو ہرگز منہیں کیا۔“ اک دم وہ ہنس کر بولے۔

”یہ بتائیے آپ کا دن کیسے گزرا۔؟“

”میرا۔؟ ارے میرا کیا پوچھتے ہیں آپ۔ سب سے پہلے تو میں نے نہنے کے چار فراک سی ڈالے۔ وہ ادھورے سوزے پورے کئے۔ پھر ڈھیر سبھ کر پڑے دھوئے اور پھر تین دن سے جو جام منگوار کھے تھے۔ ان کی جلی تیار کر ڈالی۔“

”تویوں کہئے خوب اطمینان سے دن گزرا آپ کا۔؟“

”خوب۔ اتنے دن بعد کھوار پنے کا سا زمانہ آج سپر لوٹ آیا تھا کہ انہی مرنے سے جو چاہو کرو۔ کوئی ہاتھ ڈالنے والا منہیں۔“

”اور جو بے چارہ ڈوٹی ہوتا تو کیا بگاڑ دیتا تھا را۔؟“

”ارے ظاہر ہے ساری دنیا تہہ و بالا کر ڈالتا۔ سب کاموں کو ڈالئے چولہے ہیں، جلی کو ہی لیجئے۔ سارے جام حفرت پار کر ڈالتے کچھ کھاتے، کچھ پینکتے۔ اور رہے ہے محلے کے بچوں میں میری چوری ہے

بانٹ آتے۔ لڑنے کو بھی ایسے ہی چوکس اور دوستی نبھانے کو بھی ایسے ہی تیار۔“

”مگر اب تو ہمیں سکون مل گیا نا؟“ وہ طعن سے بولے۔
 ”مجھے تو ظاہر ہے مل گیا۔ اب اپنا بچاؤ کیجئے۔“ وہ ہنسکر بولی۔
 ”ٹونی کو گود میں اٹھا کر بڑے لٹھے سے بولے۔“ ہمارا بیٹا ہم پر
 بھاری نہیں ہے۔ بچہ تو محبت کا بھوکا ہوتا ہے۔ دیکھنا نہیں بھول
 کے بھی یاد نہیں کریں گا۔“

دوسرے دن شمیم آفس سے ٹوٹا تو شریانے ہنس ہنس کر ساری
 رپورٹ سنا ڈالی۔

”آج میں ڈاکٹر صاحب کے ہاں گئی تھی۔“
 ”کیا کیا وہاں جا کے؟“ وہ لاپرواہی سے بولے۔
 ”ایسے ہی باتیں کرتے رہے۔ پھر بچوں کے کچھ کپڑے بیئے۔ کچھ
 دیر کیرم کھیلا۔“

”ساری واہیات باتیں۔“
 ”ہونہ۔ مردوں کو تو عورتوں کی ساری حرکتیں واہیات ہی
 نظر آتی ہیں۔ بھلا اور کیا کیا کرتے ہیں۔“
 ”اور انہوں نے پوچھا نہیں ٹونی کیوں نہ آیا۔“

”ارے دادا، پوچھتیں کیسے نہ پہلے تو جانتے ہی یہ سوال کیا۔
 کہ ٹونی صاحب کیوں تشریف نہیں لائے؟“ جب میں نے کہا کہ
 ان کی دیکھ ریکھ کی ذمہ داری ان کے باپ نے سنبھال لی ہے تو خوب
 ہی خوش ہوئیں۔ بگدہ وہ قواب یہ ارادہ کر رہی ہیں کہ بیلو کوڈ سنسری

بھجوا دیا کریں۔ کیونکہ ان کے بچوں میں سب سے زیادہ نابکار یہ
بلوہی ہے۔

”ہاں ہاں۔“ وہ جوتے کے بند کھولتے کھولتے لاپرواہی سے
ہنس کر بولے۔ ”اب ساری مائیں یہی ملے کر لیں کہ میاؤں کے ساتھ
بچوں کو بھی آفس بھیج دیا کریں۔“

تیسرے دن شیم نے آتے ہی پوچھا۔ ”آج آپ کیا کرتی رہیں
دن بھر۔؟“

”آج تو کوئی خاص کام تھا ہی نہیں۔ یونہی بے سارسی پڑتی تھی۔
تو آپ کے لئے ایک سویٹر کا نیا ڈیزائن شروع کر لیا۔“

”کیوں۔؟“ میاں طعن سے بولے۔ ”اب اتنی جلد بے کاری
کی نوبت بھی آگئی۔ پہلے تو یہ عالم تھا کہ سر کھجانے تک کی فرصت نہ ملتی
تھی۔“

”اب آدھا بار آپ نے سنبھال لیا ہے نا۔ اس لئے۔“ وہ ہنس کر
بولی۔

”اچھا۔“ وہ اسی لہجہ میں بولے۔ ”اب سویٹر بھی ختم ہو جائیگا۔
تب کیا کر دوں گی۔؟“

”تب کیا کروں گی۔؟“ وہ جبرت سے بولی۔ ”ارے کچھ کوئی
پوچھنے جیسی بات ہوئی۔ گھر میں زندگی کے ہزاروں بکھیرے لگے رہتے
ہیں۔ کوئی نہ کوئی کام نکل ہی آتا ہے۔“

بیکاری میں اور تو کوئی کام تھا نہ ہیں، دن دن بھر بننا ہی بننا
تھا۔ سویٹر کوئی چار ہی دن میں پورا ہو گیا۔ ساتویں دن میاں آفس

سے لوٹے تو ثریا بولی۔

”ہاں جی۔۔۔ دن بھر میں کوئی چار چھ مرتبہ تو اس کا منہ دھلانا پڑتا تھا۔ اب وہاں کون دھلانا ہو گا۔؟“

”چپڑا سی ہے نا۔ اس پر تو بڑے مزے سے ہل گیا ہے۔ بس یہ سمجھو دن بھر اسی کے پاس رہتا ہے۔ مجھ سے تو کوئی سروکار ہی نہیں۔“

”ہائے جی۔ تو آپ اسی کے بھروسے بچہ چھوڑ دیتے ہیں۔؟“ شمیم نے حیرت سے ثریا کو دیکھا۔

”تو کیا ہوا۔؟ کھا تو نہ لے گا بچے کو۔ آخر وہ بھی بال بچوں والا

آدمی ہے۔“

ثریا کچھ نہ بولی۔ ٹوٹی آنکھوں میں کھڑا گنبد اچھال رہا تھا۔ گنبد اچھلی نوادہ گنبد کے پیچھے پکسا ہوا آیا۔ گنبد سیدھا ثریا کے قدموں میں جا رکی۔ بجائے اس کے کہ گنبد لینے آتا وہیں سے ماں کو منہ چڑا کر بھاگ گیا۔ باپ فتح مندی سے بولے۔

”دیکھا اب تمہارے پاس تو پھٹکت نک نہیں۔“

گیارہویں دن شمیم آفس سے واپس تو چھپے گدی پر ٹوٹی نہ تھا۔ ثریا اس وقت پورچ میں آرام کرسی پر لیٹی بے دلی سے کوئی کتاب کھینچ رہی تھی۔ موٹر سائیکل کی آواز سنکر سر اٹھایا تو دیکھا کہ گدی خالی ہے۔ بے تابانی سے بولی۔

”ارے ٹوٹی کو کہاں چھوڑ آئے۔؟“

سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے وہ لاپرواہی سے بولے ”کاظم صاحب کے گھر۔“

"وہ کیوں؟" وہ تیزی سے بولی۔

"ان کے بڑے بیٹے کی سالگرہ ہے آج۔"

"تو اکیلا ہی چھوڑ دیا؟"

"آخر ان کے بھی بچے ہیں۔ کیا سچینک دیں گے اٹھاکہ؟"

"تو کم از کم کریم کو ہی بھیج دیجئے۔"

"مگر تمہیں اتنی کلپ کیوں ہو رہی ہے؟ اچھا ہے نا وہاں کھیل

رہا ہوگا۔ یہاں تو چیخ چیخ کر اودھم مچا دیتا ہے۔ سر درد کرنے لگتا ہے۔

کم نجات۔" اور انہوں نے چورنگا ہوں سے بیوی کو دیکھا۔ نثر یا خاتون
رہ گئی۔

دوسرے دن ٹونی میاں آئے تو انہیں گھر سے گئے تقریباً دو دن

پہلے ہو چکے تھے۔ میاں روزانہ دو چار جوڑے کپڑوں کے لیے

جاتے تھے مگر اس دن ان کے کپڑے بھی ذرا نیلے تھے، کیونکہ کاظم صا

گئے ہاں سے والپی پر ان کے کپڑے باپ کو لے جانے یاد ہی نہ رہے۔

اچھلے پھاندتے وہ موٹر سائیکل سے اترے۔ اور بیدھے اپنے کمرے

کو دوڑ گئے۔

نثر یا کی صورت سے جھلاہٹا رہی تھی۔

"کیا بات ہے تم کھوئی کھوئی سی نظر آ رہی ہو؟"

"ہیں؟ میں جھلا کیوں کھونے لگی؟" وہ جھلا کر بولی۔ "بھلی

خا صی ہوں۔"

"کم از کم چہرے سے تو یہی ظاہر ہو رہا ہے۔"

وہ انہیں گھور کر چپ رہ گئی۔

”آج دن سبھر کیا کیا کیا؟“ وہ اسے سننے کے سے انداز سے

بولے۔

”جھک ماری۔!“ وہ تیزی سے بولی۔

”سبھلا جھک کیسے مارا کرتے ہیں؟ میں نے تو آج تک نہیں ماری۔“

تھوڑی دیر خاموش رہ کر بولی۔

”میں آج ڈاکر کے ہاں گئی تھی۔“

”پھر اس نے کیا کہا۔؟“

”کہتی کیا۔ یہی کہ اس مادے ختم تک نہ چکی ہو جائے گی۔“

”مبارک ہو۔“ شمیم صاحبہ نے کہہ کر بولے۔

”یہ مبارک سلامت کا کیا نک ہے؟ کیا پہلا بچہ ہو رہا ہے؟“

وہ حیران ہو گئی۔

دھیرے سے شمیم صاحبہ بولے۔

”ڈاکر نے سے یہ بھی پوچھ لیا ہوتا کہ میرے مزاج میں یہ تیزی

کیوں آتی جا رہی ہے۔“

بالکل توقع کے خلاف وہ بولی۔ ”پوچھا تھا!“

”ہائیں۔؟ پوچھا تھا۔؟“ وہ اچھٹ کر بولے۔

”ہاں۔!“

”پھر اس نے کیا کہا۔؟“

”کہہ رہی تھی عورت کو حمل کے زمانے میں خوش رہنا چاہیے۔“

”لگتا ہے تمہیں کوئی دکھ ہے جس کی وجہ سے نہ جلی جلی رہتی ہو۔“

”پھر تم کیا بولیں۔؟“

ثریا سچرا لکھ گئی۔

”میں کیا بولتی۔ میں نے کہہ دیا مجھے کوئی دکھ نہیں ہے۔ ابی
خواہ مخواہ ہی ٹانگ، انجکشن گھونپ کر پیسے وصول کرنا تو ان بوڈیا
کا کام ہی سمجھو۔“

اگلے دن شمیم صاحبہ نے بیٹے کو ہنلا دھلا کر کپڑے بدلوائے
اور جوتے کوٹ پینا کر مزے سے اٹھا چلے۔ باسکٹ میں کپڑے ڈالنے
اور کھانے کا الم تلم سچرا سنا۔ وہ اٹھا کر انہوں نے موٹر۔ انیکل
پر رکھا۔ ٹونی کو جھپایا۔ پیرارا اور موٹر سائیکل گھر گھر کوئی
چلنے ہی والی تھی کہ پورچ میں سے ثریا پلکی ہوئی آئی۔ جلد سے ٹرھیا
پھلانگ کر وہ موٹر سائیکل کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ بڑے سے پیٹ کا
دزن سنبھالنے سے وہ ہانستی حاسری تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو
چمک رہے تھے۔

”کیا ہے؟“ شمیم صاحبہ حیرت سے بولے۔

وہ ہلک اسوی۔

”ہائے آپ کیسے شوہر ہیں کہ اپنی بیوی کے دل کی بات سچی نہیں
جان سکتے۔“

شمیم صاحبہ اسی طرح دیکھ رہے تھے کہ وہ چھپے ٹونی
کو اٹھا کر اپنی گود میں بھرتی ہوئی بولی۔
”کبھی آپ ایک ماں کا دل لے کر تو دیکھئے کہ سونا سونا آنگن
کس قدر برا معلوم ہوتا ہے۔“

زہر عشق

باہ نور نور زور سے شہنایاں بج رہی ہیں۔ بارش کے بہیر
چھریں بلائے ہی آگئے ہیں اور ڈنڈیاں ٹھونک رہے ہیں۔ میرے
آنکھوں میں ہرے ہرے پتوں اور رنگ۔ ہر رنگے پہلوں کی سجاوٹ اور
مہلکار ہے۔ رات بھر مجھے کی غورتوں نے رت جگا کیا۔ جاگ جاگ کر
نہن کیا۔ کچوان پکائے، فوشے میاں لے لئے نہاری تیار کی۔ شادی
کے ہنگامے اپنے شباب پر ہیں۔

اب سے ٹھیک بارہ گھنٹے بعد رات عقد ہو جائے گا۔ وہ دہلیا
سبکرائے گا۔ سپدلوں اور مہروں سے اس کا منہ چھپا ہوگا۔ رشتوں
کے بھائی جھنجھکے اس سے گھوڑے کے آگے ڈنڈا اڑائیں گے۔ جب
تک وہ دس پارچے روپے نیگا نہ دے اسے گھر میں داخل ہونے کی
اجازت نہیں ملے گی۔ تمام رات سے اتر کر وہ تپ سبائے چبوترے
پر بیٹھ جائے گا اور پیر دندنا۔ قدموں سے میرے پاس ماموں،
چچا، پند بھائی آئیں گے۔

”بول بولی۔ تیرے اتنے مہر کے عوض فلاں فلاں دہلیا
پند ہے۔ بول دے۔ بیٹی، بول دے۔“

میں نے لے کیا ہے فضول شربانے اور رونے دھونے کی بجائے
صاف صاف کہہ دوں گی۔

”نہیں۔ مجھے پشادی پسند نہیں ہے۔“
اس کے بعد جو گڑ بڑ ہوگی۔ جو ہنگامے کھڑے ہوں گے اس
سے میں بخوبی واقف ہوں۔ مگر میرے دل میں ڈر نہیں ہے۔ ایسی
بے جیالہ کی کوجہد میں کون قبولے گا۔ مجھے اس کا بھی خوف نہیں ہے۔
ہاں میں نے ہر ہر طرح سوچ لیا ہے۔ میں دہی کروں گی۔ حویرے دل
نے مجھے سمجھایا ہے۔

عقد کے لمحے قریب سے قریب تر آ رہے ہیں۔ باہر دیکھیں کھڑ
کھڑا رہی ہیں۔ ہاگوست اور بخنی کی خوشبو سارے میں اڑ رہی ہے۔

”اے اے سور کے جنے! سب کباب ہی میں سنت بھسم کرے۔
تشوڑے گوشت کی بخنی بھی بنا۔“

داراب خان نے گوشت کے ٹبرے ٹبرے پارچے سبک پر
چڑھائے، ان پر نمک چھڑکا اور دیکھتے انکاروں میں گھ بیڑ دیا۔
نیم کے درخت سے پر۔۔۔ گلاب خان کی چیخ بھری آواز نال
دی تو اس نے پلٹ کر دیکھا۔

”کیا سپر مایا۔؟“

”کان پٹ کا ہے سے ہو گئے۔؟“
دارے نے گندے ساندے ہاتھوں سے آنکھیں پونچھتے ہوئے

”اے حرام سکا مال کھا کھا کے یوں چربی نہ چڑھا۔ سائے جناجا
 اتنا بیہاری ہو جائے گا کہ چار چھوڑ آٹھ آدمیوں سے بھی نہ اٹھے گا۔“
 ”میں وصیت کر کے مردوں کا نہ میرا جنازہ صرف دارا ہی
 اٹھائے۔ سائے خاں اتنا کھلایا اور کس دن کام آئے گا۔؟“
 ”کھلائے کو کیا چاہوں۔ ہر گورے کسان کی لونڈیا پلانے نہ پ
 جانے۔“

”اے حرامی اور کتنی لونڈیاں پیٹے گا۔؟ اے تو تیری ہڈیوں میں
 بھی دم نہیں رہا اور پیشہ کی ہوس باقی ہے۔“
 دارا نے آنکھیں بند کر کے جھومتے ہوئے کہا۔ ”ارے بھوپو
 کھان تو نہ مٹا نہیں۔“

نرسا پر چور نہیں، ہے یہ وہ آٹا، کالب
 کہ دنگے نہ لگے، اور بھجائے نہ بنے
 کلاربا خان ہا کر کے زور سے ہنس پڑا۔ ”سائے بچھے تو دن
 بھرے میں چار چھ مرتبہ“ ایک ہوتا ہے۔ ایک آدھ دن کھوٹا
 پیلہ ہو جائے گی تب مزہ آئے گا۔“
 ”یاروں کا ہاتھ کھلا ہے تب، تک دارا نے کو کیا پھکرے ہوا
 تب۔ ایسے سردار کو کاٹم رکھے۔“

دارا نے غلط کہا کہ ”یاروں کا ہاتھ کھلا ہے۔“ اصل میں ہم
 گاؤں والے غریب لوگ۔ ہم لوگوں کا ہاتھ تنگ ہے۔ اور اس تنگی
 کا براہ راست تعلق سٹالے کے ہاتھ سے ہے۔ ابھی ابھی کی تو بات ہے
 کہ سٹالے خاں محلے بھرے میں پٹنگ اٹاتا، پیر پھرتا اور نیوں تلے

کہ کڑے لگانا پھرتا تھا۔ باپ نے مار مار کے بھر کسان کا دیا مگر اس کی ہڈی، سیدھی نہ ہوئی۔ مندر کا بیل نہ سہیڑتا تھا۔ کام کا نہ دھام کا ذمہ داری کا اس انسان میں مجھداری پیدا کر دیتا ہے۔

گلاب خان کا باپ مرا تو یہ آپ اپی رستوں پر آگیا۔ سنتے تھے بڑھائیں چار ہزار روپیہ نقد چھوڑ کر مرا ہے۔ آگے پیچھے کوئی نہ سفا، لے دے کے گلابے ہی سارے کا مالک بنا۔ ہمیشہ کی طرح ان دنوں بھی گاؤں والوں پر غلسی چھائی تھی۔ ہالے رام کو نہ چلا کہ گلابے کے پاس جمع ہے۔ ہاتھ پاؤں جوڑتا اس کی چوکھٹ پر جا کر اہوا۔ اللہ ہی جلنے تو جلنے کہ اس وقت تک گلابے نے اپنی زندگی اور کاروبار کے بارے میں کیا سوچا ہوگا۔ مگر ہالے بھیا اس کی چوکھٹ پر کیا تو اس کے سیاہ چہرے پر سرخ جھلک مورتی ماٹھی۔ خاں بننے میں سے بولا۔

”منہ اٹھائے چلے آ رہے ہو، ہے کچھ گروہ میں بھی۔“ ہالے

بھیا جبریت سے بولا۔

”میں منہ مارا طلب نہیں سمجھا جو دھڑی۔“
 ”مطلب سمجھنے کو اور کیا دو چار ٹھکڑے لگتے ہیں۔؟ اے کوئی زور جھک رہا ہوگا۔ تو رکھ جا اور رقم لے جا۔ ورنہ حائر بنیدار کے گھر۔“
 ہالے بھیا آگے ہی نہ بنیدار سے دھنکا دیا جا چکا تھا۔ اور تو کچھ تنہا نہیں۔ لچھو سجا بھی جسے کالوں کی انتہاں تھیں، وہی رکھ کر ڈیرہ سو روپے نہ آیا۔

شکر رے کے پاس کچھ تھا نہیں۔ گواگوانے پر بھاری سود سے دو سو لیا یا۔ اور دن ہی دن میں گلاب خان اچھا خاصا ہوکار

بن گیا۔

اپنے اپنے مقدر کی بات ہے۔ وہی بارہ گھنٹوں کی رات ایک بھوکے پر کیے گزرتی ہے۔ یہ بارہ گھنٹے بارہ راتیں بن کر گزرتے ہیں۔ اور تن بھروں کے یہی بارہ گھنٹے عیش و کوش میں بارہ منٹ بن کر اٹھ جاتے ہیں۔

وہی ماہ و سال ہمارے بھی سروں پر تنے ہوئے تھے جو کلا خان کے۔ مگر دنوں ہی دنوں میں وہ کیا سے کیا ہو گیا۔ اب تو اس کے سیاہ بالوں کے چمک دار تیل سے چرٹے پٹے کانوں پر جھک آئے تھے۔ ریشمی خلعے دار تہبند۔ پیلی ریشم کا کرتا جس میں سونے کے چار چار من لگے ہوتے۔ ہاتھ میں ریشم کی دستی۔ اونچی ناک کا چڑھاواں جوتا۔ کانوں میں حطر کے پھیرے۔ مویں میں اتنی بڑی بڑی کہکشاؤں کی بوڑوں کو چھو لیں۔ ان میں اکڑے اکڑے بل پڑے ہوئے۔ اور سیدھے ہاتھ میں کلمے کی انگلی ہیں، پانہ کی یہ بڑی سی اٹوٹھی۔ کہتا تھا۔ ”میں نے میرا داتا کے ہاں جا کر ان کے نام پر چڑھائی تھی۔“

اللہ پدید دیتا ہے تو اس کے خرچ کرنے کے ڈھنگ بھی نہ ہارتا ہے۔ چوری چھپے نہیں، علی الاعلان چار لوگوں کے سامنے بیٹھ کر جوئے بازی ہوتی۔ ہارے تو کیا، اور جیت تو کیا۔ ہر حال اپنی ہی چاندی سیٹی۔ بادا کے پاس ہر رات بیٹھ جاتا اور پورے گاؤں کی خبریں سنائی جاتیں۔ بعض لوگوں کا کہنا تو یہ تھا کہ کچھ پینے پلانے کا دھندا بھی شروع کر رکھا ہے۔ اور راہ چلتی لڑکیوں کو آتے جاتے چھیڑتا رہتا ہے۔ جھوٹے سچے تو اوپر والا ہی جانتے۔ مگر اس کی شرارت کے قصے دو چار بار سہمے سننے باوا جب مجھ اور بوا کو سبق پڑھایا کرتے تھے تو ایک بار انہوں نے

نے ایک شعر سنایا تھا۔ اور اس کا مطلب بتایا تھا۔ اتنے دنوں کی بات
ٹھیک سے کچھ یاد نہیں رہی، مگر مطلب کچھ کچھ یوں سا تھا کہ ”پسینہ خدا
تو نہیں۔ ہے۔ مگر سچ بھی خدا ہے کہ ساری حاجتیں پوری کرتا ہے اور
عجب ’ڈھانکتا ہے۔“

تو میں اکثر سوچتی ہوں کہ کم از کم گلاب خاں کے ساتھ تو یہی کچھ
ہوا۔ پسینہ کیا کم بخت کے ہاتھ میں آیا۔ کہ خدا رسول کو۔ دوسرے کی
عزت و بخت کو۔ سب کو بھول گیا۔ یاد آتے۔

”حرامی پلے کے دل میں رحم اور شرافت کا تو نام نہیں۔ شیر کا کلیجہ
کھایا ہوگا۔“

مجھے یاد ہے۔ مجھے کیا سمجھی کہ یاد ہوگا کہ چند و چا چاکے ساتھ اس
نے کیا دھاندلی کی۔ بے چاروں کا ایک ہی کھیت تھا۔ جس کو جوتا اتنا
ہی نہ دے رہی تھا جتنا کہ انسان کے لئے کھانا ضروری ہے۔
وہ ہوا یوں تھا۔ کہ زبیدار کا قرضہ بہت چڑھ گیا۔ سر سے پاؤں
تک لد گئے۔ اس نے اس سال تک کی مہلت دی تھی کہ قرضہ ادا
کر دیں ورنہ کھیت کے ساتھ ساتھ میل کی جوڑی، گھر، اور گھر کے بزنس
باسن، سبھی کچھ اٹھا کر لے جائیگا۔ اور اب کے سے چا چاکو اب دیکھی
کہ فصل خوب بکے گی۔ انہوں نے کسی صورت رد وھو کر، ہاتھ پاؤں
جوڑ کر گلاب خاں سے دوسروں سے بچے نکالے۔

ادھر چا چاکو گھر پہنچے بھی نہ ہوں گے کہ ادھر سے گلاب خاں کے
لگے دوڑ گئے۔

آپ نیا اور بے پردہ دھند، اس نے یہ شروع کیا تھا کہ بوگیاں

گھر چوریاں کروادیتا۔ اس طرح لوگ جھک ہار کر پھر سے فرض لینے اسی کے در پر آتے، اور یوں دگنا سودا سے حاصل ہوتا۔ بادا کہتے۔ "مولوی صاحب بیچ ہی کہتے ہیں کہ گلاب خان کے لئے تو اللہ یہاں کو خاص طور سے ایک الگ دوزخ بنانی پڑے گی، جس میں وہ اکیلا ہی جلایا جائیگا۔"

مگر چند و حیا و دبا رہا اس کے پاس سے سود پر روپیہ حاصل کرنے کے لئے نہیں آئے۔ وہ راتوں رات جان بحق ہوئے تھے۔

پیپہ بادشاہ ہے۔ بادشاہ کے سامنے کون منہ کھولتا ہے۔ بولیو پیپہ پیچھے لاکھ گالیاں دے لو۔ کھاؤں بھرے کی لڑائیوں کو اس نے کنویر اور کھیتوں پر جانا چور کر دیا۔ دیکھتے ہی بے ہودے پن سے ٹھہر گانا شروع کر دیتا۔

"ہم تو وہی کھٹی میٹھی نازنگی کھائیں گے ری جو تو چوری چھپے لئے جھاگ رہی ہے۔"

"وہ شربت کیوں نہیں پلاتی جو دگلابی قاشوں میں بھرا ہے۔؟"

پایہ پر رحم کر ری گوری۔

ادھر مسجد کے سامنے دالہ پگڈنڈی سے ہو کر گزرنے کو جی کاٹنے لگا تھا۔ مگر اس راستہ پر سے تو گزرتا ہی پڑتا تھا، کیونکہ کچی منڈیروں والی سڑک سے جو راستہ کھیتوں تک جاتا تھا اس میں اور اس مسجد والی پگڈنڈی میں برابر آدھوں آدھ کا فرق پڑ جاتا تھا۔ اس دن تو سمجھو میں مارے غصے کے اس پر چاقو سی چلا دیتی۔ ہوا یہ کہ میں سر پر پوٹنی جمانے جلدی جلدی قدم بڑھا رہی تھی کہ (ننگے پن سے ہنس کر)۔

بولو۔

”نور کو مشد کی طرح چوری کھلاتی ہے، کبھی ادھر بھی رجم کرنا، ہم بھی تو آخر مٹھ ہی ہیں۔“

بیرے ہم کا سارا خون میرے منہ پر آ کر جم گیا۔ میں تیزی سے بولی۔
 ”حرامی بچے تیرے نن و تن کیڑے پڑیں۔ دوسروں کی لڑکیوں کو
 تاکنا بھرتا۔ آٹکھیں نہیں پھوٹ جاتیں تیری۔“ ڈھٹائی سے بولا۔
 ”میں سمجھ رہا تھا باپ سے راتوں کو چہرہ جلا جلا کر کچھ میٹھے بول سکھا
 ہوں گے۔ تو نے عجائباں ہی سیکھی ہیں۔ یہ ہے بیدزادی کی شان۔“
 ”باپ کا نام بیچ میں مت لاگتا ہے۔“ میں چیخ کر بولی۔ ”ویدے
 کھینچ لوں گی گردھوں میں سے۔“

”باپ رہے۔“ وہ بناوٹی ڈر سے بولا۔ ”بہت اونچے اونچے بول
 رہی ہے۔“

”یاں ہاں تیرے باپ کا نہیں کھاتی کہ دھیرے دھیرے بولیں
 بچے لپٹے تجھے تو بس گالیاں ہی دوں۔“
 بے حیاؤں کو نہ ہی کے سواتا ہی کی ہے۔ میں دور تک چلی
 گئی پھر بھی اس کے کفن سچاڑتے میرے کانوں میں سوراخ کرتے
 رہے۔

فدے میرا لال لال چہرہ دیکھ کر بولا۔

”کیموں بی بی کیا بات ہے۔؟“

”نہیں کچھ تو نہیں۔“ میں نہیں چاہتی تھی کہ اس منحوس کے

ذکر سے اسے بھی رنجیدہ کر دوں۔

”اپنا والا نہیں سمجھتی نا، اسی لئے بتاتی بھی نہیں۔“

میں نے لگاؤ سے اس کی ادھر گھور کر دیکھا۔ "میں نے کبھی کوئی بات چسپائی۔ وہی حرام زادہ راستے میں کھڑا ہو گیا تھا۔"
 "اچھا۔" نور نے آستین چڑھائی مشرعہ کہ دی۔
 "ارے بس بس۔" میں گھبرا کر بولی۔ "تو نے کبھی اس کا ڈیل بھی دیکھا ہے۔ وہ تو اپنے سے تلخ کو متھیلی پر بیربھون کی طرح جھانے سار میں گھماتا پھرے۔ کہیں اس کے منہ نہ آتا۔"
 "میں کون کم ہوں۔ اس کا جوڑی دار ہوں۔" نور نے تن دکھڑا ہو گیا۔

"گھاس ذلیل سے ڈرنا ہی سہا ہے۔"
 "اور جو وہ میری...." نور نے دما منہس کر رک گیا۔ "بی بی کو کچھ کہے بھی تو سن لوں۔"
 "تو کیوں سنے! میں نے اسے وہ کھری کھری سنائی ہیں کہ یاد ہی کرتا پھر بگا۔ کہ کبھی کسی پیر زادے سے پالا پڑا تھا۔"
 رحمت بوا کے رت جگے تے میٹے مالیدہ اٹھا کر رکھ لیا تھا۔
 اب نور نے کوکھنا دیکھ کر مجھے کیسی خوشی ہو رہی تھی۔ چپکے لگانا ہوا بولا۔
 "گتے دے پوچھیں گے کہاں گئی تھی تو۔...."
 میں تنک کر بولی۔ "میں ایسی بے اعتباری نہیں ہوں۔ اماں باوا کو مجھ پر سب روئے ہے کہ میں ادھر ادھر جھانکنے والی نہیں۔"
 فہرے میرے قریب سرک آیا۔
 "سچ بی بی تو مجھ سے بہت پیار کرتی ہے۔"
 میں دور سرک گئی۔

”دیکھ نورے تو جانتا ہے میں تجھے دل و جان سے پیار کرتی ہوں۔
اور یہ بھی جانتی ہوں کہ تو اگر ساری دنیا میں کسی کو چاہتا ہے تو میں تجھے۔
مگر اتنے قریب نہ آ۔ محبت اور چیز ہے۔ اور یہ چھوڑا پن بالکل الگ بات ہے۔“
”کیوں۔ کیا میں پسند نہیں تجھے۔“

”ایسی بات نہ کر نورے۔ تجھے یاد ہے۔ تجھے بھی یاد ہوگا کہ سلی حویلی
داہوں کی نسبت مجھے آئی تھی۔ تو میں نے کیا طوفان عجا دیا تھا۔ بولے
کہہ کر نسبت والیں پھیر دی تھی۔ اور حالانکہ وہ لوگ چھ کھیتوں کے
مالک ہیں پھر کیا میری عقل چرنے کو گئی تھی۔“

نورے احمق پن سے بولا۔ ”تو نے چار جماعتیں پاس کر لی ہیں۔
عربی پڑھتی ہے۔ سارے گھاؤں میں بس سید بابا کے گھرانے کو ہی پڑھنا
لکھنا آتا ہے۔ تجھے اس بات پر غرور تو نہیں ہوتا۔“

”اس میں غرور کی کیا بات ہوئی۔؟ یہ تو میرے لئے خوشی کا سودا
ہے کہ تجھے بھی پڑھنا سکھا دوں گی۔ اور کیا چار جماعتیں پڑھ لینے سے
انسان مغرور ہو جاتا ہے رے۔؟“

وہ نیچے سر جھکا کر منہ لگا تو میں بولی۔

”یوں کر کہ یہ غرور و ادا کا جھگڑا ہی مٹ جائے۔ باوا کے پاس

آکر روز سبق لے لیا کر۔ انہوں نے تو اب یہی شرع کیا ہے کہ سب...

وہ زور سے ہنس کر، بات کاٹ کر بولا۔ ”وہیے تو اردو پڑھنا
لکھنا مجھے بھی آتا ہے۔ قرآن بھی میرا ختم ہو گیا ہے۔ مگر میں نے تیری طرح
جماعت میں بیٹھ کر امتحان نہیں دیا۔ بس۔“

”تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔؟ یوں ٹھنسنے دنیا چھوڑ دے۔“

مگر۔ چاہے تو تو بھی امتحان پاس کر لے۔ شہر کے آئے دن تو پھیرے لگاتا ہے۔“

نورے چپ رہ گیا۔ بیہوش دیکھا کہ وہ ذرا آزرده ہو رہا ہے تو بات چلانے کو بولی۔

”نورے مجھے بس بھی سے محبت ہے نا۔؟“
وہ ذرا دیر بعد آنکھیں ادھر اٹھا کر بولا۔ ”ایسی بات پوچھنے کا

فائدہ۔؟“

”تو پھر اتنا سمجھ لے کہ محبت کرنے والے کبھی دور نہیں ہوتے۔“
میں جانتی تھی نورے کا دل بے طرح دھڑک پھر ٹک رہا ہے۔
کیونکہ میں ایک دو دن بعد نہیں، پورے ڈھائی ماہ بعد اس سے ملنے کو آئی تھی۔ ہمارے گاؤں میں زیادہ تر مسلمان گھرانے ہی آباد ہیں سب ایک دوسرے کو رشتوں سے پکارتے ہیں۔ سب میں محبت، مہربانی جوں ہے۔ بعضوں میں زینیات کے متعلق بہت سے جھگڑے بھی اسٹھ کھڑے ہوتے ہیں، مگر اس سے دلوں میں میل کہاں آتا ہے۔! پردہ بھی خال خال ہی ہوتا ہے۔ کھیتوں میں، بستیوں سے پرے پمیلوں کے نیچے، آموں کے نیچے، سنتروں کے کینچ میں، کہیں نہ کہیں دوسلے کا نیچے نظر آہی جائیں گے۔ لڑکیاں اپنے منگیتروں سے چھپ چھپ کر ملتی ہیں۔ اور رٹ کے بیروں کی ڈالوں میں چھپ چھپ کر بالیوں کا انتظار دیکھتے ہیں۔

”گاؤں میں ایسا تو کبھی نہیں ہوتا کہ کسی کی لگائی ٹوٹ جائے۔ پیار کا یہ بندھن، جو کنوارے سے ہی مضبوط ہوتا ہے۔ شادی کے بعد

تو اور مضبوط ہو جاتا ہے۔ یہاں کسی جھگڑے کا ڈھ نہیں ہوتا۔ ڈر ہوتا ہے۔
تو بس غوراً بہت بزرگوں کی آنکھوں کا، جو لگائی ہو جانے پر بری
طرت چرکس ہو جاتی ہیں۔

”یہ ابیلی سر پر پوٹلی دھرے کعبیتوں کو جاتے جاتے کہیں رک تو
نہیں جاتی۔ ہاں بیچ میں بالم کا کعبیت بھی تو پڑتا ہے۔“
”کیا تم لوگوں کے دل کبھی پیار سے نہیں دھڑکے تھے؟“

مجھے یاد آیا رحمت بوا کے رت جگے میں پایاں نے میرے کان
پر، ہنسی ہنسی کہا تھا۔

”کب دلہنیا بن کر پایا کا دلش آ باد کرے گی؟ وہ بے چارہ
تو فراق میں جنگلوں کی خاک چھان رہا ہے۔ اپنی جھوپڑی پھوڑ کر
راتوں رات جاگتا رہتا ہے سرحد کنارے۔“

نورے کو دیکھ دیکھ کر میرا چلوؤں خون بڑھ جاتا ہے۔ دنیا
میں محبت سے بڑھ کر بھی کوئی چیز ہوگی؟

اس دن میں لوٹی تو نوشی سے منہ تم نما رہا تھا۔ سانولے لگاؤں
پر تو پونہ کا خون جلدی جھلکیاں مارنے لگا ہے۔ گلا بے جیسا بے فیرت
سبھی شاید ہی کوئی رہا ہو۔ منہ موڑ کر دھوکا کھانے لگا۔

”اس پتھر ملی زمین پر تو تیرے نازک نوے پھلنی ہو جائیں گے۔
تو ان آنکھوں پر قدم کیوں نہیں دھرتی جو میں نے تیری راہ میں بچا
رکھی ہیں۔؟“

”بہت اچھے، بہت اچھے۔“ میں طنز سے بولی۔ ”ات کچھ زیادہ
ہی چڑھا رکھی ہے کیا؟“

”جس نے ایسی آنکھوں کی چڑھا رکھی ہو.....“ ایسے کمینوں کے کون منہ لگے۔؟ میں نے کانوں پر دوپٹہ لپیٹ لیا۔
 میں اس کی دوکان کے سامنے سے گزرنے لگی تو یہودے پہ سے اپنی گدی دار چوکی سے اتر آیا اور بیچوں بیچ رک کر بڑی سنجیدگی اور آزر دگی سے بولا۔

”بی بی میں سچ بچہ تجھ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“
 ”شادی؟“ کالی مٹی کی مضبوط ہانڈی میرے ہاتھوں میں تھی۔
 میں نے پوری طاقت سے اس کے سر پر دے ماری۔
 ”نکمو نہیے! میں تو تیرے منہ پر ہتھو کوں بھی ناں۔“
 پاؤں پھینکتی، غصے میں سنسناتی مین جلدی جلدی سہاگ کھڑی ہوئی۔

گلابے نے ایک لفظ بھی نہ کہا۔

پھر دن گزر گئے۔

سکاوں میں سائیں سائیں ہوائیں چلتی شروع ہو گئی سبیں۔ نیم کے درختوں سے پیلی پیلی نمکودیاں جھرتی تھیں جنہیں بچے کڑوے کڑوے منہ نہا کر کھاتے اور ایک دوسرے پر نشانہ باندھ باندھ کر اچھا لیتے۔ تپے سوکھ سوکھ کر گر رہے تھے۔ (پھر مہا راجہ بومستی ہوئی آئے گی۔) بوڑھوں کے بیچینے کے لئے اب کوئی جگہ نہ رہ گئی تھی اس لئے شام ڈھلے کھیلے مھنوں میں یا گھروں سے باہر چار پائیاں بھینٹیں، تخت لگاتے اور باتیں ہوتیں۔ دل والے حقے سہرا لاتے، ور نہ یونہی پالوں کا دور چلتا۔
 وہیں ایک دن سفید مسجد کے مولوی صاحب دین کی باتیں بنا

رہے تھے۔ انہوں نے ایک واقعہ بتایا کہ ایسے ہی ایک سود خوار تھا جس نے اپنا پیشہ ہی یہ بنا رکھا تھا کہ سود لیتا رہے۔ کہتے ہیں جب وہ مرانہ عجیب حادثہ پیش آیا۔ جب گورکن اس کے لئے قبر کھودنے لگا تو جہاں سے بھی سچاؤ ڈالنا کر مٹی اکھاڑی جاتی وہاں سے ان گنت بھجوروں اور سانپ نکلنے لگے۔ ایسا کوئی چار چھ مرتبہ ہوا۔ لوگ بری طرح گھبرا گئے اور ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ سچی یہ کیا ماجرا ہے۔ پھر کسی نے بتایا کہ مرحوم سود بہت کھایا کرتے تھے۔ اس کا بدلہ اللہ کے ہاں تو ملے گا ہی ملے گا۔ یہاں دنیا میں بھی مل گیا۔

جانے کیوں اس دن گلابے بھی اس محفل میں آشرک ہوا تھا۔ سب تو سن رہے تھے مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ بیٹیا بونہی بیٹری پر بیٹری سلگاتا رہا اور ساروں پر دھنوں کے بگولے چھوڑتا رہا۔ مگر مولوی صاحب کا یہ کہنا تھا کہ اس واقعہ کو سن کر گلابے بھی ذرا ساکت ہو گیا تھا اور یقین ہے کہ وہ اپنی راہ بدل دیتا۔ راہ تو وہ کیا بدلتا اور اچھی حرکتیں کرنے لگا۔ اور اس دن نورارا گاؤں اس پر ہتھوڑو کرنے لگا۔

ہونا کیا۔ رحیم خاں پھوپھا کی بیٹی برکت بوا کی شادی تھی۔ ہمارے گاؤں کا بھی عجیب حال ہے۔ چاہے کھانے کو پیسہ نہ ہو، فاقے ہو ہے ہوں، ہنگے جسم سے رہتے ہوں۔ مگر جہاں شادی بیاہ کا مسئلہ آیا تو یہ لوگ پیسہ ہیکلے بھر نہ یہ دیکھیں کہ پیسہ کہاں سے آئے گا۔ نہ پھوپھا کہ ادائیگی کی کیا صورت نکلے گی۔ بس سمدھیالنے میں نام اونچا رہے، ورنہ برائی کیا منہ پر تھوکیں گے۔

زہین بھوپچی کے پاس نہ لو اتنے زیور ہی تھے کہ گہن دکھ کر پیسہ جمع کرتیں، نہ گھر میں سونے چاندی کے برتنوں کی ادبھی ڈھیک ہی تھی۔ کہ نور جوڑ کر کے بیچ باج کر کام چلا لیتیں۔ اور برکت لوار کی شادی تو ہونی ہی تھی۔

رحیم خاں بھوپچا گلابے کے پاس گئے۔ مگر اب کی سی انہوں نے سود پر نہیں بلکہ بطور قرض حسنہ کچھ روپوں کا مطالبہ کیا۔ پھر اس کے بعد کی کارروائی کسی کو نہیں معلوم۔ ہوا اتنا ہی کہ کچھ ہی روز بعد برکت لوار کی لاش مسجد والے کنوئیں میں تیرتی ملی۔ اور پھر کچھ ہی روز بعد یہ بات بھی پھوٹ گئی کہ گلابے نے کہا کہ ”قرض تو بغیر سود کے میں دیئے دیتا ہوں، مگر ہاں۔ مجھے اپنے دوستوں کا ہرا خیال رہتا ہے۔“

دارا گلابے کا بار غار تھا۔ اور تیری میری لڑکیوں کو ناکنا بہرتا تھا۔ برکت لوار پر اس کی بہت دنوں سے نگاہ تھی۔

سجلا رحیم خان بھوپچا کہاں پیسہ ادھار لینے چلے تھے۔ وہ ان صورتوں میں بننے والا تھا۔ مگر برکت لوار کے کان تو پٹ نہیں تھے۔ چار لوگوں کی زبان پر جب کھلم کھلا ایسی بات پھرے تو کون جی گردے والا زندہ رہنے کے بارے میں سوچ سکتا ہے۔ چلو باپ کو فکر دے سے نجات دلا دی۔ اور کہاں تو دلہن بننے میں ہزاروں کا حاسا پڑنا تھا کہ اب مٹھی بھر چھوٹوں میں سہاگ چڑھ گیا۔

گلاب خاں کے مرنے کی ہزاروں لوگ دعا پڑھنا لگے ہوں گے۔ مگر کسی میں ہمت نہ تھی کہ اسے جا کر ٹھکانے لگا دیتا۔ اس کا اپنا

انشاء چوڑا حلقہ تھا کہ کسی کو اس کے خلاف چوں کرنے کی بھی ہمت نہ تھی۔

زمیندار کے بیٹے کے ختنے تھے۔ کھاؤں کی تمام لڑکیوں کو زمیندار نے رات بچے کی دعوت دی تھی۔ اس دن اماں کی طبیعت سنبھلی تو میری جان کو آنے لگیں۔ "جاتو بھی چلی جا۔"

اب لاکھ لاکھ کہتی ہوں کہ "نہ میں نہ جاؤں گی۔ ماں تو گھر میں بیمار پڑی رہے اور سٹی رات بچے منائے۔ مجھ سے نہ ہوگا اب۔ کیا نہ جاؤں گی تو گناہ ہو جائے گا۔"

بولیں۔ "نہ بیٹا بڑے لوگوں سے بگاڑ کر نا اچھا نہ ہوگا۔ وہ فرد پوچھے گی کہ سب تو آئیں، بی بی کیوں نہ آئی۔" یقین کون کرے گا کہ میرا جی برا تھا۔ جا ابھی ابھی جا۔ ابھی تو چراغ بھی نہیں جلے ہیں۔"

میں اماں کے کہنے پر جی نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہرے پتوں والا کرتا شلوار پہن، ہری ہی جالی کا دوپٹہ اوڑھنا اور کاجل لگا کر دروازے سے باہر آئی۔ آنگن میں موگرے کے پھولوں کے پودے تھے۔ ایک ٹہنی پر ایک ساتھ چار چھ پھولوں کا گچھا مہک رہا تھا۔ اسے توڑ کر کان کے پاس اڑس لیا۔ الماری کے آئینے میں اپنا منہ دیکھا تو لاج سی آگئی۔ یہ ہر اہرا جوڑا پہن، چوستی کی دھن بن، میں کہاں چلی تھی؟ ("کاش ایسے میں نورے تجھے دیکھ لیتا۔" دل نے چپکے سے سرگوشی کی۔)

چلتے چلتے جب میں مسجد کے سامنے پہنچی تو گلابے موچھوں پر تادیر دیتا بیٹھا تھا۔ اس دن کے بعد سے گلابے نے کبھی مجھ پر ڈھونڈے نہیں کیا۔

شہر ممنوع

تھے۔ اور نہ کبھی شرارت ہی کی تھی۔ مگر اس دن جانے کیا بات تھی، اندھیرا دیکھ کر اس کی ہمت بڑھی یا یونہی کینگی سر پر سوار تھی کہ مہینے لگا۔

”اوہو۔ ہو ہو ہو۔ کیا بہار ہے۔“

میں جلدی جلدی چلنے لگی تو ڈھٹائی سے بولا۔

”اس دن تو بڑی تیزی دکھائی۔ آئیسا۔؟“

عورت کی خاموشی مرد کو بہادر بنا دیتی ہے۔ میں نے خاموش رہنا مناسب نہ سمجھا۔ ایسے سجاؤ میں، جیسے میں اسے کچھ بھی نہیں جھتی تیزی سے بولی۔

”آج بھی دکھا سکتی ہوں۔ اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے کہینے۔؟“

”تیرا ہونے والا دولہا۔“ اس نے پھٹ سے جواب دیا۔

میں نے پاس پڑی اینٹ اٹھائی اور اس کے سر پر پھینک کر بھاگ کھڑی ہوئی۔

”اچھا اچھا۔ کسی دن اکیلے میں سمجھ لوں گا۔“ پیچھے سے

گلابے چلا کر بولا۔

بول بھاگنے کو تو میں بھاگ گئی، مگر میرا دل بری طرح کانپ اٹھا۔ آج تک گلابے نے ایسی کوئی بات نہ کہی تھی۔ یہ تو سکاؤں کا معاملہ ہے جہاں سر شام ہی آسمان جو نیڑوں پر جھک آتا ہے، تاریکی پھیل جاتی ہے۔ اکیلے دیکھنے والوں بار ہزاروں ہی جگہ آنا جانا رہتا ہے۔ اپنے جانے پہچانے راستوں پر بھلا کون ہمیشہ ہی کسی کا ساتھ دے دیتا رہتا ہے۔ کام ٹپا اور چل نکلے۔ اب تو کہیں اکیلے جاتے بھی ڈر لگے گا۔ کس ڈھٹائی سے اس نے کہا تھا۔

”اچھا اچھا۔ کسی دن اکیلے میں سمجھ لوں گا۔“

میں نے گھر سے باہر نکلتا ہی چھوڑ دیا۔ یا ایسے ہی بہت کام پڑ جاتا تو کسی نہ کسی کا ساتھ ڈھونڈ لیتی۔ اب تک میں گلا بے کی جوتوں اور پیچروں سے مرمت کرنی آئی تھی۔ مگر اس نے ایسا ڈرا دیا تھا کہ میری ساری بہادری رستہ بھول گئی۔ آخر کو لڑکی ذات تھی نا۔! اب میں جلد جلد چاہتی تھی کہ میری شادی ہو جائے۔ مرد کا سہارا بڑا مضبوط ہے۔ بول باب بھی مرد ہوتا ہے اور شوہر بھی، مگر ان میں بھی بڑا فرق ہے۔؛ وقت پڑنے پر شوہر آستین چڑھا لیتا ہے چاہے اس میں اس کی جان ہی چلی جائے۔ باب صرف پگڑی میں منہ ہی چھپا سکتا ہے۔ بیٹی کی بدنامی کا سہن بڑا کٹھن ہے۔

یوں گلا بے پکا غنڈہ سخا۔ مگر پھر بھی اس کی ہمت نہ ہڑتی کہ کسی کی بیاہتا کو یوں سر راہ چھیڑے۔ مگر شادی میں تو ابھی دن باقی تھے۔ اگر میری شادی ہو جاتی تو اماں کی دیکھ بھال کرتے والا کون رہ جاتا وہ تو اب مذہب ہو رہی تھیں۔ بول دیکھا جائے تو کون ماں باب محض اس لئے بیٹیوں کو بھال رکھتے ہیں کہ ان سے تہاورداری کر داتے پھر جا۔ اصل رکاوٹ تو روپے کی تھی۔ بس اپنا بھرم قائم رکھنے کو بیادری کا بہانہ عام کر رکھا تھا۔ باوا اس انتظار میں تھے کہ اب کی فصل اٹھے تو میرے گھر کے کھلیں۔ ادھر ادھر سے قرض مل سکتا تھا۔ مگر قرض کے نام پر باوا لا حول پڑھتے تھے۔

گھر میں پڑے پڑے مجھے بس اتنا ہی کام تھا کہ نورے کے ہار میں سوچنا ہوں۔ اداریوں میں خود ارادہ کر کے ستھڑی ہی سوچنے

کو بھینسی تھی۔ وہ تو خیالات ہی آپ آپ چلے آتے تھے۔ اپنے گھر بار
انہی زندگی، اپنے بچوں کی کسے تنہا اور آرزو نہیں ہوتی۔؟ میں بھی
ایک عورت ہوں۔ میرے بھی وہی احساسات اور جذبات ہیں جو دنیا
کی اور ساری محبت کرنے والی عورتوں کے ہیں دن رات اسی ادھیر
بن میں رہتی تھی۔ نورے کو یوں خوش رکھوں گی، بچوں کے یہ نام رکھوں
گی۔ میں سوچتی تھی پہلی بار بیٹی ہوئی تو ہاجرہ نام رکھوں گی۔ میں سوچتی
تھی۔ اور بلیا ہوا تو۔؟ بلیا ہوا تو یہ حق نورے کو پہنچے گا۔ کہ اپنے بیٹے
کا جو نام چاہے رکھے۔ میں کون باپ بیٹوں کے بیچ میں دخل دینے
والی۔؟ ہاں بیٹیاں میرے ہاتھوں پلین گی۔ بڑھیں گی۔ ان پر میرا
حق ہوگا۔

کئی ہفتے بیت گئے تھے کہ نورے کی صورت دیکھنے کو نہ ملی تھی۔
رہ رہ کے یاد ستانی تھی، پر وہ رہتا بھی کتنی دور تھا۔ بکاؤں کے
گولے پر ان لوگوں کی کھینتی بارش تھی۔ کون جاتا۔؟ سکینہ کے ہاتھ
سوکھا پھول بیٹے بھی بدلت ہو گئی تھی۔ سوکھے پھول کا مطلب یہ
ہوتا تھا کہ "تیری جدائی میں دیکھ یہ دلیوں کہلا کر رہ گیا ہے۔" پھر
کوئی نہ کوئی جوابی کارروائی عمل میں آہی جاتی۔ مگر نورہ خاموش تھا۔

کیا اسے میری یاد نہیں آتی۔؟
ایک دن سہ پہر کو میں گہیوں ٹھیکتی بیٹھی تھی کہ سکینہ چوری
چوری گھر میں آئی۔ پہلے تو اس نے ادھر ادھر دیکھا، اور پھر ایک
گولی سے میرے آگے پھینک دی۔

پریم پتر۔ دل دھڑک اٹھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے وہ گولی

اٹھالی۔

”آج آدھے کا چاند ہے۔ بہت زوردار چاندنی بھی نہ ہوگی۔
ملگے اجالے میں نمبردار کے پیپل تلے آجانا۔ ہاں عشا کی اذان
کے وقت۔“ نورے۔

میں نے سکینہ کو سر سے اشارہ کر دیا۔ ”ہاں۔“ وہ الٹے پیروں
بھاگ گئی۔

جب نمازی مسجد میں جمع ہو گئے تو میں پیپل تلے سٹی۔ ریشمی تہبند،
ریشمی کرتا، سر پر تیل چھڑا ہوا۔ بل کھاتی ہوئی موچھیں۔ جس کا اتنا
مضبوط اور تو مند شوہر ہوا سے کاہے کا ڈر۔ نورے نے شرارت
اور بے صبری سے مجھے کھینچنا چاہا۔ مگر میں دور سرک گئی۔ ”میں تجھ سے
لاکھ بار کہہ چکی ہوں یہ سب دھند اشادی سے پہلے نہیں چلے گا۔“
نورے ہنسنے لگا۔ ”دو چار دن میں پرانی کپاس کے گاڑے
لے کر شہر جا رہا ہوں۔ پتہ نہیں وہاں سے کب لوٹوں۔“ اس کی
آواز مدھم پڑ گئی۔

”کل بھی آؤ گے میہیں۔“ میں ذرا آزر رہے ہو کر بولی۔

”تو آجانا، میں بھی کوشش کر کے آ جاؤں گا۔“

پیپل کے پتوں میں چاند لپ چھپ کر رہا تھا۔ رکی رکی سی ہوا۔
سٹی۔ ایک بدلی نے چاند کو ڈھانپ دیا۔ میں نے غم سے سبھی آواز
میں کہا۔ نورے۔

نورے کچھ نہ بولا۔

چاند سچر چمک رہا تھا۔ تپے سرسرا رہے تھے۔ جذبات سے سبھی

آواز میں نورے بولا۔

”بی بی۔!“

بی بی کچھ نہ بولی۔

دہم دونوں ایک دوسرے کو کس بری طرح چاہتے ہیں خدایا، میں نے جھک کر نورے کو دیکھا۔ ذرا آزدہ نظر آ رہا تھا۔

”تو اس لئے اداس ہو گیا کہ میں نے تجھے پیار کرنے کی اجازت

نہیں دی۔“

وہ کچھ نہ بولا۔

”میں تیری ہوں نورے، صرف تیری ہوں۔“ میں پاگل بن کر بول

رہی تھی۔ ”اور تو بھی میرا ہے، صرف میرا ہے۔ میں محبت کرنا اور

کر دانا چاہتی ہوں۔ اگر میں تجھ سے محبت نہ کروں تو تو مجھے جو چاہے

سنرا دے لے۔ اور اگر تو میری طرف سے منہ موڑے تو میں زیرِ اخون

بی جاؤں گی۔“

نورے نے مجھے دیکھا تو میں ہنس رہی تھی۔ ”ہاں نورے عورت

محبت کے معاملے میں بڑی پاگل ہوتی ہے۔ تو میرا ہی ہے نا۔؟“

”تو میری ہی ہے نا۔؟“ بے صبرا میری طرف ہنستے ہوئے لپک

رہا تھا، مگر میں بھاگ کھڑی ہوئی۔

دوسرے دن۔

بادِ آگر سے نماز کو بکھلے اور میں پیاملن کو۔ جانے کدھر سے گھرے

گھرے ہادل اٹھ آئے تھے۔ کہ چاند چھپ گیا۔ ”چلو یہ بھی اچھا ہی ہوا۔“

میں نے دل ہی میں سوچا۔ ”آج یہ چمڑیاں اتنی زور زور سے کیوں

چھٹک رہی ہیں۔“ میں نے ارد گرد دوپٹہ پیٹ لیا۔ ”ات! اڈوڈ
بعد نورے چلا جائے گا، مگر محبت کہاں جائے گی۔ وہ تو دل ہی میں
رہتی ہے۔“ نابہدے کی پوٹلی میں لے بیٹھے سے لگائی۔ ”نورے کو نابہڈ
کٹنا پسند ہے۔!“ (”ادز کو کتنی پسند ہے!“)

بہرا دل خوشی سے دھک دھک کرنے لگا۔ نورے وہاں موجود
تھا۔ پیچھے سے جا کر میں نے تیری محبت سے کہا۔

”نورے تیری بی بی آگئی۔“

شاید کچھ سوچنا بیٹھا تھا کہ پہلے تو چونک گیا۔ پھر ذرا بھاری

سی آواز سے بولا۔

”آگئی بی بی۔!“

”ہاں تجھ سے وعدہ جو تھا۔ مگر تیری آواز بھاری کیوں ہے؟
کیا روتا رہا ہے؟ محض اتنی سی بات کے لئے کہ آٹھ چار روز کے لئے
باہر جانا ہے۔؟ رونا مجھے چاہیے کہ تجھے۔؟ رونا تو عورتوں کو سہاتا
میں نے سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ وہ دھبی دھبی ہنسی ہنستا
رہا۔ پھر اجنبی سے لہجہ میں بولا۔

”تجھے میری محبت آتی ہے۔؟“

اب میرے سینے کی باری تھی۔

”سچ بول۔ ہنس کر بات مت ٹال۔“

”روز وہی بات دہراتا ہے۔ لے سن! تیری محبت آتی ہے۔

بہت آتی ہے۔ اتنی کہ تو چاہے تو میں اپنی آنکھیں تک تیرے کہے پر
پھوٹ ڈالوں۔ کہہ کر انہما کوشت تک تیرے لئے کھاٹ کر پکا دوں۔“

"بتری محبت سا پنھی ہے۔؟"

"بائیکل۔۱۔"

"اور تجھے یقین ہے کہ میں بھی تجھ سے اسی طرح محبت کرتا ہوں۔"

"جھلا یہ بھی کوئی پوچھنے جیسی بات ہوئی۔؟"

"اور اگر میں یہ سناؤں کہ مجھے تجھ سے محبت نہیں، چپ کھیل

کھیل رہا ہوں تو۔؟"

"تو میں کہوں گی نور اذاق کی جون میں ہے۔"

"اور اگر میں یہ کہوں کہ میں ابھی جھما رنڈی کے ہاں سے آ رہا

ہوں تو۔؟"

"میں ایک لمحے کور کی۔" تو اتنا بیچ نہیں ہو سکتا۔"

"پھر بھی یہ سوچ لے کہ اگر میں بیچ ہی ہوں تو۔؟"

"مگر ایسا نہیں ہو سکتا۔" میں مضبوطی سے بولی۔

"اور جو ہو گیا تو۔؟"

"ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ جو لوگ سا پنھی محبت کرتے ہیں وہ

اپنی محبوبہ کے سوا کسی کو دیکھتے بھی نہیں۔ اور تو نے آج تک سوا

اپنی بی بی کے اور کسی کو نہیں چاہا۔"

بہت تنے سے مکمل کر آگے بڑھی۔ پتوں میں چاند ہلا اور نورے

کی آواز بدل گئی۔

"محبت کے بارے میں تیرا بھی خیال ہے تو یہ سمجھ لے کہ مجھے

تجھ سے سا پنھی محبت ہے۔؟ کیونکہ میں نے بہت سی لڑکیوں کو چھیڑا

ضرور ہے۔ مگر انہی کسی کو نہیں رکھا۔ میں تو بس تجھی کو چاہتا ہوں۔"

”گلابے: سناٹے میں میری آواز دور تک پہنچی چلی گئی اور الیڈ بکھر گیا۔“

”اچھا اچھا، کسی دن اکیلے میں سمجھ لوں گا۔“ ایک ناگ چمن چمن کرتا کہیں سے نکلا اور میرے انگ انگ کو ڈس گیا۔
میری آنکھیں پھیل کر گلابے پر جم گئیں۔

”میں تو یونہی پیپل تھے چلا آیا کرتا تھا۔ آج، یہ مجھے معلوم نہ تھا کہ یہاں بی بی بھی مل جائے گی۔“ وہ سہاری سی آواز میں ہنسا۔ ”اور تو جو اتنی محبت والی ہے تو میری آواز کا فرق بھی نہ جان سکی۔ ڈیل ڈول تو خیر ہم دونوں کے ملتے ہی ہیں۔“

میری آنکھیں اسی طرح پھٹی رہیں۔

گلابے آزدہ سی ہنسی ہنس رہا تھا۔ اکدم اس نے پیک کر مجھے دونوں ہاتھوں پر اٹھا لیا اور تیز تیز قدموں سے چلتے لگا۔ بیٹ دور پر اس نے مجھے دھیرے سے اتار کر کھڑا کر دیا۔ جانو میں بھول تھی کہ ذرا سے دھکے سے پنکھڑی پنکھڑی ہو جاتی۔

”تو نورے سے محبت کرتی ہے نا بی بی۔؟“

میری آنکھیں پلکیں جھپکا نا بھول گئی تھیں۔ میں اسی طرح اسے دیکھتی رہی۔ وہ ذرا سہاری اور ڈوبتی آواز سے بولا۔

”تو نورے سے محبت کرتی ہے، اور میں محبت کرنے والوں سے محبت کرتا ہوں۔ تو یہ نہ سمجھ بی بی کہ میں تیرے ہرنٹ چوم لوں گا۔ یا تیری عزت لوٹ لوں گا۔ میں تو یہ چاہوں گا کہ تجھے تیرا بار مل جائے۔ تجھے بہت سی خوشیاں مل جائیں۔ سانچی محبت کرنے والے کہیں

اپنوں کا برا چاہا کرتے ہیں بی بی۔ مگر۔ مگر بی بی تیرا دل چاہے تو اس جھوٹپٹری میں جھانک کر دیکھ لے۔ تو نے ابھی پیپل تلے کہا تھا نا کہ جو لوگ سا بچی محبت کرتے ہیں وہ اپنی محبوبہ کے سوا کسی کو دیکھنے تک نہیں۔ !

بڑی دیر بعد وہ آنسوؤں میں ڈوبی آواز میں بولا۔ "میں نے تو آج تک کبھی خدا کو بھی سجدہ نہیں کیا، مگر دل چاہتا ہے کہ آج تجھے سجدہ کروں بی بی۔ تو اپنی محبت میں کتنی اٹل اور کتنی اونچی ہے۔" اس نے اپنا بھاری بھر کم وجود میرے سامنے جھکا دیا۔

"بول بیٹی تجھے اتنے اتنے مہر کے عوض نور خان پسند ہے۔" میں نے طے کیا ہے فضول روئے دھولے اور شرمائے کی بجائے صاف کہہ دوں گی۔

"نہیں۔ مجھے یہ شادی پسند نہیں۔" اس کے بعد جو گڑ بڑ ہوگی۔ جو ہنگامے ہوں گے میں ان سے بخوبی واقف ہوں، مگر میرے دل میں ڈر نہیں ہے۔ ایسی بے جیا لڑکی کو بعد میں کون قبولے گا۔؟ مجھے اس کا بھی خوف نہیں ہے۔ ہاں میں نے ہر ہر طرح سے سوچ لیا ہے کہ میں وہی کروں گی جو میرے دل نے مجھے سمجھا یا ہے۔

میں گلاب سے بیاہ کر رہی ہوں۔

آگ میں پھول

بات صرف اتنی تھی کہ طاہر میاں نے حویلی کے کسی کو نہ کہہ دے
 میں نہاتے ہیں شب کو کی پیچیدہ دیکھ لی تھی اور رواں ہتی شہزادوں کی طرح
 ایک چھوڑ ہزار جان سے عاشق ہو گئے تھے۔ لیکن یہ بات بھی اپنی
 جگہ ہر فراق تھی کہ طاہر میاں کی نو بچپن ہی سے ٹھیکرے کی منگنی
 طے پا چکی تھی۔ اب اس کا کہا ذکر کہ طاہر میاں تو دلا بیت پلٹ ڈاکٹر
 تھے اور ان کی ہونے والی دلہن بیچاری خیر سے الف سے اللہ اور
 بے سے بکری تک بھی نہ جانتی تھی۔ اور جانتی بھی کیسے بیچاری؟
 اس خاندان میں پڑھانے لکھانے کا سودا بھی کس کے سر پر تھا۔
 وہ تو کہو طاہر میاں کی ماں ایسی تھیں جو غیر خاندان سے بیاہ کر
 لائی گئی تھیں اور کچھ نہ کچھ پڑھنا لکھنا جانتی تھیں۔ ویسے اس
 خاندان کا دستور تو یہ تھا کہ ننھوڑا بہت بیٹوں کو پڑھا دیا جاتا
 اور آجاکے ساری جہالت ماؤں اور بیٹیوں کے حصے میں رہ جاتی
 تھی۔ طاہر میاں کی اماں دوسرے کٹم کی تھیں۔ اگر ہاتھ بھر لے
 کوئی ڈگری ساتھ نہ تھی تو یہ بھی نہ تھا کہ تباہ گھر والا حویلی پر کھڑا
 رہے اور وہ انگریزی کے دو حلقے تک نہ پڑھ سکیں۔ اور اس دن تو

پوری حویلی میں ان کی دھاک بیٹھ گئی تھی۔ جب گاؤں سے تارا آیا۔
 اتفاق کی بات ہی سمجھو اسے، پورا مردانہ محرم کے علم دیکھنے گیا ہوا
 تھا۔ یہ بچا پری درودوں سے بے حالی پڑی تھیں۔ تارا والے نے
 آقا ددی۔ انہوں نے دستخط کر کے تار لیا اور پڑھا۔

شیر اللہ کو پیارے ہو گئے تھے ان کے۔ دربان کو دوڑایا
 گیا اور سب یونہی سجا گئے دوڑنے چلے آئے۔ نندوں نے طعنہ دیا۔
 ساس نے اپنا ساس پن دکھایا۔
 ”اے دو بول کیا پڑھنے آگئے موئے، اٹا سیدھا جو منہ میں
 آیا پک دیا۔“

بچا پری منہ سے تو کیا بولتیں، ہاں تار کپڑا ماموں میاں کی
 آنکھوں سے سامنے کر دیا۔

اور سپر طاہر میاں کی اماں کہ خاندان سحر میں رونق دلہن کے
 نام سے حاجتی تھیں۔ تھیں بھی واقعی رونق دلہن — خاندان
 کا نام انہی کی اولاد سے روشن ہوتا تھا، لاکھ سر چٹا پنچنے والوں
 نے، مگر انہوں نے طاہر میاں کو قسم اللہ کہہ کر داخل مکتب کر ہی دیا۔
 تعلیم کی خوب خود میں تھی۔ سچا اہلاد کو ایسے نہ پڑھاتیں۔ رونق دلہن
 کی ساس توان پر خوب بگڑی تھیں ایک بار گھٹنا پڑھا تو انہیں آتا
 ہی تھا۔ دنیا والے کے اخبار رسالے بھی نظر سے گزرتے تھے۔ اپنے
 میکے سے ایک خط، بڑا ادنیٰ قسم کا، انہی مذکور جہاں بیگم کے نام لکھا
 ”میرے لئے پیغام۔ خرمندگی۔ وہ تمہارا نہانا منا بھتیجا،
 جاوید میاں، روز مجھ سے فرمایش کرتا تھا چندا ماموں لاد۔ میں

کرموں جلی گب اس کی خواہش پوری کر سکی۔ اسے تو مجھے نیچا دکھانا تھا۔
خود ہی چندا ماموں کو کپڑے چل دیا۔

گیارہویں شریعت میں اسے چار ماہ اوپر چار سال کا ہونا تھا۔
دادی نے بڑے ارمانوں سے لبم اللہ پڑھانے کا جتن کر دکھایا تھا۔
ریشی جوڑا سلوایا۔ گھوڑے کا پورا گھنا ہوا یا اور تمام پوتوں کے
ساتھ وہاں پہنچیں تو جادید میاں یہاں دیکھتے ہیں نہ وہاں۔

”اے دلہن! دلہنوں کی طرح مایوں بھا دیا گیا تم نے میرے
جدن میاں کو۔“ دادی نے لاڈ سے پوچھا۔

آنکھوں میں آنسو بھر کر رونق دلہن بولیں۔

”اولیٰ آپ کو میرا وہ خط نہیں ملا جس میں میں نے اپنے پیارے
کی موت کی خبر دی تھی آپ کو۔“

اسی ماں کے خون کا اثر بھلا ظاہر میاں میں نہ آتا تو کس میں

آتا۔؟

یہ اتنی بڑی ساری حویلی، خاندان بھر کے لوگ اسی میں گھسے
پلے پڑتے تھے۔ چھوکرے چھوکرہ بچوں کا وہ ہجوم کہ کوئی اجنبی جو آئے تو
صاف یہی کہہ دے کہ شادی رچ رہی ہے یا پھر عمر کے علم اٹھنے والے
ہیں۔ اور ایسے میں پڑھائی تو کیا خاک دھوئی ہوتی کہ اس کا دستور
بھی نہ تھا، مگر یہ ظاہر میاں تھے کہ انہی ہی اگلے پلے جلنے، سناٹے سیکر
چار سپر۔ دو میہر جب دیکھو غیب یہ پورا اتنا ند پڑ جانے میں جتا لاتا اور
آپ چار پنگ ادھر ادھر گھمڑے کر کے ایک کمرہ سا بنالیتے۔ پھر ادا ادا
کے کمرے سے دھیرے دھیرے گھلا کاتے ہوئے ایک کرسی اور
نانا میاں کی ہاتھی دانست کے دستے والی چھڑکی

اور سپردِ ادم حرا اور پیکارِ اہلِ علم۔ بس، اسکوئی تیار ہو جاتا اور نچے حنا
پڑھانا شروع۔ اسی پر بس نہ تھا۔ پھر خالی وقتوں میں یہ پیچیدگی
پر رونے کے بجائے لیٹ لیٹ کر ایک ایک کے بازوؤں میں انجکشن
گھونپتے پھرتے۔ آئین کی لال کھڑکی میں کھرج کھرج کر اس کی گولیا
نیالتے اور دردمراؤں خجارد کے لئے ہنستے۔

کہنے والے کہتے ہیں چمک پوت کے پاؤں پالنے میں اور صرطاهر
میاں نے ایک دو کر کے سارے پچلے درجے پاس کر لئے اور کشاکش
سے ایف ایس۔ سی میں داخلے کیا۔ مقصد تو وہی انجکشن گھونپنا
اور گولیاں ہانڈنا تھا۔ اور انجکشنی جوانی کا زور اور ارا دونوں میں
توت کہ زمین میں ٹھوکر بھی ماری تو پانی نکال چھوڑا۔ اور پھر رونق وین
جیسی ماں کی تربیت۔

خاندان کے بچے پڑھنے کہا بھی۔ "ارے یہ کیا ماہ نکالی ہے جی۔
موتی یہ جاننا کون کون کے لئے ہے آخر؟"

مگر نئے دلوں نے تو اس کا نسا، اس کا نسا اڑا دیا اور سچا
نڈی و لہن، کہ تعلیم یافتہ ہونے کے کارن خود ہی بدنام تھیں۔ اور
جی حوند سے پرچہ گئیں کہ جیسی خود تھیں ویسے ہی ادا ہو گئے
بھی اشیا۔

اللہ و حق و لہن بچارسی کے نام کی ناموسی اب توب کی بھی نہ تھی۔
دیجے ان کا لہن چلتا تو جسنے کیا کیا کر ڈالیں، عمران حویلی والوں
لے تو کسی کی سیدھے منہ بات نہ سنی۔ ظاہر میاں یہی کوئی چار
چہ بر سر کے ہوتی تھے کہ بڑی مندرتس النساء کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی۔

ادنیٰ بھی ایسی کہ ناک کا ٹھکانہ نہ آ نکھکا پتہ۔ اور پھر ادھر ٹھکانہ
 جیل سے کہ اندھیرے آ جائے کھرٹا کر دھڑکھڑسا راجگڑا اٹھے۔ وہ
 حنائی گویا دیکھتے چاند سورج نے دیکھا جو ٹر دھکتے پیچھے تھے دھکتے دھکتے
 بسی۔ باپ تو سپر سی دہن کا کہا مانا جاتے۔ مگر ساسا سسر نے اپنی
 ہی کر کے چھوڑی۔ اب رونق دہن ہے یہ صدا اُٹھ رہا کہا جا رہا ہے۔
 "اسے فند کی بیٹی مانگو رونق دہن۔ یہی تو دن ہوتے ہیں کہ
 اپنے والوں کو سمیٹا جاتا ہے۔" رونق دہن نے فند کی بیٹی کی طرف
 دیکھا اور پھر ہار میاں کی طرف۔ بولیں۔

"اماں جان۔! آپ بھی غضب ہی کرتی ہیں بس۔ بھلا یہ بھی
 کوئی جوڑ ہوا۔؟"

دہن تو مان بھی جانتی صورت شکل اللہ کی دی ہوئی ہے،
 مگر جانتی تھیں تعلیم کے نام سے کور سی ہی رہی لڑکی۔ بس زبان ہانا
 غضب ہو گیا۔ اسے لوا ماں جان نے تو پاس پڑی سلیم شاہی جوتی
 اٹھائی اور وہ وہ جڑتے مارے ہیں اپنے آپ کو کہ دہن بیچارہ کی
 کانپ گئیں بھلا انہوں نے کسے کو دیکھے ہوں گے ایسے تماٹھے! اور
 پھر ماں جان نے کوسنوں کی بوجھار کر دی اپنے پیاروں پر۔
 "ارے تو مانتو بھر کا ہوتا تو چلا جاتا۔ عجز بھر کی کفنی ہی کافی
 ہوتی۔ یہ دن کیوں دیکھتی کہ میرے ہوتے۔ میرے بیٹے جی نات کا
 بیل بنا چھو رہا ہے۔"

اور اللہ گواہ ہے رونق دہن نے کبھی بھولے بھی ڈرا ہمارا
 اپنے میاں سے کوئی بات سوائی ہو۔ وہ تو آپ چھوٹی مٹی تھیں، جو

میاں نے کہہ دیا وہی سن لی۔ ہاں ایک برائی لاکھوں کی تھی کہ کتاب
پڑھنا آتا تھا۔ اور فلم چلانا بھی۔ اور اسی مارے نوپور سے خاندان
میں تنقوتنقص کی اس زمانہ نمود کیجھو کیا آن دکاہے۔ وہ حویلی
والے جعفر میاں کی بہو کا ڈھنگ دیکھا۔ پھر یہیں سمجھتی ہے اپنے
بچے والوں کو۔ غیر کم سے بہو میں لاؤ گئے تو یہی کچھ ہوگا۔
بہو نے جو یہ اندھی اپنے سر چلتی دیکھی تو گھر کے میاں کی
طرف دیکھا۔ کیوں جی! بیٹا آپ کا، بیٹی آپ کی۔ مانگ سکیوں

اور میان نے اس انداز میں کہ چلیے کوئی میت کے سر ہانے
کھڑے ہو کر انا اللہ وانا الیہ راجعون پڑھئے۔ کہا۔ "اماں
جان شسو کی بیٹی میرے ظاہر کو دیدیکھے ماما؟" اور اماں جان
نے جھوٹ موٹ کے آنسو اپنے پلوں میں جذب کئے اور وہیں بیٹھے
بیٹھے ناریل پھوڑ دیا۔
اے لو بات کی سبھی ہو گئی۔

اب بڑی ہونکرم غم النساء ایسی بری سبھی نہ تھی۔ اور سچہ جوانی کا زمانہ تو وہ ہوتا ہے کہ لنگر سبھی حور نظر آتے ہیں۔ اور سچہ غم النساء کے تو خوب ہی ہاتھ پیر نکالے تھے۔ اب نہ ہی صورت کی بات، تو وہ اللہ کی دین ہے کسی کو یوسف ثانی بنا دے اور کسی کو اٹلے تو لے جیسا۔ ویسے ایمان کی پوچھو تو غم النساء کا فدا رنگ ہی سہی نہ لگتا۔ اور آنکھیں ناگ تو جوانی میں اپنی اپنی جگہ درست ہی نظر آ رہی تھیں۔ مگر یہ ضرور تھا کہ طاہریاں کے بازو بٹھا کر دیکھا جاتا تو اندھا بھی

مٹول کر کبہ اٹھتا۔

”جوڑی جوڑی کی نہیں۔“

کہاں تو ہا ہر میان بغداد کے خوب رو شہزادے کی طرح اچھے چمڑے، سہاری سحر کم اور یہ جشن شہزادی کی کینز کی طرح بھی سہائی ضرور، مگر پھپھکی پھپھکی سی۔ بن نمک کی روٹی میں جو مزہ ہوتا ہے وہی نجم النصار کی صورت سے ظاہر تھا۔ اور پھر لپوں تو بندریا کو بھی اڑھنا پہنا دو تو سندہ پا لگتی ہے، اور یہ تو آدم زاد ہی تھیں۔

سعادت مند سی تو ماں کی طرف سے درختے میں ملی تھی۔ ظاہر میاں لے حویلی کی چلنوں میں سے دو ایک بار بونہی جھپکے لپکے نہیں نجم النصار کو دیکھا بھی، مگر اپنے ~~میں~~ کہ ماٹوں کی نیند میں اڑ گئیں ہوں اور دن کو خواب نظر آنے لگے ہوں۔ بس دیکھا۔ مگر نہ دیکھنے کے برابر۔ اتنا غرور جانتے تھے کہ شادی انہی سے ہونی ہے۔ ہاتھ پاؤں چلاتے تو شاید کچھ بات بھی بنتی، مگر اس کی بھی ضرورت انہیں محسوس نہ ہوئی۔

اب تو بس یہ مہول تھا۔ صبح سویرے ہی اٹھے، حویلی کے ساتھ دوسرے باقیے میں چھپ چھپ کی۔ نہاد و حونا شستہ کیا، چائے پی۔ کون کاندھے پر اور اسٹیکسٹوپ گلی میں لکھا، کار میں بیٹھا یہ جاہد آیا۔ اسے بچے جلدوں کا زمانہ تھا۔ ہلی ہلی سرویاں تھیں۔ گریما کی آمد آمد تھی۔ رہنما بیاں تان تان کر کروں میں گھس گھس کر سونے والے بھی والوں کی طرف کھسکے آ رہے تھے۔ اور یہی زمانہ اماں جان کی نظر میں وہ زمانہ ہوتا ہے کہ شادیاں رچائی جائیں بھرے

جاڑوں میں شادیاں رچنا تو اماں جان کو کبھی دسجایا۔ کبھی نہ۔
 ”ارے دلہنوں پر ذرا تو ریت نہیں ہوتی۔ سروی گئے چاخوں
 سے اچھی خاصا صورت ہوئی جوتی کا تہ بن جاتی ہے۔“

اور گرمیوں کی شادی انہیں یوں ناپسند تھی کہ جہانوں کے
 جھوٹے دہن اپنے پسینے میں آپ نہا جاتی ہے۔ اور محسنے بڑا
 جاتی ہے۔ اپنی بڑی بیٹی کی شادی وہ بھولی تو نہ تھیں کہ پیچاری
 رات بھر میں دو دو تین تین مرتبہ بے ہوش ہو ہو گئی تھیں۔ اماں
 جان تو گرمی گرمی کا رونا روتی تھیں اور کہنے والیاں منہ میں پلو
 ٹھونس ٹھونس کر کہتی تھیں کہ گرمی گرمی کچ نہ تھی، ان کے میاں
 تھے کہ ان پرستی ہوئے جاتے تھے اور نوا اور ہونٹوں کی مسی تھ
 چوس ڈالی تھی۔

ولایت سے آکر بھی طاہر میاں کا ڈھنگ نہ بدلا تھا۔ وہی
 تھے، بائکل وہی۔ ورنہ آنے والے ساتھ میں ایک میم تو اٹکا ہی لائے
 ہیں اور ادھر سے پورے صاحب بہادری کے ماں باپ، بھائی بھند
 سے بھی وہی گٹ پٹ۔ مگر طاہر میاں وہی سو م کی ناک تھے اداں
 ادا دای کو یقین تھا کہ غم ان کے ساتھ لکھنؤ لکھنؤ گرمی جاتی
 حویلی والوں کے متعلق تو پرانی بات تھی کہ عظم جھوٹے عورتم
 نہ جھوٹے۔ شادی کی تاریخ مقرر کرنے والوں کا منہ تو کھلا ہوتا
 ہی ہے اور اچھے موقعوں کی انہیں توجہ رہتی ہے کہ کوئی کمی نہ یا وئی
 ہوا ورنہ منہ چلائیں۔

لال لال منہ پر ایک طرف جیدر میاں، دوسری طرف طاہر

میاں، بیچ میں رونق دہن اور پھر دس پانچ سہا گئیں۔ اور پرے
کولے پر اٹھ جانا۔ اور حویلی بھر کی لڑکیاں باہیاں تو ہر دم رہتی ہی
تھیں کہ حویلی طے اور وہ اپنے دو بیٹوں میں منہ چمپا چمپا کو نہیں۔
اماں جان گھڑکیں اور وہ ناز و انداز سے لڑکوں کی طرف دیکھ
دیکھ کر لیٹا تھا۔

اب جو تاریخ کی بات اٹھی تو طے ہونے میں ہی نہیں آتی۔
اماں کچھ کہتیں اور بیٹے کچھ کہتے اور سب سے الگ ہی سناتیں۔
”اے یہ تاریخ تو غس ہے۔ دیکھتے نہیں جو میاں کی دہن
جو تیرے پیٹے ہی رانڈ ہو گئی۔“

”ادنی دور پار، اللہ ذکرے کوئی مدار میں سر جوڑی کرے۔“
اماں جان بکنے جھکے پر اتر آئیں تو ہاں میاں کو ٹھٹھٹھول سو جھی۔
”کیوں دادی اماں! اگر تیرہ تاریخ رکھیں تو۔؟“
دادی اماں نے سو کھیں مارے ہاتھ سے ان کا منہ بند کر دیا۔
”لو کئے تیری مت ماری گئی ہے۔! اب سے دہرانا تو ذرا۔“
کبھی کسی نے منہ سے بھی نکالی ہوگی تین تیرہ، نو باٹ کی بات؟ ہاں
اب سے جو کہا ہو تو کیا تو نہیں یا میں نہیں۔“

”ایسے واہ دادی اماں غضب کرتی ہیں آپ سبھی۔ بھلا ہوگا۔
کیا۔؟ ایک تجربہ ہی ہے۔“

”ارے چل ہٹ۔“ اور اماں جان نے سکانوں میں انگلیاں

دستے ہیں۔

کہاں تو ہاں میاں مذاق کی جون میں تھے کہ اک دم تکیے ہو کر

بولے ۔

”اگر میری سمجھ میں نہیں آتا ہمارے خاندان سے یہ جہالت
 دور کیوں نہیں ہوتی۔ اب بھلا تیرے تانتے اور میں تار تار میں کیا
 رکھا ہے۔“
 بھولنے ساس کی طرف دیکھا، ساس نے بیٹے کی طرف دادی
 پھر چلائی۔

”اے رہنے دے تیری تعلیم۔ ہم تو انہی سی کر سکیں گے۔“
 ”سب دن خدا کے بنائے ہوئے ہیں کسی بندے نے تو نہیں
 بنائے نا۔ اگر میری شادی ہوگی تو جمادی الثانی کی اسی تیرہ تاریخ
 کو، ورنہ نہیں۔ لات مارتا ہوں ایسی جہالت بھری شادی پر۔“
 اور وہ مسند الاٹکتے، جوتا کھٹ کھٹاتے اپنے کمرے کو ہولے۔
 ایک بار طاہر میاں نے انگلیں جاتے وقت ضد کی تھی، اور
 ایسی ضد کی تھی کہ دادی کو ناکوں چنے پیوادیہ تھے۔ بس یہی کہتے
 تھے جاؤں گا اور ضرور جاؤں گا۔ ایک طرف تو چچاؤں، ماموں
 اور دادی، نانی کی پلٹن تھی۔ دوسری طرف یہ اور لے دے کے
 رونق دہن۔

”میاں تم کوئی لوٹری ساتھ باندھ لاؤ گے، پھر ہم کیا کریں
 گے۔“ چچا نے کھلم کھلا مخالفت کی وجہ بیان کر دی۔
 ”آپ نے مجھے بچہ سمجھ رکھا ہے۔“ طاہر میاں جھلکے بولے۔
 ”اے میاں بچہ نہیں سمجھا تبھی تو کہتے ہیں۔ اور کیا بچہ ساتھ
 میں میاں لایا کرتے ہیں، جوان ہی تو لاتے ہیں۔“

چار دن دانہ پانی بند رہا اور جیت انہی طاہریاں کی ہونی تھی۔ اور ہونی۔ معلوم تھا کون سی ماں کا بیٹا ہے۔ وادی نے ہستی آنکھوں سے بیٹے کو دیکھا۔

”موا جنم کا صدی ہے۔ اسے جید میاں رکھ دو تیرہ ہی مار تیخ گھر لے گا اس کا لے گا، ہمارا کیا ہے۔ آج مرے کل دوسرا دن۔ ہاں نگہ سن لینا آنے والی سر پہڑ کر روئے گی۔“

شادی جمادی الثانی کی تیرہ کو طے پا گئی۔ اس دن شہر النساء کے پاس مٹھائی، گیارہ اشرفیاں اور خیم النساء کے لئے ایک جوڑا بھیجا گیا۔ سر جوڑی کا۔ زرتار کا کھڑا دو پیٹہ جس پر حجم حجم کرنا رو پہلی ٹیپہ نکلا ہوا تھا۔ تار بانے کی ہری ہری چولی کرتی۔ کھواب کا آڑا، پاجامہ۔ ادھر سے بھی جوابی کار روائی ہوئی اور اس دھوم دھڑکے میں رات کے دس ساڑھے دس بج گئے۔ طاہریاں لاکھ ناں ناں بھی کرتے رہے مگر چٹکرا رہا بھلا کیسے مل جاتا۔! حویلی میں انہی تینوں پر توڑ کے لڑکیوں کو اودھم مچانے اور نظر بازی کرنے کا موقع ملتا ہے۔ طاہریاں پھولوں کی جھالیں ہلاتے اپنے کمرے کو بھاگے ہلتی گرمیوں کے دن نیچے۔ وہاں بھی وحشت ہو رہی تھی۔ پٹ پٹا کر پھپھو اڑنے کی انگنائی کی طرف دوڑے، جہاں سکون ملنے کی امید تھی، مگر یہ کہاں معلوم تھا کہ وہیں سکون لٹ جائے گا۔

اماں جان اپنے اصولوں کی تیری پابند نہیں۔ جو چاہتیں وہی کہیں۔ لوگوں کا کہنا سننا تو ایک طرف رہا۔ اللہ جنت نعیمہ پر ہے اپنے بیٹوں کی سچا سچی دینی۔ حویلی بھر میں وہی وہ باجی تھیں۔ بڑی

وضع جاری رہی تھیں، ایک اصول ان کا یہ بھی تھا کہ نوکروں کو جانور
 سمجھا جائے، ہر قسم کی زیادتی و لادری کے لئے ذلت منشی۔ نوکروں کی
 کے باورچی خانے میں پکا ہوا کھانا نہیں کھا سکتے تھے۔ حویلی کے حاملوں
 میں نہیں منہا سکتے تھے۔ کمرے سے ملحقہ دالانوں میں نہیں سو سکتے تھے۔
 پچھواڑ سے بیجا و تبرکھا میر چو ترے تھے جہاں ان کی بیچ ہوئی۔ جباروں
 گرمیوں کی کوئی شخص نہیں نہ تھی۔ ایسے حویلی کے مسرار لوگ اتنے مہربان
 تھے کہ نوکرا بیوس اور ملاوی کو اپنے کمرے میں بلا بلا کر پناہ دیتے تھے۔
 اپنے سامعوں میں منہانے کی اجازت دیتے تھے۔ اب یہ اللہ کو معلوم
 یا ان کے دلوں کو کہ اس میں ان کا انہا کوئی قائد دستایا نہیں، مگر
 تھے بڑے مہربان۔ ۱

اتنی لمبی حیرلی چو سدا ہادر تھی تھی اس میں اتنا سکون تو تھا ہی تھا کہ وہ میں کسی کو نہ کہہ سکے میں بھیج کر لپ چھپ نہایا جائے۔ اسی لئے بچہ کرایاں عمو مارا توں کو مہندی کی ہار سوں میں دوپٹے تھان کر نہایتیں کہ اس وقت کسی خطرے کا اندیشہ نہ ہوتا۔

ظاہر حیاں پھیلاڑے کی سنگینی کی قربت چل دیے۔ پہلے تو
ہاگراک دم بیچنے کی بیچ کھڑے ہو گئے، گویا چوری کر کے آنے ہوں
اور سکون لئے پر دم لے رہے ہوں۔ پھر جب ہوش ٹھکانے ہوئے
تو چل قدمی شروع کی۔

کیا فقیہیں ہیں یہاں سے کہیں سے جو ان کے لئے رہنمائی دے سکیں اور
 ٹھیکے جائے۔ آسمان پر چاند تھا، سورج تھا، مگر وہ فقہار نہیں جو ان کے
 ٹھکانے سے ٹھکانے جھونکے، جو یہاں سے وہاں کی کئی سیڑیوں کی ہنسی ہنسی

خوشبو نسلی۔ ہنگاموں سے دور۔ ظاہر میاں کو مہی سکون اور فضا کی
ضرورت تھی۔ کتے کی طرح ناک اٹھا کر انہوں نے ہندی کی خوشبو اپنی
ناک میں بھر لی تھی چاہی۔ اسی لمحے انہیں احساس ہوا کہ پیچھے سے ٹراپ
نظر آ رہی ہے۔ جیسے کوئی لوٹنے سے بدن پر پانی ڈالے۔ کونے
میں ہندی کی گنگھان جھاڑی تھی۔

”اوہ نہ! ہو گا کوئی۔ مجھے کیا پڑے کہ جہانگتا پھروں۔؟“
پھر وہی پہل قدمی۔

اتنے میں ایک سڑکی سی آواز آئی۔ ظاہر میاں اگر شاعر ہوتے
تو اس لمحے ضرور ہی کوئی اچھوتی تشبیہ سوچتے اور شعر میں ڈھال
لیتے۔

”ٹوٹے رے بدن۔

چھیڑے رے پون۔

”سُسنڈا سُسنڈا پانی مورے۔۔۔۔۔“

آگے چل کر آواز ڈوب ڈوب جاتی تھی۔ غالباً نہانے والی
پانی کے بدن پر گرنے کی کیفیت کو گیت کے بولوں میں بیان کر رہی تھی۔
ظاہر میاں سُنندہ دُچار ٹرے بڑے قدم ڈالے اور ہندی کی
ٹالیوں میں منہ گھسا کر ادھر جھانکا، اور بس جھانکنے ہی رہ گئے۔ گوری
کو وہی گوری پیٹید پر ہالی، کھٹے تھے سپنولیوں ایسے ہالی، سجیلے سجیلے،
نپترہ قطرہ پانی ٹپکتا ہوا، گویا موتی ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہے ہوں۔ ہندی
میں پ ہ ہالی جو پیٹید سے چپک کر پیٹید کا ایک حصہ ہو گئے تھے۔ یہی
ہاتھ اٹھا ہوا۔ ہاتھ میں کالسی کا بدو صنع لوٹا۔ ٹوٹے میں سے گرتا

ہوا پانی۔ منہ میں گہمت۔ اور گہمت کے پل۔

”چھیڑے رہے پون۔

جیسے نروٹی سجن۔

ٹھنڈا ٹھنڈا پانی مورے.....“

پاس دھری ہوئی بھلوئی میں لوٹا ڈولتا۔ ابھرتا۔ پھرتا
منہ کی ڈال اب ہاتھ اٹھاتا اور شرٹا پسے سارا پانی سر سے
ہٹتا ہوا پورے بدن پر گر جاتا۔

مہندی کی جھاڑی سرسرائی اور نہلنے والی پٹی۔

”اولیٰ بھرے سولا۔“ پاس ٹہری حیدر کوٹا سیدھا پلٹی

لیٹاتی مڑ مڑ کے بھیتی وداک دم دالاں والے چپو تروں میں گم
ہو گئی۔

مہندی کی ڈال اب تک ہاتھ میں تھی اور ہا ہر میاں کو تو

صرف اتنا یاد تھا کہ نہانے والی نے جب پلٹ کر دیکھا تھا تو اس

کا کنگہ چاندیابا تھا۔ آنکھیں ٹہری ٹہری بادام ایسی سفید۔ گالوں

پر کئی ٹھیری ہار کے سیبوں کا دھوکا ہوا تھا۔ اوسا یک جھٹکے

سے جب اس کے بال منہ پر آ گئے تھے تو اسی لمحے چاند بھی بدلیوں

میں جا چھپا تھا۔

اور یہ سب کچھ ایک لمحے میں ہوا تھا۔ اور اسی ایک لمحے میں

صدیاں بیت گئی تھیں۔

اور شاہیدت بعد ایا موقع آ یا کہ ہا ہر میاں اس دن صبح

ہاسپٹل نہیں گئے

حولی میں ماماؤں، کنبڑوں اور چھو کر یوں کی کھی نہ تھی۔ اور سچڑی
سے لگا ہوا امام بارگاہ بھی تھا۔ ون کی روشنی میں سبھی دہاں کھیل کھیلے
جاتے اور رات کو خیر تار یک ہوتی ہی ہے۔

تہ نہیں کوئی سے درخت کا پھل تھی شبو، مگر تھی تاروں میں
چاند۔ اور اسی چاند کی چمک نے طاہر میاں کی آنکھوں کو کھلا کر
رکھ دیا تھا۔ ڈاکٹر تھے۔ ہزاروں کا علاج کیا اور کر رہے تھے۔ اب
جودل پر ہاتھ رکھ

کہ پڑے تو کوئی حکمت کام نہ آئی۔
اماں جان کا ایک اصول یہ بھی تھا، اور اچھا ہی اصول تھا۔
کہ جہاں حولی میں کوئی چھو کر سی جوان ہوئی اس کے ہاتھ پیسے کر دیے
اس پر سبھی کھیل کھیلے تو اس کی نیکی بدیا اس کے ساتھ۔

اللہ رکھی کی شادی اماں جان نے تیرہویں ہی برس کر دی تھی۔
کنجوت کے ہاتھ پیرا ایسے تھے کہ بیس برس کی معلوم پڑتی۔ نصیب تو
کسی کے بس کی بات نہیں۔ شادی کے سبب سے ہی دنوں بعد مرد
چل بسا۔ وہ آجائے پھر اماں جان کے گلے ہی پڑی۔ حولی میں ایک
خان ماں بھی تھا۔ اچھا تھا بے چارہ ہاں زندہ، آخر وہ تھا۔ اماں
جان نے چارہ دونوں کے سر جوڑ دیں، مگر اللہ رکھی نے ہاں نہ کی۔
”ہمارے تنکیر کی بات نہ تھی میگم صاحب! اب تو ہم یونہی
اچھے ہیں۔“

جوانی اور چاندنی۔ سات پردوں میں سے سبھی چھٹی پڑتی ہیں۔
اللہ رکھی کی جوانی بھی ایسی دیسی نہ تھی۔ چلتی تو زمین ہدرتی، بیٹھتی

تو چار پائی تک جہیز بول دیتی۔ کون آنکھوں سے سمجھتا، کیا تھا۔ کہ ایسے دیکھتے چمکتے ہیرے کو دیکھتا اور اچھے تاج کے کاہنیت نہ بنا لیتا۔ بڑی ہارسائی بھی تو ایسے موقعوں پر کام دلاتی۔

اماں جان کا یہ بھی دستور تھا کہ جہاں حویلی میں کسی چھو کری چھا کری کی جنائی ہوئی اور یہ جا پہنچیں موقعہ وار دات پر۔ حویلی والی مسجد کے امام صاحب کو ہوا کرکان میں اذان پڑھواتیں۔ بڑی سی ایک کتاب نشی۔ جبرنا، اس میں بچے کی ماں اور باپ کا نام درج کر داتیں۔ یہ بہت پرانا دستور تھا اور ایسی کئی کتابیں پڑی تھیں۔

اللہ کسی بیٹے بچائے لگے لگی۔ چلتی تو یوں جیسے بوجھ سر پر پاں پڑا ہو۔ بیٹھتی تو یوں پس سر پہر کہ جیسے مہینوں کی ٹھکی ہوئی ہو۔ مرد کا کیا چپ بھی جاتا ہے، مگر عورت کا کیا چھپ نہیں سکتا۔ کس بخ نے یہ تحفہ عطا کیا تھا۔؟ یہ تو اسی کا دل جلنے۔ مگر والان والے چوڑوں پر ایک دن جب ہائے ہائے جی تو اماں جان جا پہنچیں اور بس ششک کہہ رہی رہ گئیں۔ اذان تو کان میں جوں توں پڑ گئی، مگر باپ کے نام پر اللہ کسی کی زبان نہ ہو گئی۔

”اسی بولی جھنال اس کا باپ کون ہے۔؟“

”اس حرام کی پوٹ کو جنتے ہوئے تجھے شرم نہ آئی۔؟“

کس کی مت ماری گئی تھی کہ جرم قبولنا؟ منو ہی آنتو تھے۔ کہ پیچے چلے آتے تھے۔ مگر آنسوؤں نے کب کسی کا راز کھلا ہے۔؟

حرام کی پوٹ بڑھتی گئی۔ جھنال، حرامزادی جیسے ناموں سے نوازی گئی۔ چھو ساں کی ختی کہ ماں مر گئی۔ ماں مرے پاس وقت ایسی

بلک بلک کر روتی تھی کہ کلیجہ سچا پڑتا تھا۔ جس نے جہاں ہاتھ پکڑ کر بیٹھا وہاں بیٹھ گئی۔ دیکھا دیا سو گئی۔ اماں جان تو اس کے نام کا پتہ کیا کہا نہیں کرتے والے تو کیا کیا نہ کر گزرے تھے۔ مگر یہ ضرور تھا کہ کتاب میں سبھی کے نام مع ولدیت کے درج تھے۔ یہی پیاروں پیشی تھی کہ مہیا بنی پھرتی تھی۔

جوانی آئی تو وہ رنگ روپ نکالا کہ کتاب کی نگلیوں کو بھی مات کر دیا۔ کلیاں تو سب سے مرعوبہ جاتی ہیں، اس کی جوانی تو سدہا بہار تھی۔ کلیوں پر شبنم پڑتی ہے تو پھل جاتی ہے، اس کے بدن پر گر کر تو شبنم کو بھی پھلنے کا یا مانہ رد جاتا۔ بنجاروں جیسے موٹے جھوٹے کپڑے بلبلی چدر اور چاندی کے یہ بڑے بڑے لٹکتے جھمکتے باسے پہنے جاتی تو دیکھنے والے دیکھتے اور پھر نگاہ نہ تھتی۔ طاہر میاں کی نگاہ بھی تو ایسی پڑی تھی کہ جسم کہی رہ گئی تھی۔ اور طاہر میاں نے اسے دیکھا اس روپ میں تھا۔

اس انداز سے بدن سکڑے بیٹھی تھی کہ آجائے لہا بیٹھ ہی بیٹھ نظر آتی تھی۔ یا پھر عریضیام کی عراچی جیسی گھر دن کل ود پھیلنا حصہ جہاں بالوں کے حال سا بکھپا رکھا تھا۔ یا پھر وہ پھلنی ہوئی چاندنی بھرے ہوئے ہاتھ۔ جن میں کالسی کا ٹیڑھا میٹرھا کٹورا تھا۔ !!

چوتھے دن طاہر میاں نے ہسپتال کا رخ کیا۔ ایسے مرے مرے بیٹھے تھے جیسے جان ہی نہ ہو بدن میں۔ دوسرا ساتھی ڈاکٹر تو تیز دھی سے غور توں کو دیکھتے ہیں مشغول تھا، یہ دیکھ ہی جیسے اونگھتے اونگھتے

چھتیاں سیاہ کر رہے تھے۔

اک دم اس بے لگاؤ پر۔ ”بھئی ظاہر دیکھنا ذرا۔ ایسے کیس آجائیا تو بڑی شکل ہو جاتی ہے۔ بتاتی ہی نہیں کچھ یہ لڑکی۔ بس پیٹ پکڑے کھڑکا ہے۔“

ظاہر میاں نے ادھر اچلتی سی نگاہ چھینکی اور اک دم جنم جنم کی بند سے جاگ پڑے اور پانی کی لہروں میں ہلکورے لیتا ہوا گیت ان کے ذہن کے افق پر ابھرنے لگا۔

”ٹوٹے رے بدن۔

چھوٹے رے بون۔

جیسے نرونی سجن

ٹھنڈا ٹھنڈا پانی مودے.....“

گھر پہنچ کر ظاہر میاں نے جب نرونی کا رخ کیا۔ ”وہ بیار ہے تو پھر یہ ڈاکٹری کس کام کی؟“ کوٹ کا ندھے پر اسٹیٹس کوپ لگے ہیں۔

”ارے بھئی شہر میں بیاریاں پھیل رہی ہیں، کوئی بیار تو نہیں یہاں۔“

سارے نوکرسٹ پٹھے۔ سرکار لوگوں نے انتا کر م نوکریں دیکھا ہوگا۔

چھوٹے میاں خود اپنے قدموں چل کر آئے۔ وہ تو اپنا دل ہی بچھا دینے اور دوڑ کر آنے اور سنانے لگے اپنی اپنی۔

ایک سوکھی سڑی سی دف کی ماری بڑھیک کے کا ندھے سے لگی لگی۔

وہ بھی آئی۔

”اے میاں۔! تمہا ہے صبر کے، دیکھو جو چرا۔ اللہ ماری کا جملہ ہی ٹھیک نہیں۔ ساری رات کھا دیں صبح کے ہے۔“

”تیرا نام کیا ہے۔“
 ”شیمو“ جیسے بالسنری بچ اٹھی
 جوہلی میں گلا شبنو کے جتنے پودے تھے سب اسی لمحے اپنی تازگی
 اور بہار کھو بیٹھے۔

”شادی ہو گئی تیری۔“
 وہ تو دوسری ہی ہو گئی اس سوال پر۔ بدن جما کر ہا ہر میاں کو
 ایسے کورے کورے دیدوں سے دکھیا کہ ہا ہر میاں دوسری بار مر گئے
 سیکھ: جاڑوں میں کہ ہلکی ہلکی سروی اور مہکی مہکی گرمی مل جل کر
 موسم کو عجیب پر کیف بنا دیتی ہے، یہی لہکا ہوا موسم ہا ہر میاں کو
 جیسے اٹھا روں میں لا ڈالتا۔

بڑے پیر کی نیاز کو اماں جان سال کے سال بڑے دھوم دھام
 سے کرتیں۔ اس دن تو ہا ہر میاں کو بھی ہاسٹیل سے چھٹی لینے پڑی۔ تیرا
 دنوں تو ہا ہر میاں چھٹی پر ہی تھے۔ شادی میں چار دن ہی تو وہ گئے
 تھے۔ شادی اور نیاز کی گڑ بڑ نے مل کر پوری جوہلی میں ہنکا مہ پیدا کر دیا
 تھا۔ اماں نے اب کے یہ جتن کیا کہ ایک ہی بار دو کارسلٹھ جائیں۔

شادی کے دن دانے کھانے کے ساتھ نیاز کی دیگ بھی اتنی فقی
 لپ جھپ، سرسر۔ آنچل ہی آنچل، رنگین جیسے قوس و قزح۔ سارا دن
 دن یہی گڑ بڑ رہی۔ ہا ہر میاں تو دل پکڑے بیٹھے تھے۔
 دہا دہن کا منہ جھوٹا لے، میلہ دے کی رکابی پکڑے شبنو والا
 سے نکلی ”لو آج دم لو کھڑا گئی۔“

”سہ۔۔۔۔۔ سہ۔۔۔۔۔ سہوت۔“ وہ پوری طاقت سے چلائی۔

موت و دوت کچھ بھی نہ تھا۔ ظاہر میاں تھے۔ لیلہ کے مجنوں بنے ظاہر
میاں اندھیرے اجالے کوئے کوئے اے کسوچتے پھرتے تھے۔ بلبلے
وہیں چوتھے پر بکھر گیا اور اکدم ظاہر میاں نے اسے بانہوں میں
سمیٹ لیا۔

”چھوٹے میاں۔!“ اس نے بوکھلا کر پوچھا۔
”ہاں ہاں۔ میں نہالے کے لئے ادھر ہی چلا تھا۔ ابھی نہ سنبھالتا
تو بڑی پسلی چوراہو جاتی۔ دیکھتی نہیں چوتراہ کتنا ادنیٰ ہے۔“ اور
پھر تو ہے بھی تو بڑی موٹی سی۔ تپہ بھی نہ چلتا۔“
اتنی ساری باتوں کے جواب میں وہاں بس سالنوں کی میٹھی
میٹھی آواز۔

”اچھا! تیری شادی ہو گئی رہی۔؟“
”اوہنوں۔“ اس نے پتلی سی گردن کو زور کا جھٹکا دیا۔
”چھرا اس دن مشرما کیوں رہی تھی۔؟“

”ہوئے والی چھ ہے۔“
”ہائیں! مگر کس کے ساتھ۔؟“
”کلو کے باپ ساتھ۔“ وہ دونی آواز سے بولی۔
ستون کی آڑ سے کھینچ کر ظاہر میاں اسے بھرپور آجالے میں

لے آئے۔

”ایں! کلو کے باپ کے ساتھ، یا کلو کے ساتھ۔؟“
”اوہنوں۔“ وہ سمجھا کر بولی۔ ”کلو کے باپ کے ساتھ!“
”ارے اس بڑے کے ساتھ۔؟ کلو خود تو تمہیں چاہیں گے۔“

پھر اس کا باپ؟ گما ساسی کے ساتھ کیوں؟

"نانی نے لگائی ہے ہماری بات، ہم کیا کریں؟"

"ہونہ۔" طاہر میاں نے اس کا منہ چڑایا۔ "نانی نے لگائی

ہے ہماری بات! تو تو کچھ نہیں کر سکتی۔"

اس نے بس آنکھیں اٹھا کر ہی تو دیکھا تھا۔ اور اس لمحے طاہر

میاں کو میلی باریہ احساس ہوا کہ عورت کی آنکھوں میں مطلوبیت کے آئینہ بروں تو مرد آگ میں بھی کود سکتا ہے۔

"تجھے پسند ہے کلو کا باپ۔"

"مرے سو رکھنا اور بہارا کال پیٹے۔ آتے جاتے رانی کہہ

کہہ کر چھوڑے ہے یہیں۔"

"ہوں تو یہ بات ہے۔"

"اچھا جانے دے یہ ذکر، یہ تباہ پلیٹ میں کیلئے جا رہی

تھی تو۔"

"اے ہے آج بھی نہیں مالوم۔ شادی کے دن دو لہا دلہن

کا منہ نہیں جھوٹا تھا۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے؟" طاہر میاں نے بن کر پوچھا۔

"کیا ہوتا ہے بس....." اور شبو لا جوتی بن گئی

"رشتہ پکا ہو جاتا ہے۔"

شبو اپنی چادر میں دوہری ہو گئی اور طاہر میاں آگ میں کود

پڑے کہ اس پھول کو بچالیں۔ ادھر ادھر مار کر انہوں نے چپوڑ

پھینکا ہوا طبلہ سمیٹا اور نوالہ بنا کر شبو کے منہ میں ڈھونڈ دیا۔

شہر ممنوع تل

سارا جھگڑا یہ تھا کہ نوری کی گوری گوری پنڈلی پر اٹھ گیا تھا۔
تل تھا۔ مگر یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ مہنتوں کی پنڈلیوں پر اٹھ گیا تھا۔
اصل جھگڑا یہ تھا کہ مدن میاں نے نوری کی پنڈلی پر اٹھ گیا تھا۔
اصل جھگڑا یہ بھی نہ تھا۔ بات دراصل یوں تھی کہ نوری کی پنڈلی
کے تھ سے مدن میاں نے اور بھی کئی سلسلے ملائے۔ کچھ یوں سوچا کہ ہو سکتا
ہے نوری کے اور بھی کئی جگہ تل ہوں۔ مثلاً کھیلے گئے کے کرتے میں سے
جو گوری گردن نظر آتی ہے۔ اس کے آثار پر کسی خوبصورت تصویر بنائی جاسکتی ہے۔
یہاں کوئی چم چاتا تل ہو۔ اور بس ادھر ادھر کے خیال جو آئے چلے گئے تو
انہوں نے کہہ سن کے اپنی ماں کو راہنی کیا اور نپیرہ ہی دلوں کے اندر
اندر چٹ مٹگنی پٹ بیاہ کر دالیا۔

اور یہ سب کچھ ہوتا بھی ناں اگر اس دن مدن میاں کا ادب
کے نواز پڑھنے کو جی نہ چاہ جاتا۔ لب بھگ چارپانچے بچے کے ہنڈی میں
انہوں نے عمر کی نماز کے لئے لوٹا اٹھایا، پانی بھرا اور وضو بنانے بیٹھ

آنگن جا بیٹھے۔ آنگن کے بازو دیوار سے تکیا۔ دیوار سے لگ کے بیٹھا تھا۔
چھتار درخت تھا۔ جس پر دنا دلی پتھر برس رہے تھے۔ ایک بیرپٹ سے
آکر ان کے سر پر لگا۔ انہوں نے سر نہ ہٹرایا۔ دوسرا بیرپٹ سے آکر
ان کی پیٹھ پر گرا۔ انہوں نے نن تناکہ منہ پھیر کر آدھ کالی کبھی ہی چاہی
سنی کہ ترپٹ سے ایک بیران کی ناک پر آگرا۔ اب تو ان کا معمول چھلک
گیا چلا کر بولے۔

”کون تیس مار خانم ہے یہ۔ ہٹانگ سیدھی کر دوں گا اسی آئے۔“
معلوم تھا گھر میں سوائے لڑکیوں کے ایسی سنی کوئی نہیں جانتا۔
دھوپوں کی سن سناتی دو پہر میں ہوں یا جاڑوں کی بریلی چاندنیاں
یہ چھوکر یاں سدا کد کڑے لگاتی پھرتیں۔
مدن میاں کے جواب میں ادھر سے ٹھن ٹھناتی ہوئی فوری آئی۔
نیلی نسلوار، جس کے پانیچے چڑھائے ہوئے۔ لال کھلے گلے کا کرتا۔ لال
اڈھنی۔ آتے ہی بولی۔
”ہاں ہاں جھڑائیں گے بیر۔ تمہارا کیا جاننا ہے جی۔ بڑے آئے
ہٹانگ سیدھی کرنے والے۔“

”اچھا۔ تیری اتنی بڑی زبان۔ پتھر تو ہسی۔“
مدن میاں بڑی گرمی میں آسٹینیں چڑھاتے ہوئے فوری پر لپکے۔
سوچا بڑا فوری آتا دیکھ کر بھاگ کھڑی ہوگی، مگر وہ فوری ہی تھکی
کھڑی رہی۔ انہوں نے اس کی چٹیا گھسیٹ لی۔

”اب بولی۔ کرے گی زبان درازی۔ ای۔“
”ادل۔ ادلی۔“ وہ چلائی۔ ”بڑے کہیں گے آئے۔ اس دن

بھی لے کے اتا مارا در آج بھی چٹیا نوچ ڈالی۔ ابھی اماں سے بھرتی ہوں۔“

مدن میاں سٹ پٹا گئے۔ یہ پرکا لہ چھو کر سی اب خالہ ہی سے جلنے کیا کیا جا لگائے۔ ذرا نرم پڑ کر لو لے۔

”کہاں مارا تمہارے میں نے؟“

”ہاں ہاں۔ اس دن ہم آنگن میں ”چڑی چھپا کا“ کھیل رہے تھے تو کس نے یہ اتنا بڑا نیٹا چھینک کے مارا تھا۔؟“ اکدم دیکھی ہو کر بولی۔ ”کیوں جی یہ آنگن تمہارے باپ کا ہے۔؟“

مدن میاں صاف نکر گئے۔ ”جھوٹ بکیتی ہے۔ میں نے تجھے تو کیا آج تک کسی نوکر کے بھی تھپہ نہ مارا ہوگا۔“

”اوں۔ جھوٹے کہیں کے۔ یہ دیکھو نو۔“ اور اس نے جھوٹ اپنی نیلی شلوار کا پانچ گھٹنوں تک چڑھا لیا۔

”یہ دیکھو۔ یہ نیلا نیلا نشان۔ پتھر کی چوٹ کچھ کم نہیں ہوتی۔“

جی۔ ۲۰۔ ۱۔

وہ کمبخت تو پتھر کی چوٹ بنا رہی تھی اور میاں دل چوٹ کھا

گیا۔ بڑی اچلی اچلی۔ دھلی دھلی سی پنڈلی تھی۔ اور غروب ہوتے سورج کی پیلی پیلی دھوپوں میں ہنسا کر تو سونا جیسی بن گئی تھی۔ نیل دبل کچھ بھی نہ تھا۔ ہاں ایک تل ضرور چمک رہا تھا۔ کالا کالا۔

اور قبل اس کے کہ مدن میاں کچھ سن سکتے یا کسی جیلے ٹولے سے ابھی ٹھوڑی دیر اس کی پنڈلی ہی دیکھتے رہتے، وہ پیر پختی۔ تینوں بریم پختی انی لال لال اور صحنی کا آنچل اڑاتی یہ جا، وہ جا۔

مدن میاں کئی منٹ تک تو وہیں کھڑے رہے۔ عھر کا وقت ٹلا
چار ہفتا۔ ہڑٹا کر نماز کو چل دیئے۔

ایک تنہی شہزادی

”ہا۔ بیچاری۔“ دادی بی کو شہزادی پر ہٹا ترس آیا۔ مروت
بچ کر وہ سالت ہی ہو گئیں۔
”تو آگے ہوا کیا۔؟“ کسی نے بیچ میں ٹوکا دیا۔
”ارے ہوتا کیا۔؟“ نصیبوں جلی کی قسمت میں تو ٹھوکریں ہی
لکھی تھیں۔ کبھی تو بھول کے سکرانا نصیب نہ ہوا اس کو۔“
”سیمائی اللہ، دادی بی۔ آپ تو ایسے ترس کھا رہی ہیں وہ سچ
مچے کی ہی شہزادی تھی جلیے۔ پھر آگے سائیے نا۔“
”کیا سادوں۔؟“ مجھے نیندا رہی ہے اب۔“ دادی بی نے منہ پھاڑ
کر چٹائی لی۔

”دادی بی اگر آپ نے کہانی پوری نہ کی نا تو یاد رکھیے ہم کل
آپ کا پاندان چھپا دیں گے، پھر لیتی رہیے گا دن بھر جائیگا۔ ہاں۔“
دادی بی نے پھر دوری بکڑی۔
”اے ہے بڑی کرموں جلی سخی۔ پیدا ہوتے وقت کوئی منخوس
مارا کھڑا ہوگا۔ تبھی تو۔ اب آج کے رانی کو بھی سو جھا کہ نہ سہی کوئی
شہزادہ، کسی وزیر زادے سے ہی نکاح پڑھا دیں۔ اے کرتی بھی
کیا بیچاری! بال جو بچتے جا رہے تھے شہزادی کے۔ ادھر رانی چپکے چپکے

راجہ کی جان کھائے جاتی۔
 "اجی سنتے ہو۔! لڑکی دکھائی نہیں دیتی سامنے۔ جیسے سفید
 دانت ہیں ایسے ہی سفید بال بھی ہوں، تب اسٹاما۔ ہاں آگے تم جانو!
 "مگر راجہ کہاں سنتا اس کی بات۔ وہ تو محل میں بھی بھولے
 بسرے ہی آتا۔"

"تو دادی بی،" بیچ میں شجوا مان نے بات کاٹی، "آخر اس غریب
 شہزادی کی شادی ہوئی بھی کسی سے۔؟"
 "اے بوادر سنو۔ کہانی کا انجام پہلے ہی سے سنا دیا تو کیا
 مزہ رہا۔؟ دیسے بھی نصیبوں کی پوری بیچاری۔
 "ہاں تو رانی نے سوچا کہ یوں تو بات نہیں بنتی۔ ایسا کریں گے۔
 کہ ایک دن۔۔۔۔۔"

اسحاق میاں نے ٹوپی پلنگ کی ٹپی پر دھری، اچکن اتار کے
 کھونٹی سے ٹانگی اور بڑی چچی سے بولے۔
 "اجی سنتی ہو جابی جان۔! وہ دن میاں نے اپنی خلیسری
 بہن نور سے شادی رچالی۔"

"ہائیں۔ کیا کہتے ہو میاں۔؟" وہ نیند میں جھپکیاں لیتی پڑی
 تھیں۔ بڑ بڑا کر اٹھ بیٹھیں۔ "ایسے کیسے ہو سکتا ہے بھلا۔؟"
 "ہو سکنے کی بات تو جانے ہی دیجئے۔ ہر چکا ہے۔!"

بڑی چچی چڑک کر بولیں۔ "موتی گن کی نہ ڈھنگ کی کس بات
 پر دیکھ گئے۔ صاحبزادے! سارا دن تو علی کے پوٹوں کے ساتھ
 ہڑدنگ مچاتی پھرتی ہے۔ لو کیا زمانہ آ لگا ہے۔ بچپن کی نسبت بغیر

پوچھ گچھ تو زینب کی۔ سوئی نسبت نہ ہوئی پتنگ ہو گئی، جب دل چاہا
اتار لی۔ مگر یہ ہوا کیسے۔؟“

”سجائی جان۔ اب پسلی کا جوڑ متعال گیا۔ جو ہوا سو ہوا، مگر
اب ہماری شجواں کا کیا ہوگا۔؟ اور پھر شجواں کی وجہ سے رہمان
کا کیا بنے گا۔؟ ربو کے سسرال والے تو یوں ہی ایک ٹانگ پکھڑے
ہیں۔ جیسے تیسے انہیں تھاپ دے دے کر روکے جوئے تھے، اب
تو وہ صاف کہہ دینگے۔ ”نہ بابا، ہم اور انتظار نہیں کر سکتے۔ ایسے کیا
بیرے جرے ہیں تمہاری بیٹی میں، کیوں جھوٹ کہتا ہوں۔؟“
بڑی چچی نے بڑی حسرت سے شجواں کی طرف دیکھا، جو بد
نصیب شہزادی کی کہانی آنکھوں میں نمی لئے سن رہی تھی۔

گرتی دیوار

اسی شجواں بغدادی قاعدہ ہی پرستی تھی کہ مدن میاں سے
بات کئی ہو گئی۔ ربو، جو شجواں کے لگ بھگ تین برس بعد پیدا ہوئی
تھی، ابھی بالکل ہی گرڈ یا جیسی تھی۔ مگر وہ بھی اپنے چچا کے بیٹے کو
منگی ہوئی تھی۔ ادھر بغدادی قاعدہ سامنے دھرا ہوتا اور ادھر شجواں
کی مدن میاں سے لوکا جھونکی چلتی رہتی۔ میاں کے یاد ہوتے رہتے اور
مدن میاں سے شجواں کی چلتی رہتی۔ دیکھنے والے دیکھتے اور پس
دیتے بڑی چچی کہتیں۔ ”اے تمہارے وقتوں میں ایسا نہیں ہوتا تھا۔“

اسی لئے منہسی آتی ہے نا۔ ہمارے ماموں تو انہی ہونیوالی دہن کو گود میں اٹھائے پھرتے تھے۔ اباں اور کیا! اور سبھی یہ تو ہر ماہی چاہیے۔ یہاں بی بی کی عمر میں اور کچھ نہیں تو دس برس کا فرق تو ہو۔ ورنہ یہ کیا ہے۔ بی بی صاحبہ کے نو دانت بھی کھل سکے ہو گئے اور میاں ہیں کہ وہی تنہی ہوئی کٹھنی اور کوڑے کے پروں ایسا سر لئے گھوم رہے ہیں۔ اسی سے تو ناچاتی بڑھتی ہے۔ میاں تو دیکھنے میں جوان اور بی بی بوڑھی۔ یوں نظروں سے بی بی گرے تو رنڈی کی ہنڈی تو تیار ہے ہی۔ مردکی کاسنی کو عورت کہاں پائے۔“

مدن میاں اور شجومان کا بھی اچھا خاصہ فرق تھا۔ سب کے ساتھ شجومان بھی اپنا سچولا سچولا منہ اٹھا کر انہیں مدن سجائی کہتی، مگر کوئی نہ کوئی اسے شہو کا دے ہی دیتا۔

”اری کل جیسی! سجائی پکارتی ہے ہونیوالے دولہے کو۔“ اب

شجومان کو تو یہ معلوم نہ تھا کہ دولہا کیا ہوتا ہے، مگر اتنا ضرور معلوم تھا کہ دولہے کے نام پر شرایا جاتا ہے۔ بس وہ گھٹری سی بن جاتی۔

مدن میاں دکالت پڑھ رہے تھے۔ گویا بڑی انہونی بات کہ

رہے تھے، مگر ساس سسرے خوش تھے۔ پڑھے لکھے داماد تو ان دنوں

بولتی سپاری اور نہنتی لونگ کی طرح غنقا تھے۔ اب یہ تو اپنے اپنے

نفس کی بات ہے کہ شجومان کو تو وکیل دولہا لے اور راجو بیجاری

کو جاہل جٹ، گنوار کا لٹو۔ ماں تو یہی سوچ کر بڑھال ہوئی جاہلیں

کہ کیسے یہ سوٹ بچھ گی۔ کیونکہ اور کچھ نہ سہی، مگر راجو خیر سے

بچہ ادی قاعدہ اور کلام مجید تو پڑھ ہی چکی تھی۔ دوکتا بین اردو کی۔

اور پھر دس سال تک پہاڑے بھی تو یاد تھے اسے۔ !
 ادھر شیخو ماں نے سولہویں میں اور رولے تیرھویں میں قدم لکھا
 نہیں کہ ادھر سے رولے کے سسرال والوں نے ادھم مچا دی۔
 "اسے دیکھو تو ہسی ! جان جوان بیٹی یوں ہی بٹھال رکھی
 ہے۔ آخر کب اٹھانے کا ارادہ ہے۔ ؟"

پیغام تو دونوں ہی کے موجود تھے۔ مگر مدن میاں کی اماں کہتی
 تھیں، اماں کیا کہتی تھیں، خود مدن میاں کہتے تھے کہ پہلے ایل۔ ایل
 بی کی خلعت پہنیں۔ پھر کر لیں گے شادی دادی بھی۔ رولے کے
 سسرال والوں نے کیا کیا گھائیائیاں نہیں گھالیں۔ ؟
 "اے ہم تو چھپتاے ان کے گھر کی بیٹی اٹھا کر۔ نوج کوئی اس
 عمر کو ٹل جانے دے۔ اب تو ٹانگ سے بانہ دھر رکھا ہے، پھر دھلتی
 ہیں اٹھانا۔"

بڑی چپنی نے انہیں بڑی صلاحیت سے ٹلاوے دیئے۔ بات
 کرنے میں تین برس نکل جائیں گے۔ پھر دیکھو دو منہ دے ساتھ ہی
 ساتھ پھینکے۔ اے بہن ! تم انہی ہی والی ہو۔ ذرا سوچو تو ہسچھوٹی
 کو دماغ کر کے بڑی کو نہ اٹھایا تو کہنے والے کیا تھوکیں گے میرے
 منہ پر کہ ہر گا بڑی میں کوئی عیب تھی تو چھوٹی کو اٹھا دیا۔ اب اللہ
 سمجھے تم لوگوں سے کیا پردہ۔ بس ایک یہی مجبوری ہے۔ اور اتنا
 تو تمہیں معلوم ہے بہن کہ کرنے دھرنے والی اکیلی میں ہی میں ہوں۔
 یہ بڑی چپنی کے میاں سید رزاق بھی بڑے گنوں کے تھے۔ اب
 بڑھاپے میں آکر بڑے سیدھے بن گئے تو کیا ہوا۔ کیا کیا جلا پے

انہوں نے بڑی چچی کو نہیں دیئے۔ بس کھولتے پانی میں ڈال کر چوش تو نہیں دیا۔ باقی سب کھیل کھیل ڈالے۔ ساس نندیں تو بیٹے بھائی کے گرفتوں سے کما ہے پردہ اٹھائیں۔ مگر چھوٹی نند نے بھولپن سے ایک بار کہا بھی تھا کہ "بھائی میاں نے گوری بھادج کے چر کے بھی لگائے تھے درست پناہ سے۔"

اب جموٹ پیس تو اللہ ہی جانے کہ اس جھنجوٹ کے پیچھے کیا گل کھلے ہوئے تھے۔ بات۔ وہی ایک بات عشق و محبت کی یہ وارد تھی آج کل سے نہیں، اس گھڑی سے چلی آرہی ہیں جب کہ آدم نے بی بی خوا کی کھوج کی تھی۔ یہ رزاق میاں اپنی ماں کی گوری چٹی پکے پان جیسی اجلی بھانجی کے لئے وقف تھے۔ اب مہن دل پر کس کا بس چلا ہے؟ یہ کمیتوں پر نگرانی کے لئے جاتے تھے۔ وہیں جھونپڑ یا پرکھوے کسان کی لوٹ بایسے آنکھ لڑ گئی۔ ان کا تو کیا گیا، برس پیچھے وہ فردر ایک خرامی پلے کی ماں بن گئی۔ اس کو تنہا پر تنہا دیئے جاتے تھے کہ بس شادی کر دوں گا تو تجھی سے، در نہ زہر کھالوں گا۔ اس بیچارہ کو تو یوں ہی برادری والوں نے نکال باہر کیا تھا۔ کرتی بھی کیا؟ اب ادھر ماں باپ نے شادی کی بات اٹھائی۔ پہلے والے تو انہی بات کے پورے ہوئے تھے۔ رزاق میاں کی ایک نہ چلی۔ باپ نے یہ کہہ کر منہ بند کر دیا کہ "اسلام میں چار چار جائز ہیں۔ ارے میاں بہت ہوا تو اس سے بکھل پڑھو الینا۔" مگر کھلے بندہ چھی تو انہوں نے بھی نہ دی۔ سید تھے، بات کیسے کرنے دیجئے؟ بڑی چچی بیاہ کر بھی آگئیں۔ مگر میاں کے تیور وہی رہا

بھی لپ چپ کر جو میٹریا پر جائے۔ مگر مارے باندھے کے چار چہرے
بچے بڑی چچی سے بھی ہو گئے۔ یہ بچاری بڑی صابر تھیں کیسے منہ
سے نہ پھوٹتیں۔ جو جو بڑی وہ حبیل گئیں۔ کبھی سجولے لسرے ایک
حرف شکایت کا زبان پر لاتیں بھی تو سننے والیاں یوں اچھالتیں۔
”اے واہ، یہ اچھی سنائی ہوا۔ کیا محبت نہیں، پیار پیرت
نہیں تو پھر یہ بچے کیسے ہوئے؟“

بڑی چچی ایک بار تو جھل کر بولی گئیں اے بچوں کا نہ کہو۔
بچے تو کتے بیوں کے بھی ہو جاتے ہیں۔ ہمارا کیلہ ہے؟“

پورے سسرال میں وہ تھڑی تھڑی ہوئی کہ بڑی دہلنے
تو اپنے بچوں کو کتے بیوں کے مقابل بٹھا دیا۔ ایمان کی بات تو یہ
تھی کہ کتے بیوں کی بھی تو انہی مرضی ہوتی ہوگی۔ یہاں تو یہ حال
تھا دادا حضرت زبردستی اندر بھیج کر باہر سے کنڈی چڑھا
دیتے اور مارے باندھے کی جوں توں ذرا ق میاں کو رات بی بی کے
ساتھ لہر کرنی ہی پڑتی۔ مگر سورج شام کو تو ڈھلنا ہی ہے۔ دن بھر
کتنا ہی جگمگائے۔ اب تو ذرا ق میاں راستے پر آگئے تھے۔ جو میٹریا
والی سے بھی نیچے اوپر تین تین بچے ہوئے، مگر چوڑی ہوئی بڑی کو
کون دسترخوان کی زینت بنا لیتا ہے۔ دودھ جیالے داغ اور
سنگ مر مرالیا پتھر ملا اور سفید جسم جب تک ساتھ دے گیا، اُسے
گیا۔ پھر وہ آپ ہی آپ دل سے، نظروں سے اتر گئی۔ نکاؤں کے
جاکم تھے، کس کی مت ماری گئی تھی کہ فضول پر چل کر تپا پھرتا۔
یوں تو دلوں کے سسرال والے اس گھڑی مان گئے۔ مگر

ادھر بدن میاں نے وہ ترقی پسندی دکھائی کہ بڑی چچی کے ہاتھوں کے ٹوٹا ڈالے۔ اب تو کوئی شعور سمجھنا بھی نہ تھا۔ منگی ہوئی لڑکی کا پیغام ٹوٹ جاتا میاں تو ایسا سمجھا جانا کہ حرام کا پلہ چننے والی اس سے ادھی سٹی۔ لوگ ہانگ بھی تو لوپہ جیتے کہ آخر ایسی کون سی خرابی تھی کہ ٹھیکرے کی مانگ ٹوٹ گئی۔ سپردہ غیر کف والے ہی بیاہ لے جائیں۔ لے جائیں۔ اپنے والے تو بھول کے بھی نہ کرتے۔ بلکہ موقع ملے تو اور پردے اٹھانے۔ اور یہاں تو سوال بڑی بیٹی کا اٹھنا تھا۔ رہو ہوتی تو ایک بات بھی تھی۔ وہ سپردہ بھی چھوٹی تھی۔ پہلے تو شیخو مان یوں ہی بڑی اور اس پر سے پیام بھی جاتا رہا۔ بڑی چچی تو حواسوں ہوتے سبھی پاگل ہو کر رہ گئیں۔ پولیسا دلیار کے بدن میاں کی کڑیل جوانی کو کو سے دیتیں۔ پھر آجاکے نوری پر صلواتیں پڑھتیں۔

”اے بی ہمیں سب معلوم ہے۔ آج کل سو ایسی چلن ہو گیا ہے۔ کھلے بندوں، چڑھا دے کے سبیلوں کی طرح جوان ہسٹلاٹ لڑکیاں چھوڑ دیتے ہیں۔ آپ ہی لڑکوں کی ہنگامہ پڑے گی اور من مانی کر نیچے۔ کیا ہم نے دیکھا نہیں اتنی بڑی سٹری کی سٹری آننگن بیچ کر کڑے لگاتی سپردہ تھی۔ اب میں کہوں خالہ کا چھو کر ہوا تو کیا غضب ہو گیا ہے تو نامحرم۔ معلوم ہے جی، یہ سب چال پہلے ہی چلی ہوئی تھی۔“

اب یہ نواد پر والے کو ہی معلوم تھا کہ چال واقعی چلی ہوئی تھی یا اچانک ہی وہ سیاہ تل شیخو مان کی تقدیر کی سیلہ ہی بن کر ان کے وجود کو کھا گیا! مگر کوسنوں سے ہونا سبھی کیا تھا۔؟ چڑا تو ہاتھ سے اڑ گیا تھا۔

”کھانے کا کام — تیرے پیروں باندھوں سونے کا دھانگا۔
میرے بھاگوں کوئی مہمان آتا ہو تو نوٹ اڑ جا۔
”ہائے! بیچارے شہزادی روزانہ محل کے چھپے چھپے کھڑی ہو کر
یہ آواز دے گی۔ سیکڑوں کو سمنڈ پر پھینچے کے بیٹھے ہی رہتے، کوئی
سبھی تو نہ اڑتا۔“

”ہائے — تو دادی بی ایسا کہنے سے کیا ہوتا ہو گا بھلا۔؟“
یہ ربو بیچ میں دادی بی کو ٹوک ٹوک دیتی تھی۔

”پھر مجھے ٹوک دینا۔! اسی کلمہ نہیں، کوئے کو پکار کر اس
کے پیروں سونے کے دھانگے باندھنے کا لالچ دیکر اس سے پوچھو
’میرے گھر کوئی مہمان آیا والا ہے۔؟‘ اگر اڑ جائے تو سمجھو بالم کون ہے
میں بچا لے اڑ گیا، اور بیٹھا ہی رہے تو سمجھو بالم ٹالم کوئی ہے ہی نہیں۔
اڑے سبھی تو سندلیہ کیسے دے؟ ہاں، اب سے بیچ میں نہیں بولنا۔
تو بس بیچارے شہزادی کھڑے کھڑے تنہا جاتی، مگر اس کے
نصیب کھلتے تھے نہ کھلے۔ اور بیچارے کو شہر منوع میں جانے کی
اجازت کبھی نہ ملی۔ اللہ کا نام پڑا، اس کا کام سبھی پڑا۔ ایک دن۔۔۔“
”یہ شہر منوع کیا ہوتا ہے دادی بی۔؟“ شیخو مان نے بہت
ہی سادگی سے سوال کیا۔

دادی بی نے یوں ٹوکے جلنے پر گھور کر دیکھا، مگر چونکہ شیخو مان
بہت کم کوئی سوال کرتی تھی۔ اس لئے پیار سے بولیں۔

”اے تم میں سمجھ سکتی کیا! بادشاہ کی مملکت میں ایک بڑا سا
خانہ شہر ہوتا تھا۔ بڑا رنگ برنگ۔ وہاں حرف وہی لوگ جاتے

تھے جن کی شادیاں ہو چکی ہوں۔ اور پھر وہ جو اسے وہاں ایک رات سے
گزارا کر واپس آ جاتے تھے۔ اور پھر وہ شہر ان کے لئے شہر ممنوع نہ
رہ جاتا تھا۔

”تو داد سی بی وہاں کنواری لڑکیاں نہ جاسکتی ہوں گی۔“

”لو اور سنو! وہاں سبھی کنواریوں کا کام، شہر ممنوع جو
نام پڑا تو تم ایسی کنواریوں کی وجہ سے ہی پڑا کھلی بستی ہوتی تو کیا
میاں ہی کیا ان بیاہی، سب سے وصول اڑاتی پھرتیں۔ مگر وہ تو شہر
ممنوع تھا۔“

”تو یہ ہے، بیچ بیچ میں سورخنے پڑ جاتے ہیں۔ ہاں تو اللہ کا
کرنا ہوا ایک۔۔۔۔۔“

اسحاق میاں ہمیشہ کلائمیکس کے لگ جھگ مینچ کہ ایک
آدھ زوردار ہوائی چھوڑ دیا کرتے تھے۔ ٹوپی پلنگ کی پیٹی پر دھری
اچھن اما کر گھومٹی سے ٹانگیں مار رہے۔

”اجی سنتی ہو میاں جان! وہ جو میاں کے ابا ملے تھے۔ رلو
کی شادی کے بارے میں کہہ رہے تھے۔ یہ بھی صاف صاف سنا دیا
کہ اگر جلد ہی شادی نہ کی تو جھوپیاں ٹوٹا ہوا ہے۔“

”ہائیں۔ ا۔“ بڑی جی جھپکیاں اسی لئے رہی تھیں، ہارڈا کر
اٹھ بیٹھیں۔ ”ایسے کیسے ہو سکتا ہے سمجھا۔“
”ہو سکنے کی بات جلتے دو۔ اور جو ہو گیا تو سر پر کر جھپکتی سنا۔“

میں کہتا ہوں کہ ہی دونار لو کے ہاتھ پیلیے۔ اب اس بے چارے کے
لمبے لمبے ہاتھ۔ تم ہی سوچو اگر ایک تو یوں ہی بیٹھی ہی ہے۔

سب سے سبھی چھاتی پر مونگ دے گی۔ سبوں جھوٹ کہتا ہوں میں۔
 "نان میاں۔ تم جھوٹ کا ہے کو کھڑے! مگر یہ تو سوچو شجر
 بڑی ہے۔ آنکھوں ہونے دیکھ گئی کہ جھوٹی گھر بار برت رہی ہے۔
 بچے جھلا رہی ہے تو اس کے دل پر کیا بیٹے گی۔"

"سجالی جان اتنا تو میں سمجھتا ہوں، مگر تم ورا گہرائی میں
 تو جھانکو۔ ایک کے ساتھ دوسری کی بھی زندگی تباہ کرنا کہاں کی
 ایسے دانشمند ہی ہے۔ اس کے لعیبوں کا بھی کوئی بلخ کا شہزادہ
 آہی جلائے گا۔ ہم ایک گن فکر کرنے ہیں تو اد پر والا ہزار گنا کرتا ہے۔
 ہاں آگے تم سمجھو۔ اور یہ بھی نہ ہوا تو بیٹھی رہے گی تمہارے کو ہے
 سے لگ کر۔ شکر میں دب کر کوڑا امر نہیں جاتا۔"

"کہتے تو شعیب ہو میاں۔ ابھی تو اللہ ہی جلے اور کیا کیا
 دیکھنا اور سننا پڑے۔ کنواری بیٹی اور بیٹا کو تو۔ پھر بھی میاں
 ہی اد پر اد پر استحقاق چلا جائے۔ یہ ہلکا بڑا بھاری ہوتا ہے میاں۔"

اندھیرا

چھین سے شجر ماں یہی سنتی آئی تھی کہ دو منڈوے ساتھ
 ساتھ ڈیر سینگے۔ ساتھ ہی ساتھ ہلدی چڑھے گی، ہندو لگے گی
 اور دونوں ساتھ ساتھ ڈولی میں چڑھیں گی۔ یہاں تو بیچ میں ہی
 کھڑکٹ کے رہ گئی۔ کان تو شجر ماں کے بھی تھے۔ بڑے ٹھنڈے
 دلہن کے روبرو کی شادی ہو رہی ہے۔ دھجیں کا ابھی صرف مولچواں

تو بھلا وہ یہاں شجواں تو اٹھا دو ان بھی پہلا ننگے کی سوچ رہی تھی۔
 سر جھکائے جو کائے شجواں نے ربو کی کرتی میں لپکے کا سرا
 لگا یا دھپ سے دو آئینوں کی آنکھوں سے نکل کر اس کی گود
 میں گر پڑے۔ وہ تو اچھا ہوا کسی لے یہ جگنو چپکے دیکھے نہیں ورنہ کہتے
 والوں کے منہ تو بند نہیں ہیں۔ کچھ بھی اڑ جاتی۔

”ادنیٰ مہن کا سکھ دیکھا نہیں جا رہا۔“

”منہ زور جوانی ہے۔ سنبھالی نہیں جا رہی ہو گی۔“

وہ تو پہلا تیر تھا جو اس کے دل کو چھید گیا۔ اب تو یہاں
 دن رات دھڑا دھڑا چولیاں سل رہی ہیں۔ اس پر باغی ہو رہی ہیں۔
 رہی ہے کھڑے دوپٹے چنے جا رہے ہیں اور کون ٹنک رہی ہے۔
 کرتے قطع کئے جا رہے ہیں اور گئے نوڈ سے ٹنک رہے ہیں۔ اور
 ان سب کاموں میں شجواں آگے آگے ہے۔ ربو تو دن رات پلنگ
 توڑتی یا پھر سکسی سبیلیوں سے کھسکھس کر رہتی رہتی۔ سارا کام شجواں
 کے سر تھا۔ گھر کیاں بھی سن رہی ہے۔ جا بے جا پڑتال بھی پڑ
 رہی ہے۔

”اسے ہے شجواں! یہ دیکھو نوڈ سے کے پاس سے لبرٹری

مانا۔ دی۔“

”اے بی تمہیں آنکھیں نہیں۔ یہ بانکڑی میں نے تمہیں

کرتی پر لگانے کے لئے دی تھی۔“

سر مردن گزرے جا رہے تھے۔ پڑھائی ہوئے کے جو نکلے۔
 دیکھتے دیکھتے شادی کا دن بھی آگیا۔ شجواں نے اپنے ہاتھ

دو لہا میاں کی سلامی کی تھی سہائی۔ اور ہر دو لہا بنی جیسی تھی۔
 اور آج کئی دنوں بعد پھر شجران کی آنکھیں پر سے جا رہی تھیں۔
 کون جالے یہ آنسو بہن کی جدائی پر تھے یا اپنی بد لکھیبی پر۔
 مہمان بیسیاں انہیں، جان بوجھ کر بڑی چچی کے پاس رکھیں
 اور پوچھیں۔ "ادنی بہن، ہم تو سدا سے سنتے آ رہے تھے کہ دو
 منہ دے پڑیں گے۔ ہوا کیا۔؟"

"اے بہن، یہی وہ تیر، ری بڑی مٹی ہے جس کا ناپ ٹوٹ گیا۔
 بڑی چچی چوٹی بنی اور ادھر ادھر منہ چھپاتیں۔ بہانوں سے منہ
 پھر پھر کے آنکھیں پوچھتیں۔ اور ادھر شجران پھر کی بنی سارا
 کام فیر رہی تھی۔ ہر احساس سے عاری۔ ابھی جب بیز کے کمرے
 میں ساڑیاں لٹائی تھیں، وہاں ہی تھی تو ابھی باد چا خاتے میں کھالے
 دانے کی خبر لینے جا رہی تھی۔ ابھی پھلوا ری سے مہرے پھول لے رہی
 ہے تو ابھی خود دان میں انگارے لے لے رہی کہ بال سکھالے ایک

لہی ۴
 شجران کی نیند سے آنکھ کھلی تو کب کھلی، جب میرا شن نے
 ڈھونڈ لیا۔

"کاروان میں جلوہ دو من باورا

جلدی گھر کو جانے دو
 سلامی کی تھی پلے وہ لہر چھری چلی جا رہی تھی۔ آگ دم اس
 کے قدم۔ شجران کے ساتھ تھی بیسیاں سب دلو کی میان
 شجران کے ساتھ تھی۔ جہاں آ رہی تھی تو سالہاں شجران

تھا اور اب تو گود بھی بھری پوری سستی، رلو کو ٹھیل رہی سستی۔
 ”اری سستی ہے۔ جلوے میں اتنی بھی دیر نہ ہو۔ ادھر رہے

میاں انتظار جو فرار ہے ہیں۔!“
 رلو گھڑی تو تھکی ہی، اور بھی سمٹ گئی۔

”اری یہ سب چالیں ہیں۔“ کوئی دوسری بولی: ”ہم سب سمجھتے ہیں۔ دل میں تو رڈ سپوٹ رہے ہوں گے کہ کب جائے اور کب دلچے میاں کو اپنے ہاتھوں پاؤں بنا کر کھلائے۔“
 شجواں کے قدم سوسوسے ہو گئے۔

”تجھے قسم ہے ربو جو دو گھنٹے خوشامد نہ کروائی ہو۔ ارے یہ رات ایک بار ہی لو آتی ہے۔“

چھن..... چھن.... چھن... سٹھائی لگ گئی اور سلامی کے روپے، پودے کے پورے، مع چکنی، الاچی، لونگ کے برآمدے میں بجھر گئے۔

پھر شجواں کو معلوم نہ ہونے کا کہ کب رلو کی رخصتی ہوئی۔ واقعی تاروں کی چھاؤں میں ہوئی یا ابھرتے تاروں میں ہو کر وہ جلد ہی خوشامد کرانے چلی گئی۔ مگر جب شجواں کو ہوش آیا تو اس کی آنکھوں تلے سیاہ سیاہ گہرے تھے۔ دل چلتے ہیں رہ رہ کے زور زور سے دھڑکی اٹھتا۔ چکر آتے تھے۔ اور ادھر رلو سستی کہ شادی کو ڈیڑھ دو ماہ بھی نہ ہوئے تھے۔ جمائیاں بھی پوری نہ ہوئی تھیں، شرم نہیں نہ ٹوٹی تھی ساس نندوں سے کہ گھونگھٹ کا پردہ اٹھا اٹھا کہ وہ ابکائیاں لینے اور تے کرنے لگی۔

روکے میاں شہر میں کوئی کاروبار کرتے تھے۔ بختہ ہیں چار دن باہر گزارنے، چار دن گھر پر رہتے۔ داماد آئے تو شہر میں ہی ان کا کمرہ سلیقہ سے سجائی۔ لاکھ مسکائی، جھاڑا جھٹکی کرتی ہر رو صبح اُٹھتی تو وہی پھروں کا رونا لے کر۔ سہول سہلاتی ہوئی نہیہ لب مسکاتی ہوئی۔

”اپنی جان، غضب ہے اللہ کا! یہ پھیر کا ہے سے ٹوٹ پڑے ہیں۔“

سلیمن ایک دن دیدے شکر کر بولی۔ ”ہاں شجوبی بی، سچ پچ یہ پھیر تو یہ ہے! اتنا بڑا پھیر ہے، ایک دو نہیں پورے بتیں دانت ہیں اس کے منہ میں۔ اور کسبخت جب ڈنک لگے گا تو چیر پر لگاؤں پر، ہونٹوں پر۔ کیوں ہے نار بولی بی۔“

رو بولی بی مسکاکر اور نہ بکر شراتی ہوئی اسے مارنے کو لپکیں اور شجوبان کی آنکھوں میں رات کی جبر پور سیاہیاں تیر تیر گئی۔

”شجوبان کو کب تک یوں ہی بچائے رکھو گی۔“ کہیں کر

”واہنا بنیں۔“

”اللہ رکھے چھوٹی تو جھولا جھلانے کو ہو رہی ہے۔ اور ٹری

ابھی تک بیٹھی ہی ہے۔“

کٹنے جانے وایاں جان بوجھ کر، جان جان کر، سونیاں سی جھبھتیں، مادہ ٹری چھا کا منہ نہ اٹھتا کہ ایک لفظ بھی زبان سے نکال سکیں۔

سلیمن، تو بے ہے! اتنی شکر کیوں پھرو سی حلوسے میں۔!

ہکتی نہیں دیکھو کہ ایکائی پر ایکائی چلی آ رہی ہے۔
 ”اجی بی بی! یہ ایکائی سہیکا کھانے سے نہیں رکنے والی۔
 یہاری بی بی کی اشد رکھے گو دہری ہونے والی ہے۔“ سلیم ہاتھ
 چلا چلا کر بولنے لگی۔

شجوبان اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں حیرت لئے کبھی روبرو
 کا منہ دیکھتی تو کبھی سلیم کا۔ دوسرا قدم جو اس کا اٹھا تو وہ مشین
 پر جا بیٹھی۔ دبلے پیلے کانپتے ہاتھوں سے اس نے پھول دار گلابی
 ریشم اٹھایا اور چھوٹے چھوٹے کرتے قطع کرنے لگی۔

بٹھرایا

بل اور وقت چلتے ہیں تو پاؤں کی آواز نہیں پیدا ہوتی، مگر
 چلتے دونوں ہی ہیں۔ وقت دبلے پاؤں گزرتا چلا گیا، بالکل دبلے پاؤں
 بل گنتی ہی ادھیائی سے گری، پنچوں کے بل گرتی ہے۔ آواز نہیں
 پیدا ہوتی۔ وقت اور زمانے کے کوڑے سبھی دل پر کیسے ہی برسیں
 آواز نہیں پیدا ہوتی۔ ہاں آنکھیں فردر دھندلا جاتی ہیں اور
 بالوں پر راکھ جم جاتی ہے۔

باورچی خانے سے شجوبان نکلی تو سلیم بولی۔
 ”بی بی! سر تو جھاڑ لیجئے، راکھ جم گئی ہے۔“ شجوبان کا سلیج
 دھک سے رہ گیا۔ مگر یہ آخری تیر تھا۔ چپکے سے ایوں ہی شجوبان نے
 آئینہ تھا تو کئی زمانے اس کی آنکھوں کے آگے سے گزرتے چلے گئے۔

گھر سے چلے گئے اور اپنے نظر نہ آنے والے قدموں کی سہولت سے
 دھول چھوڑ گئے اور کوئی مناسب مقام نہ پا کر شجواں کے سر پر چڑھ گئے۔
 وقت گزرتا ہے کو اپنے ساتھ وہ دو بے ادب باندھ دیتا ہے
 جانتے ہیں جن سے دل کی بستی آباد ہوتی ہے۔ مگر شجواں کا دل کیسا مگر
 تھا کہ کسی تو دیران نہ ہوا۔ آگے سے، پھینکاڑے سے، جہاں موقع
 ملتا وہ گھر کے چبھے پر چڑھ جاتی اور گھنگھکیا گھنگھکیا کر ایک ایک
 کوس سے مخاطب ہوتی۔

”کاگھرنے کا گھنیرے پیروں باندھوں سونے کا دھاکا
 میرے بھانجے کوئی نہ جان، ہو تو تو اڑ جا“
 مگر سونے کی پال کا لالچ بھی انہیں نہ رجھاتا۔ مزے سے
 بیٹھے کائیں کائیں کتے جاتے۔ کوئی تو ایسا نہ تھا جو اڑ کر بالم کا سہارا
 لاتا اور اس شہر ممنوع کے دروازے اس کے لئے کھل جاتے۔
 ”ہا۔۔۔ بیچارے۔“ دادی بی کی شہزادی کو اب تک بھی
 شہزادہ نہ ملا تھا۔ وہ اپنی مخصوص ادا سے اب بھی پان چباتے
 ہوئے ”اے۔۔۔ بیچارے شہزادی۔“ کہہ کر پھر سے کہانی شروع
 کر دیتیں۔

کبھی کبھی شجواں محسوس کرتی کہ اس کہانی کی شہزادی اور
 کوئی نہیں، وہ خود ہے۔ جسے کبھی شہزادہ نہیں ملا۔ نہیں ملے گا۔
 وہیں ڈرے کبھی کہیں دو جا رہی تھی کہ اس کہانی کا انجام پوچھ لے۔
 ”دادی بی! پھر اس شہزادی کے لئے شہر ممنوع کے
 دروازے کھلے؟“ مگر یہاں پہنچ کر وہ آسن بھی دھواں بن کے

اڑجاتی تھی جس کے سہارے وہ جی رہی تھی۔ شجورمان کے منہ کا تانا کبھی تو نہ کھل سکا۔

”ہا۔ بیچارے شہزادی۔ دیکھتے ہی دیکھتے زمانہ گزرا، اور ایسا گزرا کہ شہزادی کے بالوں پر برف سی پڑ گئی۔“
شجورمان نے گہرا کر اپنا سر جھاتے چھول ایسا چہرہ پاندان میں لگے آئیے میں دیکھا۔

”دادی بی۔“ وہ چلا اٹھی۔ ”کوئی دوسری کہانی سناؤ۔ دوسری کہانی۔ دادی بی یہ کہانی تو برسوں سے ادا ہو رہی ہے۔ شہزادی کو شہزادہ نہیں ملے گا۔ کبھی نہیں ملے گا۔ مجھے معلوم ہے۔ سب معلوم ہے دادی بی۔“ اور وہ تکیہ میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

سہارا

بچپن میں شجورمان نے بغدادی قاعدہ پڑھا تھا، پھر اردو کی اور چار چھ کتا ہیں پڑھ ڈالیں۔ ماموں، چچا سے پہلے گرفت، رفتن کی نثر دان پڑھی، پھر شیخ سعدی کی ”گلستان“ ”بوستان“ بھی پڑھ ڈالیں۔ ماں نے منع بھی نہ کیا، کیونکہ معلوم تھا کہ ہونیوالے دو لکھ میاں بھی پڑھ رہے ہیں۔ دو سے شروع کیا اور بیس تک پہنچا ڈھے بھی رٹ ڈالے، مگر یہ کیا معلوم تھا کہ تختہ ہی اٹھ جائیگا۔ اور پڑھا لکھا سب خاک میں مل جائے گا۔ اب گھر میں بیٹھے بیٹھے کوئی کام تو تھا نہیں، اسحاق چچا کی بیٹیوں کو الفت بے کی تھی

یاد رکھانی شروع کی۔ اسحاق چچا کی بیٹیوں کیساتھ کھیلنے دیا۔
 سبھی تھیں، وہ سبھی پاس آکر بیٹھنے لگیں۔ پھر بونے ہوتے یہاں
 شجرومان کی اچھی خاصی جماعت جھڑ گئی۔ دس برس کے دند
 کے لڑکے بھی آئے۔ لگے اور یوں ادھر ادھر کھڑے ہو گئے۔ بچے
 بچے ہو گئے اور شجرومان باقاعدہ "آپا جی" بن گئیں۔ بڑے پیار
 سے وہ ہر ایک کو بغیر گھر کے جھڑ کے پریشانی، دل تو سدا کا سچورا
 ستاد کھنا ہوا۔ جس کا دل دکھا ہو گا وہ کسی کو کیا کچھ کہے گا۔ ان
 سارے بچے ایسے ہل مل گئے گویا آپا جی سے برسوں کی جان پہچان
 ہو۔ پڑھانے کا وقت صبح دس بجے سے پانچ بجے تک تھا، مگر
 ادھر صبح ہوئی نہیں کہ اکدم دو دو تین تین بچوں کی ٹنگڑیاں
 آنی شروع ہو جاتیں۔ اور سب آ آ کے دیوان خانے میں بیٹھتے
 جاتے۔ اور شام کو پانچ تو کیا سات آٹھ بھی بچ جاتے تو بچے
 جانے کا نام نہ لیتے۔ اتنے دل جمعی سے پڑھنے لگے اور گھروں کو
 بھیجواتے وقت اتنے ڈھیٹ بن جاتے کہ شجرومان کو مجبوراً
 مات کو بھی پڑھانا پڑا۔ جس میں دادی بی کی کہانی بھی شامل
 ہوتی۔

اتنی مصروفیت میں سبھی شجرومان کو کوئی خیال ایسا بھی تھا
 کہ کبھی سبھلایئے نہ بھولتا۔ اور یوں، جیسے وہ سبھی نماز روزے
 کی طرح زندگی کا ایک اہم فریضہ ہو۔ آپ ہی آپ وہ چچے پر جا
 کھڑی ہوتی اسے ہلے ہلے کا رتی۔
 یہاں گارے کا کاتیرہ پیر دن پانچوں سونے کا دھاگا۔

کونے دھومیں مچاتے۔ شاہیں، کائیں، کائیں۔ مگر وہیں بھی
رہے۔ بالم کا سندیہ کبھی نہ آیا اور اب تو خجواں کی آنکھیں بھی
روستے روتے دھندلا گئی تھیں۔ ایک طرف آسوتھے، ایک
طرف انتظار۔ کس کا انتظار؟ یہ تو اسے خود بھی معلوم نہ تھا۔ بس
روئے جاتی اور پکارے جاتی۔

”تو تو اڑ جا۔ کاکارے کا گکا“

مگر کدوں کو چھجے کی منڈیر ایسی بھائی تھی کساڑنا تو دور رہا
پر بھی نہ پھٹ پھٹاتے۔

”ہا۔ بیچاری شہزادی! بڑی کرموں جلی تھی بیچاری۔
راجہ رانی کی تو کبھی نبی نہیں۔ ارے جس کے۔ یہ باب کا سایہ
ہوا سے کا ہے کا ڈر؟ یہ پتھر چھاؤں تو ایسی ہوتی ہے کہ ساری
جلائیں اپنے سر لے لے۔ مگر راجہ تو بس اپنی ہی جگہ مست تھے۔ نہیں
کیا فکر! بیچاری باب کے ہوتے بھی یتیم ہی تھی۔“
”وہ کیوں دادی بی۔؟“ جماعت کی کوئی معصوم سی بچی
پوچھ بیٹھتی۔

دادی بھی گھورتیں۔ ”پتھر ٹوکا دینا مجھے۔؟ ارے راجہ کی
پند کی رانی کہاں تھی۔؟ بس تبھی سے یہ کھوٹ چلی آئی تھی۔ پتھر
دادی لی اس خیال سے بیکار نہ کر سائیں نہ منہ بچے ہیں بکے
چلی جاتیں۔“

”اور کھوٹ بھی ایسی دلی تھی! ارے اٹے سیرھے دو
چار بچے ہی کیجئے ہو گئے۔ سو ہو گئے۔ در نہ اب تو یہ حال تھا کہ راجہ

جی اپنی مانی سے باقاعدہ ماں بیٹوں جیسا برتاؤ دل رکھتے۔ ہاتھ تک نہ لگاتے۔ اس کے بازو تک نہ بیٹھتے، تو بچوں کو کیا سوال؟ مزید شہوت کو وہ سب کی طرف گردن ٹھکھٹا کر دیکھتیں اور پوچھتیں۔
 ”اسے پاس آ کے بیٹھیں گے ہی نہیں تو پھر اولاد کیسے پیدا ہو جیسی۔ ہاں تو پھر یہ دوری اتنی بڑھی، اتنی بڑھی کہ راجہ باہر کے ہو کر رہ گئے اور رانی اغدر کی۔ اب ماں کو جتنا درد بیٹی کا تھا اتنا باپ کو کہاں تھا۔ ہاں گھسلی رہتی مگر فکر دور نہ ہوتی۔
 ”ہاں، تو پھلی بار میں نے کہاں تک کہی تھی کہانی۔؟“

”ہاں، تو اللہ کا نام بڑا، اس کا کام بھی بڑا۔ ایک دن اللہ کا کر نکیا، ہوا کہ ایک مصیبت ہمارا کوئی شہزادہ، شہزادی کے محل تک آگلا۔“

شہزادہ راجہ کی چوتھی بیٹی کے لئے ادن کے موزے بن رہی تھی اکدم چونک پڑی۔ سلاٹیاں اور ادن کا گولہ اس کے ہاتھ سے چھٹ کھڑے بین پر گر پڑا۔ اس کا منہ اسے حیرت کے کھلا رہ گیا تھا۔ کیا شہر منوع کے دروازے اس کے لئے، شہزادی کے لئے کھل سکتے ہیں؟
 ”تو دربان نے آ کے اطلاع دی کہ کوئی شہزادہ مصیبت کا مار آیا کھڑا ہے اور شہزادی کی خدمت میں باریابی چاہتا ہے۔
 شہزادی نے اسے خاص اپنے جرم میں بلوایا۔“

”اور اس نے شہزادے سے پردہ نہیں کیا۔؟“ عائشہ بول اٹھی جواب دہ سوہی میں تھی اور اسے بار بار سینے پر دو شہر لکھنے کی تاکید اور گلی میں پھلنے کی ممانعت کی جاتی تھی۔

”اے تولی بی اب شہزادی خود جو اتنی سمجھدار تھی، بھلا یہ
پورے جھوٹے کی کیا ضرورت؟ ہاں تو سبھی شہزادی نے شہزادے
کو بلا ہی لیا، مگر شہزادی کو یقین نہ ہوا کہ یہ شہزادہ ہو سکتا ہے۔
کیوں کہ اس کے بدن پر بڑے بڑے کپڑے تھے اور سفر سے اس
کی صورت بھی بُری ہوئی ہو گئی تھی۔ بالی بھی ٹبرہ گئے تھے شہزادہ
تو کیا ہاں صورت سے قید می ضرور لگتا تھا۔“

دادی بی نے خود ہی زور کا قہقہہ لگایا اور سب کی طرف
دیکھا۔ بچے بھی ہنسنے لگے، مگر شجواں منہ کھولے کہانی کے آگے
بڑھنے کا انتظام کرتی رہی۔

”اب تم جاؤ شہزادی سو عقل مندوں کی ایک عقل مند
اس نے سوچا۔ اونہوں، ایسے نہیں۔ اس کا امتحان لیا جائے
کہ واقعی یہ شہزادہ ہے۔ بس تو شہزادی نے لوگوں کو حکم دیا کہ
راتا راتی کپڑا خرید لائیں۔ ہر قسم کا کپڑا۔ اور اس کے گدے
تیار کریں۔ بس سبھی نوکر خرید ہی گئے۔ دوڑے پورے شہر دیں میں
سترنگوں کا کپڑا ملا جھٹ پٹ اس کے گدے تیار کئے گئے۔ شہزادے
کو تھلا دھلا کر کپڑے بدلوائے گئے اور پھر شہزادی نے بطور خاص
یہ اہتمام کیا کہ اپنے استخوں بستر لگوا دیا۔ معلوم ہے کیا بستر؟“
دادی بی کی کہانیوں میں دل جھڑکے ناقابل یقین باتیں ہوتی
تھیں، پھر بھی سب بڑھے چاؤ سے سنتے۔

”ہاں تو بستر کیا تھا؟ معلوم ہے شہزادی نے ایک کے
دو دروازے پر تیسرا تیسرے پر چڑھا۔ ایسے شہزادے

ایک پلاٹک دھوا دیئے اور ان کے نیچے چنے کا ایک دانہ اٹا کر کے
 چنے کا دانہ اداہ کیوں۔ پتہ چھو تیرت سے پڑا۔
 "اوسے آگے سنو نا۔ بیچ بیچ میں منہ کیوں لٹا رہا ہے۔
 تو سبھی شہزادی نے چنے کا دانہ ستر گدوں کے نیچے دیکھ کر
 ہوتی، سب سو گئے۔ صبح ہوئی، شہزادہ کے منہ پتہ چھو گیا۔
 کپڑے بدلے اور شہزادے کی خبر لیئے اس کے کمرے میں جا پہنچی۔
 پوچھا۔

"کیوں جی، آپ کی راجکسی گزری۔
 "شہزادے نے سر جھکا کر جواب دیا۔ جی رات تو آپ کی بدست
 اچھی ہی گزری، بگر.... اور انشا کہ کردہ رک گیا۔
 کیا۔؟ شہزادی نے پوچھا۔

"مگر کوئی چیز رات بھر میری پیٹھ میں چبھتی رہی ہے اور میں
 سمجھتا ہوں اس کی وجہ سے میری پیٹھ میں نیل بھی پڑ گیا ہوگا۔"
 "شہزادی نے اس کی قمیض الٹ کر دیکھی تو واقعی پیٹھ نیلی
 ہو رہی تھی۔ تب شہزادی کو یقین آ گیا کہ واقعی یہ سچا شہزادہ ہے
 کیونکہ شہزادے اور شہزادیاں ہی اتنے نازک مزاج ہو سکتے ہیں
 کہ ستر گدوں کے نیچے سے بھی ایک خیابان کے نیل ڈال دے۔
 "جب شہزادی کو تہہ مل گیا کہ یہ سچ کا ہی شہزادہ ہے
 اس نے جوٹ موٹ نہیں کہا تھا تو شہزادی کے دل میں شہزاد
 کی محبت پیدا ہو گئی۔ شہزادی خود اچھی عمر کی تھی اور شہزادہ بھی
 نوجوان ہی عمر کا تھا۔ تو نہ جانو وہ ان کا پورا گھٹنے گھٹنے پانی نہیں

پہرہ ان چڑھتا ہے۔ اور شہر نواز کی نے یہ چلن اٹھا رکھا تھا کہ چڑیا
زیر اور رنگ برنگی کپڑے دیکھے سینا سب ترک کر دیا تھا۔ گویا
ہوئی اٹھالی تھی۔ اب تو اس نے رنگ برنگی، جسکا جھول کپڑے
پہنے۔؟ ہم چاتی، کھن کھناتی چوڑیاں پہنیں۔؟ جو مرنگیا یا شہزاد
نے بھی یہ سب کچھ دیکھا، اور اس وقت تو بڑا مزہ آیا جب
اسحاق میاں نے ٹوپی پلنگ کی ٹی پیر دھری، اچکن اتار کر
کھوشی سے مانگی اور بہت تیز لہجہ میں بولے۔

”اجی سجا بی جان سنتی ہو۔! غیر کریں تو پھر غیر ہیں، یہ تو
اپنے والے ہیں نا۔ کیا کیا اڑاتے پھر رہے ہیں۔ سالے کہتے ہیں...“
اکدم وہ رک سے گئے۔

”کیا کہتے ہیں۔؟“ بڑی جچی نے ہولا کر پوچھا۔
دیوان خانے میں کرسی پر بیٹھی شجواں انہی کی طرف دیکھ
رہی تھی، آواز نیچے کر کے بولے۔

”کہتے ہیں زبردست اپنے میکے رہتی ہے اور وہاں اس کے
میاں کا بھی آنا جانا ہے۔“ اور وہ معنی خیز انداز میں خاموش
رہ گئے۔

”اور وہ تمہاری میری بہن۔“ وہ پھر لول اٹھے۔ ”کینی کدھر
کی، کہتی تھی شجواں کی آنکھوں میں یہ جلتے کیلے پڑے ہیں۔؟ اور
کھانا تو برائے نام کھاتی ہے۔“

”میاں!“ بڑی جچی نے سہمی ہوئی آواز میں کہا، ”اللہ ہی
ان سے سمجھے تو سمجھے۔ مگر تمہی کدھر میری شجواں ایسی ویسی لڑکی ہے!“

"اگر سے جہیں جی سہا جی سہا ! میں یہ کہہ کر رہا ہوں۔ تو
 تو نہیں خدا سنا جاو رہا تھا کہ ہمارے والے ایسے گنہگار ہیں۔
 "میاں ! " بڑی جی بھر بڑے سچے ہوئے لہجہ میں بولیں۔
 جس میں گھٹکیا ہٹ بھی شامل تھی۔ "بھائے عمر و معلیٰ جی، آج کسی
 کوئی بے نو ہاتھ پیٹے کر دیا اس کے۔ تمہاری نظر میں کوئی نہیں۔
 "سہا جی جان، پہلے کو شیوان کوئی حرامی بلہ ہی جن ڈالتی تو
 اتنی خرابی نہ ہوتی، مگر منگی ہوئی بیٹی کی بات کوٹ کر تو۔ اوہوں۔
 یہ تو بڑی ناممکن سی بات ہے۔"

چلتے تیل کی بوندیں سی شیوان کے کانوں میں گر رہی تھیں۔
 "اے خدا۔ یہ جوانی ! کیا میں اب بھی جوان ہی دکھائی دیتی
 ہوں کہ لوگ یوں نام دھر سکیں۔" اس نے اپنے آپ کو آئینے میں
 دیکھا۔ ڈھلکا سوچ زبان حال سے کہہ رہا تھا۔ "تیس شام آہی
 ہوا چاہی ہے۔" پھر یہ دینا۔ اور دینا دالے۔

اماں نے ایک بار سوسہ سی لی کے رنڈا پاپڑا دیا تھا۔ پھر
 میاں ماں رات چٹ پیٹ ہو گئے تھے۔ اماں نے سوسہ سی کی کچھ
 کیا فی ہری ہری چوڑیاں پتھر پار مار کے پھوڑی تھیں۔ چھائی کریم
 کی چھول دار ساہی لوبچ کر پوٹی کی موٹی سی سفید چادر اڑھا
 دیکھنی۔ کالی کالی روت کا لہجہ پینچ پڑا سونا سونا کر دیا تھا۔
 اور کیاں کرنا کر دیکھنے کی دھڑکی چھوڑ دینی تھی۔

میں سوسہ سی چوڑیاں لگا
 مگر یہ کیاں ہے سوسہ سی چوڑیاں لگا کر دینا چاہیے کہ

دیرانی لڑ رہی ہے۔ اس نے سب سے دل سے سوچا۔ پھر بچاؤ کے
کے آئین میں جا کر اس نے پتھر سے کاسنی کاسنی چوڑیاں کرچی کرچی
کر ڈالیں۔ بالوں میں گلابی مویاں تھیں، اسے پھاڑ پھینکا۔ پھر
کمرے میں آکر زعفرانی اور ہنی اتار کر سفید کفنی جیسی موٹی لعل
کی اور ہنی اور دھلی۔

اتنا ہی ہوتا تو بس نہ تھا، مگر دوسرے دن سارا کیا دھرا
اپنی جگہ رہ گیا۔

نصیر الدین کا بھانجا ٹبرانکھٹو تھا۔ پڑھنے لکھنے میں برابر۔
اسکول میں چپن مرتبہ تو بٹھایا ہو گا، مگر اٹھ اٹھ کر بھاگ آتا۔
نصیر میاں باجری کے بھٹوں کی طرح اسے دناؤں بھوکے۔
آٹھ چوروں کی مار اس کیلے کو پڑتی، مگر وہ الفبے کی تختی سے آگے
نہ بڑھ سکا۔ نو برس کا ہو رہا تھا۔ نو برس تو بچے چوتھی پانچویں بھی
پاس کر لیتے ہیں۔ شجواں کی بیٹی زبان کی ہر جگہ تعریف ہو رہی تھی۔
کہ وہ دکلاسیں ہو رہی ہیں۔ ال نے بھائی سے کہا۔

”بیٹھا دو گئے شاہجہان بیگم کی جماعت میں۔ لگ جائیگا راستہ سے
نصیر میاں کے دل کو بھی بھاگتی۔ ستھرے صاف کپڑے پہننے
بغل میں ہتھ دلوں کے شجواں کے گھسائے۔ یہ دیوان خانے میں اپنی فوج
کو پڑھاتی بیٹھی تھی۔ دروازے پر دستک دی۔ شجواں نے ایک منٹ سب
بچوں کو ہاتھ تھاکر خاموش کیا اور دستک دینے والے کو کہا۔“

”ہیّا جاؤ۔“

نصیر میاں اور بچے بچے ماموں نصیر میاں۔

کہ ہم جو ان سٹ پٹ کر کھڑے ہو گئی۔ اے بے کا کا وہ ہاتھ لے کر گیا۔
 اور نگاہیں جھکی کی جھکی رہ گئیں۔ سفید آنچل سر پر لہڑ رہا تھا اور
 وہ سٹی سٹائی کر سٹ کا ہٹھا تھا لے کھڑی تھی۔

”یہ..... ب..... ب..... بچہ پڑھتا ہی نہیں..... ب..... ب.....
 باکل..... وہ ہے۔“ نفیر میاں کی زبان نالو سے ٹکرا ٹکرا کر رہی تھی۔
 ”..... م..... م..... میں پڑھانوں گی۔ یہاں تو سبھی ڈھیٹ
 آتے ہیں۔“ وہ گہرا کہنٹس پڑی۔

”نفیر میاں بھی مسکرا دیئے۔“ جی ہاں — ذرا دھیان سے پڑھا
 دیکھئے گا۔ آپ کی بہت تعریف سنی ہے۔“ اور وہ سلام کر کے، جواب کا
 انتظار کے بغیر باہر نکل گئے۔

”آپ کی بہت تعریف سنی ہے۔!“

”آپ کی بہت تعریف سنی ہے۔!!“

”آپ کی بہت تعریف سنی ہے۔!!!“

شجران کے دل سے ایسی خوشی چھوٹی کہ وہ پاگل ہو تے ہوئے

.....

”ہاں بچو، تم نے بھی میری تعریف سنی ہے؟“

”ہاں آپا جی۔ آپ بہت — بہت اچھی ہیں۔“ سب آگے

چلے آئے۔

یہ نفیر میاں جو تھے، اب تو جیسے کچھ سچی تھے، تھے، مگر جوانی

میں ان کا بڑا زور تھا۔ جانے کون سی عینک آنکھوں پر چڑھائے

بیٹھے تھے کہ کوئی صورت لکھ کر نہ بھائی۔ یہی وجہ تھی کہ یہاں کے

اوپر پہلے کو آئے مگر اب تک بھی آدم نہ کسی گم نام حوا کو کھو جتے تھے۔
 شہزادہ کی بی بی بھلی بری صورتیں تو آنکھوں سے گزری ہوں گی، مگر دل بچ
 کوئی نہ چڑھی۔ بڑی چچی کے قریبی سگون میں آتے تھے۔

بڑے بڑے کھیتے تھے۔ ان کی مہیچک میں ایسی بڑی بڑی آری
 چوڑی کتا بیبا نہیں کہ ضرورت پڑنے پر چاہو تو تکیہ بنا کر لے لو سکتے
 والے سید صاحب کے بیٹے تھے۔ قریبی عزیز داری تھی مگر آنا جانا
 سب موقوف تھا۔ بات کچھ بھی تو نہ تھی۔ نصیر میاں کے باپ علی گڑھ
 جا کر پڑھ آئے تھے۔ اس زمانے میں علی گڑھ جانا لندن جانے سے کم

نہ تھا۔ اور پھر یہ یوں ہی کورے تو نہ چلے آئے تھے۔ ایم اے، ایل
 ایل۔ بی کی لائسنس چوڑی ڈگری ساتھ لائے تھے، اور ایک فوٹو بھی تھا۔
 کالا کالا جیسے سلیم، سر پہ تریجی ٹوپی لگائے پورے خاندان والو
 میں وہ فوٹو دکھاتا پھرا۔ اور کئی لوگوں نے تو کچھ اس بھی باندھ لی،
 مگر بیچ میں یہ کہتے آں پڑے۔ علی گڑھ سے آئے آتے انور میاں اپنے
 ساتھ ایک دلاہتی کتا اور کتیا لے آئے تھے، جو ان کے کسی انگریز
 دوست نے بطور تحفہ دیے تھے۔ یہ بڑے بڑے حجام برے کتے تو

دور سے دیکھ کر تو شیر سے نظر آتے۔ اس زمانے میں پورے خاندان
 پر وہ اظہار کی حکمت تھی۔ نماز روزے کے وہ بڑے پابند تھے۔
 وہ درج کئے وہ ایک۔ بچنے کے چار پانچ روزے تو کہیں نہیں گئے

تھے ہر جمعہ کو روزہ ہوتا۔ جب اس روز سے دیکھا کہ میاں انور اپنے
 ساتھ کتے بھی اکٹلا لے ہیں تو پچھلے پیر روزے سمجھا یا کہ تو کچھ میاں
 جیسے گھر میں کتے جو رہتے تھے قریبی نہیں آتے۔ فضول بنا چکا

ہوتی ہے۔ انہیں سنانور ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے نوح فرمایا ہے۔ مگر
انورمیاں کا گھر میں آجہاں ہی بند ہو گیا۔ اب یہ بات اکتے غصے
چنے کی بھی نہ تھی، مگر غصہ میں تو ایک فرشتہ بھی شیطان بن جاتا ہے۔
دادا حضرت نے جیسے ہی اکھاڑ پھینکی، اور ان کو گویا ذات باہر ہی کر
دیا۔ انورمیاں بھی دھن کے اندر یادہ صحیح لفظوں میں اپنی منہ کے
ایسے بچے تھے کہ ذرا بھی نواثر نہ لیا اور ادھر سے غیر کھن کی بیگم بھی
بیاہلائے۔

انورمیاں کا جب بھی ذکر نکلتا تو بڑے گھروالے لخصے "اجی اکی
کتے والے سید انور" کہہ کر یاد دلاتے۔ اور پھر ایسا ہوا کہ کتنے مٹتے
انورمیاں کا نام ہی "کتے والے سید صاحب" پڑ گیا۔ مگر یہ فرد سچا
کہ کتے تو پالے، مگر کیسے جو اپنے معمولات میں ذرا بھی فرق آیا ہو۔
دلو ان خالے کے باہر ہی ایک چبوترہ سا بنا دیا گیا تھا۔ جہاں دن
بھر یہ دنو کتا کتیا بیٹھے آنے جانے والوں کی پریڈ لیا، کہہ تے تھے۔ یوں
تو علی گڑھ سے انگریزی پڑھا آئے تھے، ڈھیر ساری کتابیں چاٹ
والی تھیں۔ مگر کتے وہی کتے سیدھے مسلمان۔ اور خود کتا تو بولتے۔
"انورمیاں یہ علم ہیں یہ تھوڑی ہی سکھاتا ہے کہ اپنا دین اور
نہیب چھوڑ کر عیسائی بن جائیں۔" یوں پہننے کو کوٹ پتلون بھی
کبھی کبھار پہن لیتے، مگر رتے مرنے، وضع داری نہ چھوڑی۔ وہی
فری پا حمار۔ کھلی آستینوں کا کرتا چار کئی والا۔ سر پر پامپڑ
میں ایک اور ہاتھ میں نانا ہادیاں وہی ہوتی چھوڑی۔ کھانے کی مناز
کھانے کی طرف ہوتی۔ ان مناز کی ناز میں اکثر تھک جاتے۔

یہ ہے۔ "کھانے کے بعد کم بخت کسی کام کا نہیں رہ جاتا میں۔ بڑی ٹنگی آ جاتی ہے آنکھوں میں۔"

انہی کی اولاد دی نھیر میاں تھے۔ جیاینج ویلا پودا۔ ان کے دامنے میں بھی ڈھیر سارا علم بھرا پڑا تھا۔ عمر کہاں کی کہاں پہنچ رہی تھی۔ نگاہ تک کنوارے ساند بنے پھر رہے تھے۔

باپ چڑچڑاتے۔
"ارے کم بخت تجھے تیرے علم نے یہی سکھایا ہے کہ سونگھ سونگھ کر چھوڑ دے۔"

نہیں کر رہ جاتے۔ باپ تو اس طرح چھو چھو کے باپ بھی ہو گئے تھے، یہ ابھی تک پٹنگیں اڑاتے پھرتے تھے۔ کہتے تھے۔
"جب تک کنوارے ہو، بچے ہو۔! شادی ہوئی کہ پڑھا لپے نے آگیرا۔" اپنے بھائے اب تک بھی بچے ہی بنے پھر رہے تھے۔
شام کو چار بجے روف میاں گھر لوٹنے لگے تو سچو مان نے کہلا بھیجا۔

"اچھے ماموں میاں کو سلام کہہ دینا ہمارا۔" روف میاں نے گردن اٹھا کر اسے دیکھا اور سر ہلادیا۔

یہ سلام کلام میاں تک بروئے کہ اب شجوا مان جان جان کر پہاڑ سے سمجھنے لگیں، حساب غلط کر کر جاتیں تو پھر نھیر میاں ہی ایسے ہوتے جو غلطیاں نکالتے۔

واہ! سمجھتی واہ۔ یہ کوئی حساب ہوا۔ سولہ دو فی تبیں پہلے ہیں۔ آپ چھتیس تبار ہی ہیں۔" یہ جھینپ کر رہ جاتی۔ مسکرا پڑیں

پہلے راجن اشو گیا تھا۔ جو کھول کے سکراتی، تھپتھپاتی بھجرت
کی بات یہ تھی، شجومان سوچتا، کہ ہزار منتوں سے پکار لے کے باوجود
اکہل بھی کو آؤ داڑا تھا۔

اور پھر بڑی ان ہونی سی بات یہ بھی ہوئی کہ شجومان نے بقرعہ
پرانہی پسند سے ہری بانگیں سپنیں، ان کے آگے پیچھے سرخ و ننگ کے
عورت چڑھوائے، اور پیسے ادا کر کے منہاری کو جب سلام کیا تو اس
نے بھی دل بھر کے دعائیں دیں۔

"اللہ سہرے کے پھول کھلائے، دلہن بنائے، جی کے ارمان
پھلکالیں۔ ہمارا بھی بھلا ہوئے۔" اور شجومان جو کسی کے سمجھنے سے یہ
دعائیں سن سن کر سفید پٹہ جاتی تھی، شرم سے نپ کر دو دھڑکیں آہلی
گاجر کی طرح کی لال لال ہو گئی۔

اور بڑی بات یہ کہ شجومان، جو پورے خاندان میں گھر گھنی مشہور
تھی بھیلی بھیلی کر ماں سے کہتی۔

آاں، آخر انور چھاننے کے پال لئے تو کیا گناہ کر ڈالا تھا۔
نمرب تو نہیں بدل لیا تھا نا۔؟ اب کر لے دل لے تو مر کھپ کے مٹی
میں مل گئے، فضول آپس کی برائی سے کیا فائدہ؟ آپ ان کے گھرا تیں
جائیں کیوں نہیں۔؟

نیرمیاں جو بھانجے کی خبر لینے آتے تو گھنٹوں خبر ہی لیتے رہتے۔
کبھی کھانا کبھی چائے اور کبھی یہ نہیں تو خالی پان ہی ہسی۔ شجومان
جس دن دنیا سے منہ موڑے وہاں ہی بیٹھی تھی، پھر آدم حوا کی ہنسی
چھوٹا دنیا کو پلٹ رہی تھی۔

اور اب تو ایسا بھی تھا کہ نصیر میاں کو کھانے پر روک دیا اور
خود ہی کوئی میٹھا بنانے لپک پڑی۔

بات چیت کا موضوع بدلتے بدلتے اس پر بھی آگیا۔
”آپ نے شادی کیوں نہیں کی؟“

”پسند کی کوئی لڑکی ہی نہ ملی۔ اور جب لڑکی مل گئی تو اپنی عمر
ڈھل گئی۔ مگر کوشش کریں گے کہ تقدیر بدل جائے۔“ نصیر میاں
مسکرا کر بولے۔ ”آپ بھی دعا کیجئے۔“

صاف اشارہ تھا۔ اس سے زیادہ اور کوئی کیا کہہ سکتا ہے؟
شجوان شرملا گئی، منہ تپ گیا۔ آنکھیں اسٹاکر لولی۔
آپ کوشش کیجئے۔ میں دعا کر دوں گی آپ کے لئے۔“

پورے خاندان میں ارٹ گئی کہ رزاق میاں والوں اور کتے
والے بید صاحب کی آپس میں میل ملاقات ہو گئی۔ اور حرمِ فاسنی
خیز خرپا سننے اور سانے کے دلدادہ تھے انہوں نے یہ بھی اڑا
دیا کہ نصیر میاں گھنٹوں رزاق میاں کی جوان بیٹی، جوان بیاہی
ہے، کسے ہاں جا جا کر بیٹھتے ہیں۔ اب آگے اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔
سانے کچھ بات بھی ہونیوالی ہے۔

لاکھ بات بھی ہونیوالی تھی، مگر سستی تو کنواری ہی شجوان
نے اُد بچے بچے سمجھائے کے لئے الفاظ ڈھونڈے بھی، مگر بے نہیں۔
شجوان ایسی ویسی عمر اور چال کی تو سستی نہیں کہ سمجھانے سمجھانے
کی ضرورت پڑتی۔ بولتیں بھی کیا۔ پھر بھی دبی زبان سے کبھی کبھار
کہہ دیا کرتیں۔

”زمانے والوں کے منہ کھلے ہیں بیٹی، ہمارے چھوٹی سی بی بی، بھری، دو بچوں کی ماں، عاف رگاہی دیا لگنے والوں نے کہ انومیال سے منہستی ہیں۔ انومیال ان کے رشتوں کے سبھا آتے تھے۔“

شجومان نے سنا ضرور، مگر یہ نہ سمجھا کہ یہ عاف ان پر ہی چوٹ ہے۔

نصیر میاں بھی مسکرا کر بات کرتے تعلیم یافتہ تھے۔ ڈگری یافتہ تھے۔ ہزاروں میں اٹھنا بیٹھا تھا۔ بات کرتے میں منہ سے سچول جھڑتے تھے۔ دل کے کھوٹے نہ تھے بیچارے، درنہ ہزار بار تو کھڑوڑ تنہائیاں میسر آئیں۔ کوئی جیبے ہونے تو کچھ تو نیت میں فتور آتا، مگر انہوں نے تو کبھی کوہا تھ تک نہ لگایا۔ پال بھی یہ بنا کر دیتیں تو کہتے۔

”وہاں میز پر رکھ دیجئے، ابھی حساب میں الجھا ہوا ہوں۔“
نصیر میاں کی قدر و قیمت انہی باتوں سے شجومان کے دل میں دگنی ہو گئی تھی۔

شجومان کی دھندلائی آنکھیں، جونیند سے بگناہ تھیں، اب سینے دکھتیں۔ ایک پٹے پرانے کپڑوں والا شہزادہ ان کے دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ یہ دروازہ کھولتی ہیں۔ وہ چپ چاپ کھڑا مسکراتا ہے۔ پھر یہ مسکراہٹ انہی پھیل جاتی کہ خواب ٹوٹ جاتا ہے۔ نظر آنا کہ چھپے پر کھڑی کون کے پیروں میں سونے کی پائیلیں باندھ رہی ہے اور ہزاروں کوئے اپنے کالے کالے پر پھٹ پھٹاتے

کابٹن کاٹیں کرتے اڑے چلے جا رہے ہیں۔ پروں کی پھٹ پھٹ آنہی
تیز ہوتی کہ شجرہ مان کی آنکھ کھل جاتی۔

شہر ممنوع

دادی بی نے ادھر کئی دنوں سے کہانی نہیں سائی تھی۔
آج وہ پھر پاندان گود میں لئے کہانی سنا رہی تھیں۔
”ہا — بیجاری شہزادی۔ تھی نالصبیوں کی پوری شہزاد
کو ہر ہر طرح ناز و نعمت سے رکھا، کھلایا پلایا، اس کی محبت اپنے دل
میں پالی، اور آخر کو وہ دغا دے گیا پیاروں پیٹا کبوتر کی طرح پھر سے
اڑ گیا یہ کہہ کر کہ۔“

”چین دیش کی شہزادی نے مجھ سے کہا تھا کہ جب تیرے لوہے
کے جوتے گھس جائیں گے تب شادی کر لوں گی، اب اس کے جوتے سفر
میں گھس گئے تھے۔ چلو شہزادہ چین دیش کو چلا گیا اور کہانی ختم۔“
آج اسحاق چچا کلائمیکس میں گرڈ بڑ پیدا کرنے عین موقع پر نہ
ٹپکے۔ بڑے آرام سے آئے، ٹوپی پلنگ کی ٹیپی پر دھری، اچکن اتار کے
کھونٹ سے مانگی اور لوہے۔

”کیا زوردار شادی کی سبھی۔ دلہن والوں نے مسہری کے
ڈنڈے سونے کے دیئے اور سونے کے پازیب کے علاوہ پاندان
بھی سونے کا دیا۔“

”کس کی شادی کا ذکر ہے میاں۔؟“ بڑی چچی جھپکیاں لیتی

پڑی تھیں، کر دٹ بدل کر بولیں۔

”ارے آپ کو نہیں معلوم! نصیر میاں کی شادی سے تو آ رہا ہوں۔“

”ہائیں۔!“ بڑی چچی ہڑبڑا کر اسٹھٹھیں۔ ”نصیر میاں کی شادی؟ ہمیں تو رقعے بھی نہیں آئے مگر.....“

اسحاق میاں نے مہن کی زور دار کالی دی۔ ”وہ کتے کے بچے حمید میاں کے ہاتھوں میں انتظام سٹھانا۔ وہ تو ہم سے کانٹے ٹکھاتا ہے مجھے تو جیل میاں راستے سے پکڑے گئے۔“

”کس کی بیٹی کی؟“ بڑی چچی نے ڈرتے لہجہ میں پوچھا۔

”غیر کھٹ کی ہے۔ نواب جانی کی پوتی ہے نا۔ اتنے دنوں سے یہی

تو جھنجھٹ چل رہی تھی۔ بڑی کوشش سے ہوا یہ پیام!“

”ہاں، تو سبھی وہ کہانی ختم ہوئی۔ اب یہ دوسری سنو۔ ایک

سٹھا.....“

”دادی بی۔!“ آنسو بھری آنکھیں لئے، دونوں ہاتھوں سے

اپنا دل پکڑے شجومان پوری طاقت سے چلا اٹھی، ”آپ یہ کہانیاں مت کہہ کیجئے۔ آپ اپنا وقت الگ برباد کرتی ہیں اور دوسروں کی زندگیاں بھی تباہ کرتی ہیں۔“

شجومان اتنی زور سے چلائی تھی کہ بچوں نے سہم کر اپنے چہرے قاعدوں کی آڑ میں کر لئے۔

”ادنی۔ میں نے کس کی زندگی تباہ کی، کہانی جیسی کہانی

تھی، سادی۔ اے لو اور سنو۔“ اور وہ منہ میں پان دبا کر کٹ

کٹ چھالہ کاٹنے لگیں۔

اک دم شجواں کے سارے بال سفید پڑ گئے۔ چوڑیاں آپ
ہی ٹوٹ ٹوٹ کر گر گئیں۔ آنکھیں دھندلا گئیں اور گالوں پر
جھریاں پڑ گئیں۔ اور پھر کانپتے ہاتھوں سے شجواں نے بغدادی
قاعدہ اٹھایا اور بھرائی ہوئی آواز سے پڑھانے لگی۔

”پڑھو میرے بچو۔!“

الف سے انا۔

بے سے بکری۔

تے سے تلوار۔

گلستان سے قبرستان تک

اور اسی رات منوچھا شہر روانہ ہو گئے۔

سوچ رہی ہوں اس کہانی کو کس طرح شروع کروں؟ اگر یہ کہانی کسی راجہ یا رانی سے متعلق ہوتی تو بلاشبہ میں وہی روایتی انداز بیان اختیار کرتی۔

”ایک تھا راجہ، اس کی سخی ایک رانی۔“

مگر بڑی بات تو یہی ہے کہ یہ راجہ رانی کی کہانی نہیں ہے۔ یہ میری کہانی ہے۔ یہ میری دادی اماں کی کہانی ہے جو رانی نہیں تھیں۔ عام انسانوں جیسی انسان تھیں جن کے دل میں مانتا سخی، پیار تھا۔ اپنے گھر سے، اپنی زندگی سے، اپنے بچوں سے، اس گھر سے جو کسی زمانے میں کسی طرح ایک محل سے کم نہ رہا ہو مگر آج ایک کھنڈ ہے۔ یہ کہانی اسی کھنڈ سے متعلق ہے اور یہ ان دلوں کی بات ہے جب میں اپنے امتحان سے فارغ ہو کر گاؤں لوٹی تھی۔

”گاؤری“ گلستان“ میں داخل ہو رہی تھی۔ میں نے یونہی نظر اٹھا کر بڑے سے بچہ ایک کی طرف دیکھا اور میں کانپ کر رہ گئی۔ ہمارا یہ

پرانا مکان، جس میں نہ جانے ہماری کتنی کتنی زندگیاں بسر کر چکی تھیں۔ اب اس کی یہ حالت ہو رہی تھی کہ کلس اور میارے جھڑنے لگے تھے۔ سفیدی جگہ جگہ سے کھرچ گئی تھی اور درود دیوار پر عجیب سی دیواری چھائی ہوئی تھی۔ گاڑی بان نے زور سے قمی چلائی اور بیل دھڑ دھڑ کرتے پھاٹک سے گزر کر 'گلستان' میں داخل ہو گئے۔ ٹپ ٹپ دوا نسو میری آنکھوں سے گر پڑے اور میں بوجھل دل لے کر سگاری سے کود پڑی۔

دادی اماں اپنا پانڈاں کھولے بیٹھی تھیں۔ سامنے صفائی پر ہرے ہرے پان چھپے ہوئے تھے اور وہ بڑے اطمینان سے کھتا چونا تصویر رہی تھیں۔ سب سے پہلے میری توجہ جس چیز نے کھینچی وہ چاندی کے اس بڑے سے پانڈاں کی کھپیاں تھیں جن میں برائے نام چھالیہ کی دو تین ڈلیاں اور دس بارہ لونگیں پری تھیں۔ ابھی آنکھوں کی نمی خشک بھی نہ ہونے پائی تھی کہ میری آنکھیں پھر سے نم ہو گئیں۔ میں نے دادی اماں کو سلام کیا۔ انہوں نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا اور پھر اٹھ کر زور سے لپٹا لیا۔ اکدم میں نے محسوس کیا کہ دادی اماں بیدار ہو گئی ہیں۔ پہلے جب وہ یوں مجھے لپٹا لیا کرتی تھیں تو مجھے کی زیادتی کا احساس ان کے نرم اور دبیز بازوؤں سے ہوا کرتا تھا، مگر اس لمحے میں نے محسوس کیا کہ وہ بڑے بھرے بازو اب لکڑی سے زیادہ سخت ہیں۔

دادی اماں یہ اتنے سارے پان کس لئے بنا رہی ہیں آپ؟“
میں نے اپنی رقت چھپانے کے لئے بے معنی سا سوال کر ڈالا۔

۲۰۷ گلستان سے قبرستان تک

دادی اماں کی بوریسی آنکھیں ایک لمحے کو چمکیں، پھر وہ دھیر سے مسکرا کر بولیں۔ "سینٹھ صاحب آئے ہیں۔" ان کی مسکراہٹ میں درد گھلا ہوا تھا۔

"سینٹھ صاحب ! میرا مانتھا ٹھنکا اور دل دھڑک کر رہ گیا۔" کیوں خیر تو ہے۔؟" میں گھبرا کر بولی۔

"مکان کا جھگڑا چل رہا ہے سارا۔" وہ بینزاری سے سروتہ چلاتے ہوئے بولیں۔ میری آنکھوں میں آنسو امانڈ آئے۔ دادی اماں کی کمزور انگلیوں میں اتنی بھی تو سکت نہ رہ گئی تھی کہ چھالیہ ہی کاٹ سکیں۔ میں نے ان کے ہاتھ سے سروتہ لے لیا۔

"لائیے دادی اماں، میں چھالیہ کاٹتی جاؤں اور آپ مجھے یہاں کی باتیں سنائیے۔ اتنے دنوں بعد لوٹی ہوں، میرا دل چاہ رہا ہے خوب سی باتیں سنوں اور سناؤں۔"

"گلستان رہن رکھ دیا گیا ہے۔" دادی اماں نے ابھی جملہ پورا بھی نہ کیا ہو گا کہ سروتہ میرے ہاتھ سے چھوٹ گرا۔

"گلستان رہن رکھ دیا گیا ہے ! مگر یہ ہوا کیسے۔؟" میں چیخ اٹھی۔

"سب قسمت کی بات ہے بیٹی۔" اور دادی اماں سر جھکا کر

گھوریاں موڑنے لگیں۔

بڑے چچا، منو چچا اور میں اس رات ٹہری دیر تک باتیں کرتے رہے۔ آدھی رات گئے جب میں اپنے بستر پر لیٹی تو نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ بازو دالے کمرے میں دادی اماں سو رہی تھیں۔

اس کے بازو والے کمرے میں بڑے چچا، اور داہنے ہاتھ والے کمرے میں منو چچا سو رہے تھے۔ سچو سچی کے کمرے میں تہی جل رہی تھی، مگر تھوڑی دیر بعد وہ بھی بجھ گئی۔ سارا گھر سو رہا تھا اور میں پری جاگ رہی تھی۔ میں دھیرے سے اپنے پلنگ پر اٹھ بیٹھی۔ سفر کی ٹکان سے میں نڈھال تھی، اور یوں اٹھو اٹھو اس وقت گہری نیند میں ہونا چاہیے تھا، مگر گلستان کے ٹوٹے ہوئے کلس میری نگاہوں میں تھے۔ ہماری دوکانیں ہماری زمینیں، ہماری جائداد؟ یہ سب کدھر گیا میٹ ہو گئیں؟ ان کی آمدنی کیا ہو گئی؟ کہ اب یہ نوبت آگئی تھی کہ گھر شکستہ حالت میں پڑا تھا۔ مگر انہیں مرمت کے لئے پیسہ نہ جڑ رہا تھا؟ میری آنکھوں میں دھند سی چھانے لگی۔ شاید یہ آئندہ ہی تھے۔!

میں نے سر ہانے سے قندیل اٹھائی اور دالے پاؤں کمرے سے باہر نکل گئی۔ سب سے پہلے میں بڑے دالان میں گئی۔ رات کے اندھیرے میں بھاری بھر کم ستون بڑے بھیانگ لگ رہے تھے۔ میں نے قندیل اوپر اٹھائی اور دیکھا۔ جگہ جگہ سے سفیدی جھڑ چکی ہے اور جھڑ رہی ہے۔ میں نے قندیل پھر نیچے کر لی۔

دیوان خانے کے دروازے پر میلا میلا سا پردہ لٹک رہا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر پردے کو آہستگی سے تھاما اور اپنے کانوں پر دگڑنے لگی۔ بڑی محویت کے عالم میں میں بہت دیر تک یونہی کھڑی رہی۔ پھر میں نے قندیل اٹھا کر دیکھا۔ پردے میں جگہ جگہ سوراخ ہو رہے تھے اور ایک جگہ بہت بڑا پوند لگا ہوا تھا۔ میں نے دھیرے

سے پردہ چھوڑ دیا۔ گرد کا ہلکا سا بادلی اٹھا اور میں نے منہ میں پلر
بولس لیا۔

ایک ہاتھ میں قندیل اٹھائے اور دوسرے ہاتھ سے اپنے
پانچے سنبھالتی ہوئی آگے بڑھی۔ اب سامنے والا کمرہ میری نظر
کی زد میں تھا۔ یہاں ہمیشہ سے ہمارے خاندان کی بڑکیاں ہال
بٹھائی جاتی رہی تھیں۔ یہاں ان کے ہنسی لگائی جاتی، ہسی
لگائی جاتی۔ یہاں ان کے سہاگ چڑھتا۔ آرسی صحت ہوتا
اور یہ کمرہ دلہنوں کے ساتھ ساتھ سراپا دلہن بنا رہتا۔ یہاں
ریشمی پھولدار اٹلس کے سرخ پردے لٹکے ہوتے۔ ماسن روزانہ
چھوڑوں کے گجرے اس کے دروازے پر لٹکا جاتی۔ خوش بوؤں
اور پھولوں سے مہکا مہکا تا یہ کمرہ! میں نے قندیل اٹھائی دیوار پر
سلا اور ان میں دھیں پڑی ہوئی تھیں۔ پردے سرے سے نثار
اور پھولوں کی خوشبو کی بجائے ایک بدبو کا جببکا میری ناک میں
گیا۔ میں نے قندیل اندر کی اور دوسرے ہی لمحے باہر کھینچی۔ دو
آنسو میری آنکھوں میں اٹھ آئے جنہیں میں بڑی خوبصورتی
سے پٹی گئی۔ اندر کتب خانے بچے دے رکھے تھے۔

پھر دھیرے دھیرے میں قندیل نے تمام کرداروں کو گھومتی
رہی۔ میرے غارے کے پانچے آہستہ آہستہ یوں سرسرا رہے
تھے تو یا سسکیاں سی لے رہے ہوں۔ میں دھیرے سے کچھو آرا
کے حصے میں نکل آئی جہاں پھولوں کے درخت تھے، پھولوں کے درخت
تھے اور تنہے رینگ رہی پھولوں کے پودے تھے۔ یہ

جھوٹے جھولتیں۔ پیالہ کے گیت گاتیں۔ برہ کے راگ چھڑتیں اور خستیں بولتیں مگر اب پتے سوکھ چلے تھے۔ صرف انیم کا درخت باقی رہا تھا جس کی ایک مضبوط سی ڈال سے ایک بوسیدہ سی سی لٹک رہی تھی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کی مضبوطی دیکھنی چاہی تو وہ ایک جھٹکے سے میرے ہاتھوں میں آگئی۔ پھولوں کے پودے بے برگ و بار تھے۔ میں نے قندیل پیوٹرے پر رکھ دی اور خود وہیں بیٹھ گئی۔ اپریل، مئی کا عادت نیلا آسمان میرے پر تھا۔ غم ناک سی ٹھنڈی ہوا تھی۔ ادھر ادھر کھرے ہوئے تارے اور اس چاند سا راما حول مجھے گلستان کی بے بسی پر ماتم کرتا نظر آیا۔ میں نے پتھر پر پڑکا دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

یہ گھر۔ یہ محل۔ یہ گلستاں۔ ہمارے اسلاف کا بنایا ہوا پر شکوہ مکان۔ جس میں جلنے ہمارے کتنی لپٹیں گزریں۔ اگر کبھی کوئی اینٹ بھی جھڑ گئی تو ہم نے اپنا خون پانی کر دیا۔ اب اس حالت میں پڑا ہے کہ رہن ہے اور اینٹیں جھڑتی ہیں تو چونکا کر ابھی نصیب نہیں ہوتا۔ آج رہن پڑا ہے۔ کل نیلام آگے لگا۔ اور ہماری عزت، برسوں کی محبت اور اس کے چپے چپے سے کیا ہوا بے لوث پیار مٹ جائیگا۔ اینٹ سے اینٹ بچ جائے گی اور پھر کون جالے ہمارا کیا حشر ہو۔ ہاں اور داوی اماں جنہیں بڑے چچا، منو چچا، پھوپھی سے بھی شاید اتنی محبت نہ تھی جتنی اس گھر سے، اس محل سے، جو اب کھنڈر ہوتا جا رہا تھا۔ کیا داوی اماں کو اس کا احساس نہ تھا۔ یا پھر روزانہ دیکھتے دیکھتے وہ اس کی

۲۱۱ گلستان سے قبرستان تک

زبوں حالی کی اتنی عادی ہو گئی تھیں کہ انہیں فرق ہی محسوس نہ ہوتا تھا۔ بنگا۔ تان کو رہن رکھنے کی غرض و غایت جب مجھے معلوم ہوئی تو ایک لمحے کو میں بھونچکی ہی رہ گئی۔ مکان رہن رکھ کر مکان کی مرمت کو پیسہ حاصل کرنا! اتنی مفصلہ خیر بات تو میں نے کبھی نہ سنی تھی۔

”زمیندار کے قرضوں، بنگانوں کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اماں گھر کی مرمت کرانا چاہتی تھیں، اور اسی لئے اسے رہن رکھ دینا پڑا۔“ منوچھا کے منہ سے یہ الفاظ سن کر میں باوجود غصہ کے بھی مسکرانے سے باز رہ سکی۔ مگر میری مسکراہٹ میں نشتر چبچے ہوئے تھے۔ مگر یہ نشتر میرے ہی سینے میں پیوست ہو گئے۔ جب میں نے دیکھا کہ گلستان کیسے کیا ہو گیا ہے۔ اتنی طویل مدت کے بعد آج میں گاؤں لوٹی، اور گلستاں کو دیکھا تو پاگل ہوا تھی۔ میں، جسے اس مکان سے ایسا کوئی خاص السن بھی نہ تھا۔ مگر دادی اماں، جو ایک بچے کی طرح اس کے چچے چچے کی دیکھ کر کیڑ کر تی رہتی تھیں! دادی اماں کے سوکھے بازو، مجھ لوں سمرا اور اس چہرہ اور غم نم سی آنکھیں میری آنکھوں میں گھوم گئیں۔ قندیل ایک لمحے کو زور سے بھڑکی، تنواری دیر بھر گتی رہی اور بجھ کر رہ گئی۔ میرا دل کانپ گیا۔

پرانے وقتوں کی لے دے کے دو چار چیزیں ہی ایسی رہ گئی تھیں جنہیں دادی اماں متاعِ گم شدہ کی یادگار کے طور پر سینے سے لگائے ہوئے تھیں۔ چاندی کا بڑا سا پاندان۔ منوچھا کی ہونیوالی

دلہن کا جڑاؤ گونبدہ۔ پچھون سبھی کے دلہا کی انگوٹھی، جس میں سچا ہیرا جڑا ہوا تھا اور خود دادی اماں کے کانوں کی ہیرے کی لونگیں جو دادا ابانے آج سے سالوں پہلے دادی اماں کا منہ دیکھ کر میلی رات کو مینائی تھیں۔ ان چیزوں کا بیچ رہنا اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ دادی اماں کو انتہائی عزیز ہیں جنہیں وہ کسی صورت اپنے سے جدا نہیں کرنا چاہتیں۔

پچھون سبھی بیمار ہیں، اور ایسی پٹری کہ ان کے کنوارے اور معصوم بچے سدا کے لئے بکھر کے رہ گئے۔ جانے وہ کب سے دق میں گھل رہی تھیں۔ انجا ہر وہ نہتیں، بولتیں، کھاتیں، مگر ان کے ہر انداز سے ایک بے نام سا غم ٹپکتا کسی نے سمجھا کسی نے نہ سمجھا۔ مگر میں سمجھ گئی کہ اس ماحول میں جو بھی ایسا حساس دل لے کر پیدا ہوگا وہ یقیناً دق میں مبتلا ہو جائے گا۔ ان کے دلہا کے لئے جو ہیرے کی انگوٹھی دادی اماں نے بطور سلامی دینے کے لئے رکھ چھوڑی تھی۔ وہ جوں کی توں رکھی تھی۔ بیماری کے علاج کے لئے کسی نے اس کو توڑنے کے بارے میں سوچا تک سبھی نہ تھا۔ اور جب کنوارے بچے کی ساری حسرتیں ادا دارمان سیٹھے پچھون سبھی ہمارے خاندانی قبرستان میں جاسوئیں تب بھی کسی نے یہ نہ سوچا کہ انگوٹھی توڑ ہی لیتے تو علاج کر دالے کی حسرت تو دل سے نکل جاتی! مگر ان کی موت کے چند ہی دنوں بعد میں نے دیکھا کہ دادی اماں نے وہ انگوٹھی نکالی اور سو میں بیچ آئیں۔ ما۔ ما۔ مٹی، چونا سارے گھر میں بکھرا نظر آنے لگا، بھگتیاں کی مریت ہو رہی تھی۔

دادی اماں کی دیوانگی دیکھ کر رونے تو بڑی بات ہے میں سہنس سبھی نہ سکتی تھی۔ وہ اس گھر کے پیچھے خود کو لٹانے پر تھی ہوئی تھیں۔ منو چچا نے بتایا تھا۔ "اماں نے گھر کی ہر چھوٹی بڑی چیز۔ زبرد، برتن، سجاری کپڑے وغیرہ توڑ ڈالے ہیں۔ بیچ ڈالے ہیں۔ ہر سال مرمت کرواتی ہیں مگر گھر پہلے سے بدتر ہوتا جا رہا ہے۔ وہ چاہتی ہیں ان کی آنکھوں کے۔ اسنے یہ گارنڈا حیرے۔ یہ انہیں نہ ٹوٹ ٹوٹ کر گریں۔ چونہ نہ اکھڑے۔ مٹا نہ جھڑے۔ مگر بادل پیٹے تو کون پویدہ لگا سکتا ہے۔" منو چچا نے مجھے یہ سب بتایا کہ پہلے پہل جب اماں کو تپہ چلا کہ مکان رہن رکھ دیا گیا ہے تو بہت پریشان ہو گئے جب اس کی مرمت کے لئے ان کے ہاتھ میں نووں کی گڈیاں تھا دی گئیں تو وہ یوں خوش ہو گئیں جیسے مکان رہن سے چھوٹ گیا ہو۔ یہ تو میں بہر صورت جانتی تھی کہ اب مکان نیلام رہیگا۔ مگر دادی اماں اسے اب تک پہلو تھمی کے بیٹے کی طرح چاہے جا رہی تھیں۔ مٹی، گکارا اور چونا ختم ہو گیا اور مکان کی آدھی مرمت بھی نہ ہو سکی۔!

"دادی اماں کلس تو بائکل برباد ہو گئے ہیں۔" میں نے ادھر بنگاہ اٹھائی اور دادی اماں کو مخاطب کیا جو اس وقت نیم کے جھاڑ کو پانی دے رہی تھیں۔ دادی اماں روزانہ سارے سو سکھے، بن سو سکھے، مرحہ بدئے جھاڑوں پودوں کو بلاناغہ پانی دیتیں۔ بھولیں مسکرا نا بھول چکے تھے۔ پتیاں جھوننا بھول چکی تھیں۔ ڈالیاں لہجی اپنے وزن سے نہ لچکتیں۔ مگر دادی اماں اپنے نرھن کو پوری پابندی

اور تندہی سے، خام و ستیا۔ سپر بھی جانے کیسی آگ ان کے رنگ
 لپے میں سراپت کر گئی تھی کہ پھولوں پوروں پر بار نہ آتا۔
 "کس بر باد ہو گئے۔" وہ جبرانگی سے بولیں۔ "کہاں دیکھ
 تو نے؟" مجھے اکرم اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ داوی اماں لپٹیلا
 کو بلند یوں تک لے جانے پر تلی ہوئی تھیں۔ انہیں معلوم نہ تھا
 کہ بلند یاں آپ زمین سے ہٹکار ہونے جھکی چلی آرہی ہیں انہوں
 نے اپنی پورھی آنکھوں پر سوکھے ہاتھ کا پردہ تانا اور گردن اٹھا
 کر اوپر دیکھنے لگیں۔ کنگورے جھڑ رہے تھے، کچھ جھڑ چکے تھے۔
 اور پیلی کے وہ چمکدار کلس، جو دھوپ میں سونے کے مانند
 جم جم چمکا کرتے تھے، مدھم پڑ چکے تھے اور دو تین جگہ سے ٹوٹ
 گئے تھے۔

دادی اماں نے تھرا دیا اور کانپتی ہوئی اندر چلی
 گئیں۔ دوسرے دن منہ چاکی ہونے والی دھن کا گلو بند ہاتھ میں
 لئے نظر آئیں تو میں باوجود خوشش کے اپنے کوسہ سبک سبک کر
 رونے سے باز نہ رکھ سکی۔

میں نے طے کر لیا کہ اب پڑھنے نہیں جاؤں گی۔ بس یہ
 پڑھائی ہو چکی۔ دور رہ کر میں قطعاً نابالغ تو نہ تھی کہ میرے اخراج
 کس طرح پورے ہوتے ہیں، مگر اتنی گہرائی سے تو میں نے ہر نہ ہرگز
 نہ سوچا تھا۔

بارشیں شروع ہو چکی تھیں اور گلستان کی ہر اڑنیٹ، ہر پتھر
 رحم کی درخواست کرتا نظر آتا۔ میں دلہنوں والے کمرے میں تھکتی

تو مجھے وہاں سچو سچی نظر آئیں۔ ہاسٹنوں میں گجرے، پیروں میں پازندہ
 تیلی تیلی انگلیوں میں جگمگاتی انگلیٹھیاں اور گلے میں دہی جڑاؤ تلو بند
 سرخ سرخ کپڑے پہنے، دم جھینپی جھینپاتی کیسی گڑیا سی لگیں اور
 پھر بادل گر جتے، بجلی چمکتی تو مجھے تصور حقیقت کی دنیا میں لاسکتا
 چونا جھڑتا ہوا کرہ، بوسیدہ دیواریں اور اطلس پردوں کی بجائے
 کھدر کا پیوند لگا پردہ۔ موتیا اور گلاب کے سھولوں کی خوشبو کے
 بدنے بدلو کے جھونکے آتے اور پردہ اڑتا تو میں دیکھتی اندر کتیا اپنے
 درجن سمجھ بچوں کے ساتھ بیٹھی ہے۔

میں۔ بزمان دنوں کھانا پینا چھوڑ رکھا تھا۔ زندگی کے بارے
 میں اتنے منہ پیلو سے میں نے پہلے کبھی نہ سوچا تھا۔

دادی اماں بیمار ہی تھیں، مگر بیماری نے زور بیکڑاؤ لستر سے
 لگ گئیں۔ چاندی کا پاندان، گلو بند اور انگلیوں کی تو اب گلستاں کی
 جھینٹ چڑھ چکے تھے۔ اب ان کی ٹوڈوں میں ہیرے چمکا کرتے۔ وہ
 بار بار گرتی دیواروں اور بوسیدہ چھتوں کو دیکھتیں اور اپنے کانوں
 پر ہاتھ رکھ رکھ لیتیں۔ کانوں پر اس طرح ہاتھ رکھنے کا مطلب
 میری سمجھ میں کبھی نہ آیا۔ کیا وہ دادا اب کی پہلی اور آخری نشانی
 کو ہمیشہ کے لئے بچا رکھنا چاہتی تھیں۔ یا پھر وہ اس لئے کانوں
 پر ہاتھ رکھ لیتی تھیں کہ اب سے کبھی گلستاں پر کچھ نہ خرچ کر سکیں۔
 میں ان کے سر ہلنے بھی ان سے پرانے دور کی باتیں سنتی رہتی جب
 کہ گلستاں صبح معنوں میں گلستاں تھا اور میاں کی ہر چیز صبح معنوں
 میں سرسبز۔

”دادی اماں! مکان تو رہن پڑا ہوا ہے، سپر آپ اس پر اتنا بے سجاؤ کیوں خرچ کرتی ہیں؟“ ایک دن میں نے بہت جھنجھلا کر دادی اماں سے پوچھا۔

”رہن ہے تو کیا ہوا؟“ دادی اماں یقین اور اعتماد سے بھرپور منہسی منہسیں۔ ”اسی بیٹی آج رہن ہے، کل تو رہن منہسی رہے گا!“

میں کانپ اٹھی۔ دادی اماں اس منزل پر پہنچ کر کبھی ”کن“ سے امیدیں وابستہ رکھتی ہیں۔ میرا دل چاہا کہ دوں۔

”دادی اماں کل کے بھروسہ پر نہ رہیے۔ آج تو ہم سر چھپائے بیٹھے ہیں، کل کو شاید یہ سہارا بھی نہ رہ جائے۔ گلستان نیلام ہو جائے گا، پھر کیا ہوگا؟“ گھر نیلام ہو جائے گا! اس کے آگے میں نہیں سوچ سکتی تھی۔ سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

”پھر بھی دادی اماں، اتنے پرانے مکان پر اتنا پیسہ اٹھاؤ ٹھیک نہیں کچھ۔“ میں نے پرانی چھت کو گھورتے ہوئے کہا۔

اور دادی اماں تڑپ اٹھیں۔ ”ٹھیک نہیں تو کیا گھر کو گر جانے

دوں؟ یہ عزت بخوبی ہوئی ہے اسی کے سہارے ہے۔ صدیوں کی نبی عزت یوں لٹ گئی تو۔“ دادی اماں زور زور سے چلا چلا کر مجھے رنڈے لگیں۔ بڑھاپے کی وجہ سے ان کے کان سن ہو گئے تھے۔

اور وہ بہری ہو گئی تھیں۔ ان کے کان کے پاس منہ لے جا کر بات کہنی پڑتی، تب وہ سنتیں اور جواباً زور زور سے بات کرتیں۔

”میں ذرا اچھی ہو جاؤں، پھر میں موتیا کے پودے لگاؤں گی۔“

اور پھیانک کے پاس جو آم کا پیڑ ہے اس میں کھا دلوانی ہے۔ وہ نیم
سکا پیڑ تو بالکل برباد ہوا جا رہا ہے۔ منو بیٹے سے میں نے کہا بھی تھا
باغبانی پر کوئی اچھی سی کتاب منگا لے۔ تمہارے دادا کو کتنا شوق
تھانے نئے پودے اور سچلواں کا۔“

بادل گرج رہے تھے۔ بجلیاں چمک رہی تھیں۔ میں گھنٹوں
میں سردیئے، راکت و مامت بیٹھی تھی اور دادی اماں باتیں کئے جا رہے
تھیں۔ ”میں آم کے پیڑ میں کھا دلوادوں گی۔“ یہ کل پر اعتبار! اور
ایک اور اس میں شام کو نیم کے سائے تلے میں نائی ٹوپیٹ
تھی تو میں نے محسوس کیا اگر میں نے کتاب بند نہیں کر دی اور اس
اور پوچھل سائے سے اٹھو نہ بھاگی تو پھر کبھی دوبارہ سالن نہ
لے سکوں گی۔ آسمان پر جو گھٹا میں چھانیں ان کا مقابلہ میں اپنی
ان گھاؤں سے کرتی جو میری آنکھوں میں چھپی بیٹھی تھیں۔

دادی اماں فریش تھیں۔ نگہستان کی دیواروں سے مٹی تو ہر دم
ہی جھڑتی رہتی۔ ہر لمحے یہ محسوس ہونا گویا یہ محل دھڑام سے زمین پر
اُپر ہلکا۔ بارشیں بہت ہو چکی تھیں۔ بوسیدہ دیواروں میں پانی ٹپھر گیا
تھا اور آدھی آدھی اونچائی تک دیواریں نم ہو گئی تھیں ہر لمحے اس
بات کا خطرہ تھا کہ کوئی نہ کوئی دیوار دھم سے گر پڑے گی۔

ایک دن میں دادی اماں کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ منو چپا
اور بڑے چپا دیوان خانے میں بیٹھے سیٹھ صاحب سے باتیں کر رہے
تھے۔ شیخ صاحب بلند آواز سے چیخ رہے تھے اور بار بار میں کانپ

اشمعتی تھی۔ رہن کی تارنک قریب جا رہی تھی۔ سیٹھ صاحب جنانے
کے لئے آئے تھے کہ میلاد اٹھ جائیگا۔ میں شرط رکھی گئی تھی اور نہ کسی
رکھی جاتی تو انجام ہونا بھی کیا ؟

میں دم سادھے بیٹھی تھی نگر دل کا نب رہا تھا۔ اس لمحے میں
نے شکریہ ادا کیا کہ دادی اماں بہرہ ور ہیں۔ اگر وہ یہ سب کچھ سن لیتیں تو۔
اک دم دھڑام سے کسی چیز کے گرنے کی آواز آئی۔ جیسے بہت دور
کوئی چیز گری ہو۔ میں نے ادھر ادھر دیکھنا چاہا مگر کچھ سمجھ نہ سکی
کہ کیا چیز گری ہوگی۔ مگر دوسرے ہی لمحے دادی اماں اپنا لبہ مچھوڑ
کر اٹھ بیٹھیں۔ ”کوئی دیوار گری ہے گلستاں کی۔“ ”وہ اعدا دے
بولیں۔“ ”دیوار؟“ میں جبرست سے بولی۔ ”دادی اماں بہرہ رتھیں۔ ہاتھ
بہری۔ یہ آواز انہوں نے کہ صر سے سن لی۔“ ”آپ کو دھوکا ہوا ہے نا
دادی اماں۔ یہاں تو کوئی بھی آواز سنائی نہ دی۔“

دادی اماں۔ ”اے اپنے سفید بالوں کو ہاتھوں میں بھلا کر کہا۔“ یہ
بال عمر کے ساتھ سفید ہوئے ہیں گڑیا بیٹی۔ میرے دل میں کوئی
بیٹھا کہہ رہا ہے کہ کچھ ہوا غمور ہے۔“ اور وہ چلی مینہتی باہر کو نکل گئیں۔
ان کے اس ہاتھ سجھانے پر میں اتنی جبرست زدہ رہ گئی کہ انہوں
سہارا بھی نہ دے سکی۔ ان دنوں دادی اماں کو سہارا دیکر اٹھنا پڑتا
تھا اور وہ بغیر سہارے کے ایک قدم بھی نہ چل سکتی تھیں ! ان کے
پتے میں جیسا لپکی۔ پچھوڑے کے دالان کے قریب وہ جا کر رکھیں اور دم
سے پیچہ لگیں۔ سامنے اینٹوں اور مٹی کا ڈھیر پڑا ہوا تھا۔ دالان
کے سامنے دالی دیوار گری تھی۔

دادی اماں کو اٹھا کر پلنگ پر لٹا یا گیا تو میں یہ سمجھ رہی تھی کہ اب وہ کبھی نہ اٹھ سکیں گی۔ مگر دوسرے ہی دن میں نے دیکھا کہ وہ پلنگ پر بیٹھی رو رہی تھیں۔ ان کی بوڑھی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے، جنہیں وہ پونچھتیں تو اور زیادہ تیرا سے بہنا شروع ہو جاتے۔ رات کو بچی تھی۔ آسمان پر جوا کی تڑکی بدلیاں تیر رہی تھیں انہوں نے گھٹاؤں کا روپ دھارن کر لیا اور بوند باندھی ہونے ہوتے زور سے بارش ہونے لگی۔ پھر دادی اماں نے اپنے کانوں پر ہاتھ پھیرے۔ اورد دھیرے دھیرے کیلیں کھولنے شروع کیں۔

”وہ دیوار اٹھا دینی چاہیے منو بیٹیا۔ گھر کھنڈر بن کر رہ جائے۔“

برسوں کا اوٹ بندھن ٹوٹنے کو جا رہا تھا۔ ان لونگوں میں جو ہیرے چمک رہے تھے وہ صرف ہیرے ہی نہ تھے۔ اس چمک میں ہیروں کی چمک بھی تھی، اور محبت کی چمک بھی تھی۔ آرزوؤں، امانوں اور امیدوں کے اجالے اور چمک بھی تھی۔ یہ دو ہا دہن کا پیار تھا جو ہیروں کی شکل میں چمک رہا تھا۔ یہ وہ بندھن تھا جہہ موت بھی نہ توڑ سکتی تھی۔ دادی اماں نے چوڑیاں توڑ دی تھیں۔ پوت بھجوری تھی۔ رنگیں کپڑے اتار دیئے تھے۔ سُر لونگیں ان کے اپنے جسم کا ایک حصہ بن کر ان کے کالوں سے چمٹی رہیں۔ اور آج دادی اماں اس چمک کو اس پیار کو، اس محبت کو بیچ رہی تھیں جو ایک گھر سے کہیں زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔ وہ کیلیں کھول رہی تھیں۔ ان کی انگلیاں نہ پتے رہی تھیں۔ ان کے آنسو بہہ رہے تھے۔ آسمان بھی رو رہا تھا۔ میں بھی رو رہی تھی۔ ہر ذرہ رونانظر آ رہا تھا۔ اک دم منو چچا لے دو

اماں کے ہاتھ پکڑ لیے۔

”اماں آپ یہ لونگیں نہیں اتاریں گی۔ کبھی نہیں، کبھی نہیں!“
سائیں سائیں ہوا بچا چل رہی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا دادی
اماں کی بے بسی پر سکیاں بھر رہی ہوں۔

”دیوار گر گئی ہے بیٹیا۔“ دادی اماں بدقت بول پا رہی تھیں
”دیوار گر گئی ہے تو ایک عظمت گر جاتی ہے۔ دیوار گر گئی ہے تو عزت
بھی گر جاتی ہے۔ مٹی کے ساتھ ساتھ وہ پیار بھی گر جاتا ہے جو اس
مٹی کے ذرے ذرے میں رچا ہوتا ہے۔ مگر لونگیں اترتی ہیں تو محل
کی دیوار تو کھڑی ہو جاتی ہے۔ عزت بن جاتی ہے۔ پیار کا سر اونچا
ہو جاتا ہے۔ یہ لونگیں تو.....“ اور وہ پچھلک پڑیں۔

”اماں!“ منو چچا کو میں نے آج تک روتے نہ دیکھی تھی۔
”ان لونگوں میں بھی پیار رچا ہوا ہے اور ان مٹی کے ذروں
میں بھی بود کون۔ سا پیار رچا ہوا ہے اور ان مٹی کے ذروں میں بھی
لو کو کون سا پیار زیادہ قیمتی ہے۔؟“

”اماں!“ منو چچا اٹھ کھڑے ہوئے۔ ”میں شہر جاؤں گا
اماں! وہاں نوکری کروں گا اور بہت سا راپہ جمع کر کے لوٹوں گا۔
پھر مہمان بھی چھوٹ جائے گا اور آپ اس کی مرمت بھی کروا سکیں
گی۔ میں وعدہ کرتا ہوں، اماں میں ضرور آؤں گا۔“

”تو شہر جائے گا۔؟ نوکری کرنے؟ نہیں بیٹیا، یہ ہمیں زیا
نہیں۔ ہمارے خاندان میں آج تک کسی نے نوکری نہیں کی۔“
”اماں یہ سب پرانی باتیں ہیں۔ یہ قدریں پرانی ہو چکی ہیں۔“

۲۲۱ گلستان سے قبرستان تک

آپ یقین کیجئے میں ضرور آؤں گا۔ مگر اماں آپ یہ لونگیں نہ اتاریئے
نوکری کرنا بری بات نہیں ہے۔ میں آؤں گا میری اماں، اور پیسہ
لے کر آؤں گا۔ میں ضرور لوٹوں گا اماں۔ کبھی نہ کبھی ضرور واپس
آؤں گا۔ اتنا آپ یقین رکھیے۔“ اور اسی رات منو چا شہر روانہ
ہو گئے۔

اب تک گلستان کی مردہ ایک ہی دیوار گری تھی۔
دادی اماں اب تک فریش تھیں۔ اب تو وہ چلنا پھرنا بھی
بھول چکی تھیں۔ گھر میں اکثر قلعے ہوتے۔ کبھی کھانا پکتا۔ کبھی
نہ پکتا۔ جو کچھ پکتا وہ دال پر مشتمل ہوتا۔ دادی اماں کبھی رات
کو بھوکا نہ سولے دیتیں۔ ہر رات دال ہی پکیتی، مگر ضرور پکیتی۔
دادی اماں ہر رات درد و ڈیاں اور ایک کٹورہ دال اپنے سر ہانے
والے محراب میں رکھوا لیتیں۔

”میرا منو بٹیا آئے گا۔ کون جلے وہ بھوکا ہی لوٹے! وہ
پہلے تو بھی سے ملنے آئے گا۔ میں اسے سب سے پہلے کھانا کھلاؤں گی۔
پھر بات چیت ہو گی۔“ اور ردنا نہ صبح سویرے میں وہ کھانا کسی
فقیر کو دے آتی، جو اکثر گلستان کے پھاٹک کے سامنے بیٹھے ہوتے۔
منو چا کے زندگی سے بھرپور خط آتے۔ بڑی بڑی امیدیں
بڑے بڑے دلائے اور ڈھارس سہیں۔ مگر کسی خط میں تو ایسا لکھا نہ آیا
کہ ”مجھے نوکری مل گئی ہے۔“ یا یہ کہ ”میں خوب پیسہ کما رہا ہوں اور
جلد ہی لوٹوں گا۔“ دادی اماں ان دنوں بڑے سہرے رو پہلے خواب

دیکھتیں۔ ہر دوسرے تیسرے دے دے مجھے بٹھا کر ساتیں۔

”بیٹی میں نے دیکھا منوراجہ اچھے اچھے کپڑے پہن کر موٹر پر بیٹھ کر گھرا یا ہے۔ موٹر اس کی اپنی ہے۔“

”خواب کی تعبیر سدا الٹی ہوا کرتی ہے۔ تجھے معلوم ہے یہ بات؟“ ایک دن بڑے چیلنے دادی اماں کا خواب سن کر مجھ سے فکر مند لہجہ میں پوچھا۔ ”اور تجھے شاید یہ بات معلوم نہ ہو کہ بچپن پر کے خواب سدا الٹی تعبیر دیتے ہیں۔“

دادی اماں کی صحت گرتی چلی گئی۔

درویشیاں اودال کا کٹورا روزانہ کوئی فقیر لے جاتا رہا۔ منوچیا کے خد اگد مہند ہو گئے۔ دادی اماں ہر آہٹ پر چونک اٹھتیں۔ ”دیکھو تو سہی منو تو نہیں آیا میرا۔“ ان دنوں ان کا بہرا پن بالکل دور ہو گیا تھا۔ سرگوشیاں تنک سن لیتیں۔ ہم بات کرتے نہ رنے لگے تھے۔ ادا ملک دن بھر دادی اماں خواب سنا رہی تھیں۔ ”بیٹی اس کے جسم پر چکیلے کپڑے لگے۔ جو نا اشنا چمکدار کہ اس میں صورت دیکھ لو۔ اس کی کلائی پر سونے کی گھڑی بندھی تھی۔ وہ اپنی ذاتی موٹر میں بیٹھ کر آیا تھا۔ اور اس کی جیبوں میں نوٹ بھرے ہوئے تھے۔“

”دادی اماں آپ نے یہ خواب کب دیکھا تھا۔“ میرے سہم کر

پوچھا۔

”تیسرے پہر کو۔“

میں کانپ کر رہ گئی۔

”اور میں نے یہ بھی دیکھا کہ گلستان کی دیواریں نمی نمی ہیں۔ بدھ

۲۲۳ گلستان سے قبرستان تک

میں پھول پودے جھوم رہے ہیں اور سچا تک تو اتنا شائنا نما نہ ہوا ہے
بہرے منو بیٹے نے کہ بس دیکھتے رد جاؤ۔

میں سن سن کر کانپتی رہی۔

اور پھر کئی دن گزر گئے

زندگی اور سبھی مہربان ہو گئی۔

اس اثنا میں ساری دیواریں گر گئیں۔ دیواروں میں پانی

جذب ہو گیا تھا۔ کہاں تک سہا رہیں۔؟ صرف چھانگ باقی رہ گیا۔

اور پھر ہماری زندگی میں وہ دن بھی آیا کہ قرض خواہ ہمارے

گلستان کی بولی اٹھا رہے تھے۔ صرف گھنٹاں ہی نیلام نہیں ہو رہا

تھا۔ بلکہ ہر اس پیارے بھر۔ لمحے کی بولی اٹھ رہی تھی جو اس گھر میں بتیا

تھا۔ اور یہ لمحہ صرف ایک ہی نے تو بتایا نہ تھا۔ یہاں تو اسلاف کی پشتوں

کی پشتیں پھری تھیں۔ زندگی بنیام ہو رہی تھی۔؟ موت نیلام ہو رہی تھی۔

داوی اماں بستر پہ اٹھ کر بٹھک گئیں۔ ”یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔

سجلا گلستان کیسے نیلام ہو سکتا ہے۔؟“ ان کی سانس پھولنے لگی۔ ”میرے

جیتے جی تو ایسا نہیں ہو سکتا۔“

بہرے کانوں نے سنا۔ ”بولی اٹھاؤ۔ دو ہزار۔ بولی۔“

داوی اماں ہڑٹ اُٹھ گئیں۔ انہوں نے جلدی جلدی کیلیں کھولنی

شروع کیں۔

”کانن داوی اماں بہری ہونیں۔“ میں نے سوچا۔

گلستان پر قبرستان کی اداسی چھائی ہوئی تھی۔

”منو بیٹیا تمہیں آیا۔؟“ داوی اماں نے جیسے کہیں دور سے پوچھا۔

سوائے آتشوں کے میرے پاس کیا جواب تھا۔ بڑے چچا یوں سر
جھکائے کھڑے تھے گویا کوئی بے جان بت ہوں۔

”سیٹھ کو یہ کیلیں دے دو ریاض بیٹا، نگہ گھر بچا لو۔“

بڑے چچا نے تڑپ کر دیکھا۔ دادی اماں اب تک کیلیں کھواں
رہی تھیں۔ برسوں پہلے کی پہنی ہوئی ٹوئیں مغربو طے سے جم گئی تھیں۔

”اماں مکان اتنا سستا نہیں ہے۔“ بڑے چچا نے بے یوں سے بولے۔

”دھڑ۔ دھڑ۔“ دادی اماں اور میں بری طرح چونک پڑے۔
بڑے چچا کھڑکی کی طرف دوڑے۔

سچا ہلک گر چکا تھا اور منو چچا اب تک نہ لوٹے تھے۔

”بیٹا۔“ دادی اماں کے منہ سے ایک سہمی ہوئی آواز نکلی اور
ان کے ہاتھ مانوں پر سے ہٹ گئے۔ کیلیں کسی حالت میں کھینے پر تیار
نہ ہوتی تھیں۔

”چھہ ہزار۔ چھہ ہزار۔“ بھ کوئی بولنے والا ہے۔“

بولی چھہ ہزار پر آکر رک گئی۔

گھٹناں نیلام ہو گیا۔ باغ اجر گیا۔ بہاریں لٹ گئیں۔
دادی اماں نے گھبرا کر تکیے پر سر ٹیک دیا اور آنکھیں موند لیں۔
ہمیشہ کے لئے ہی موند لیں۔

صبح کی سفید نمودار ہو چکی تھی۔ اجالا پھیل رہا تھا مگر ہماری
قسمت پر سیاہی چھا رہی تھی۔ گھر تک چکا تھا، نیلام ہو چکا تھا۔ اب
کیا ہو گا۔

دادی اماں کتنے مطمئن انداز سے سو رہی تھیں۔ ایک لمحے کو مجھے

ان کی نیند پر رشک سا آگیا۔
 ان کے سر ہانے اب تک وال کا کٹورا اور دو روٹیاں رکھی ہوئی
 ہوئی تھیں۔ بوجھل بوجھل قدموں سے چلتی ہوئی میں پھاٹک تک پہنچی
 جہاں مٹی اور اینٹوں کا ڈبیر بٹا اٹھا۔
 پھٹ پڑنے، پیل پھیلے کپڑے۔ پہنے گلستاں کی طرف پیٹھ لئے ایک
 فقیر کھڑا اٹھا۔ وال کا کٹورا اور دو روٹیاں میں نے اس کی طرف بڑھائیں۔
 "لو بھائی کھالو اور مرے والی کے لئے دعا کرو۔" دوسرے ہی
 لئے روٹیاں میرے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑیں۔
 یہ منو چاہتے۔ !!!



کالے بادل

کھڑپڑ سے شکور کی آنکھ کھل گئی۔ تیکے سے سراٹھا کر دیکھا تو حیدر
کھاٹ کے پاس کھڑی کھڑی، دیوار سے لگے تختے سے کوئی چیز نکال رہی
تھی۔

"کیا کر رہی ہے اتنی رات گئے؟" وہ وہیں پڑے پڑے بولا۔
"جلد پٹ میں کیا گر رہا ہے۔ نہ لیٹا جائے نہ بیٹھا جائے اجواں
کھا رہی ہوں۔"

شکور تیزی سے لیٹر پر اٹھ بیٹھا۔ "پٹ میں گر رہا ہے؟" وہ چیخے
کے یہ انداز سے بولا۔

حیدر لمبیرت اور ذرا خون سے پٹ کر دیکھا۔ "ہاں ہاں! اگر تم
اننا شور کیوں مچا رہے ہو؟ کیا پٹ میں درد ہونا ایسی اہم بات ہے؟
وہ اس کی بات ٹال کر بولا۔ "یہ تو بتا تیرا کون سا مہینہ چل رہا ہے؟"
حیدر نے ذرا شرما کر سر نیوٹا یا اور سپر انجینوں پر حساب جوڑنی
ہوئی بولی۔ "اسما چاند کو پورے آٹھ مہینے تو ہو گئے۔"
"تو تیرے حسابوں یہ نواں پہل رہا ہے نا؟" وہ تشریف سے

بولا۔

”ہاں۔“ وہ ذرا رک گئی۔ ”پھر تمہارا مطلب؟“

”اری نیک نحت تو یہی تو کہہ رہا ہوں کہ پیٹ میں ساری گڑبڑ بچے کی ہے۔“ وہ اچک کر بولا۔ ”اری تو کیسی ماں ہے کہ یہ تک پتہ نہیں چلا سکتی کہ درو کا ہے کا ہے؟“

”ایسے کون سے میں نے دس بارہ بچے جن ڈالے ہیں کہ پتہ چلا تو گی؟“ وہ تنک کر بولی۔ ”اور تم بھی جانے کیا باب رہے ہو۔ ابھی تو مہینہ پورے تو ہوئے بھی نہیں۔“

”رہی عقل کی بودی ہی بودی۔ اری پاگل، نویں کی چھٹاؤں پر جانے بس ہے۔ میں تو کہتا ہوں اب لھنڈہ دو گھنٹہ میں ہوتا ہی ہے بچہ میرا رنگ تو دیکھ پیلا پٹا جا رہا ہے۔“ وہ تمبر بہ کار دانی کے سے انداز سے سر ہلا کر بولا۔

حمیدہ مچل گئی۔ ”ہو نہہ ! رنگ پیلا پٹا جا رہا ہے۔ فالتے جو ٹوٹے رہتے ہیں آئے دن، اس کا کوئی خیال ہی نہیں۔ اور کیا نکالوں پر شگال بر سے گا۔؟“

اس کی بات نہ سن کر شکو را اپنی ہی ہانکے گیا۔ ”ارے ارے کیا بری بات ہوئی۔ بس۔ قبر میں سوئے کا دن اور تیرے بچہ جینے کا دن ساتھ ہی ساتھ پڑا۔ بھلا بچے کو چھڑ کر میرا دل قبر میں کیسے لگے گا۔؟“

حمیدہ پیٹیا کو دباتی، ٹولی چلا پڑی۔ ”دیکھو میں کہے دیتی ہوں : آج سے تم ۔ یہودہ کام نہیں کرو گے۔ اتنے دن جو کر لیا سو کر لیا، مگر اب تم ایک بچے کے بارپن رہ ہو۔ تمہیں میرا کوئی خیال نہیں، ایسے بچے کا فو آئے گا۔“

شکور چا پلوسی سے بولا - "میری رانی یہ تو تو نے ٹھیک کہا کہ تیرے سوؤں غمیں۔ مگر پیریہ لو بتا کہ کھائیں گے کیا۔ تو سمجھتی ہے تیرا سروایا ہی بڑا زیندار ہے۔"

"کچھ نہیں معلوم۔" حیدرہ کا چہرہ اتر گیا۔ "تم نے سدا بچے دل کی کہتے۔ کبھی کبھی یہ سمجھنے کا حق ہی نہیں دیا کہ میں تمہاری کچھ لگتی ہوئی ہوں۔ مگر تب سے پہلے کہتی ہوں اب میں تمہیں تو کے اندھا پاؤں دے رہی ہوں۔ کوئی حد ہے۔ صورت تو دیکھو۔ آنکھوں میں تلخ۔ کمال پیچیدہ ہوئے۔ بڑے کمزور، مارے بجم کی رنگیاں اٹھ رہی ہیں اور اسما پر جب دیکھتا تب تو میں کو دھڑکتے ہوئے نہیں چاہتا ایسی روٹی۔"

"تو جی رخصت کرتی رہ۔" شکور بڑبڑا کر بولا۔

"ہاں ہاں کروں گی۔" دوسری لگی۔ غبار سے ساتھ رہ کر تو

دوڑے بچے۔ مگر جنت کے برابر ہے۔"

"شکور پیرا کھڑا ہوا۔" ہونہہ! بڑی جنت والی آئی اب یہ شتر مرغ کا بچہ تنہا رہا ہے۔ قبر سے کیا کہلائے گی۔ ہیرا۔" ریا اپنا۔"

حمید نے پیار سے انہا پر پی پی کر لیا۔ "شتر مرغ کا بچہ۔ واہ! ایسا کیا نہیں بھلا لگتا ہے شتر مرغ کہتا۔ تمہیں کیا، میں کچھ بھی کہلاؤں، نہ بھی کہلاؤں تو کیا فرق پڑتا ہے۔"

"کیا فرق پڑتا ہے؟ تو کیا بھوکھا لگے گی؟"

حیدرہ مسکرا کر بولی۔ "بہ کایوں ماروں گی۔ ارے تمہیں تو پیہہ نہیں۔ ماں بڑ کر تو بہو، پیاس سبب مٹنے لگتی ہے تب بھم

فرق نہیں پڑتا۔ "وہ کھوئے ہوئے بولی۔ "جب سے میرا ایک جی سے دو جی ہوا ہے یقین کرو مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں دنیا زلزلے کی ساری خوشیاں مل گئی ہیں۔"

"ہونہ۔! خوشیاں مل گئی ہیں تبھی یہ منہ مسروں کا کھیت بنا ہوا ہے۔"

ابھی اس کی بات منہ میں ہی تھی کہ جمیدہ چکر کھا کر گر پڑی بشکوار بستر سے اچھل کر اسے سنبھالنے کو بھاگا۔ دونوں ہاتھوں پر اٹھا کر لایا اور کھاٹ پر ڈال کر دھیرچ سے بولا۔

"کیسا لگ رہا ہے میرہ۔؟"

جمیدہ کے دیدے بند ہوئے جا رہے تھے، کراہ کر بولی۔

"جانے کیسا کیسا لگ رہا ہے۔ اس درد کا واسطہ، تم سے ایک وعدہ چاہتی ہوں۔"

"کیا۔؟" غمور دکھ سے بولا۔

"یہی کہ میری خاطر، اپنے ہونے والے بپے کی خاطر تم آج کے بعد کبھی قبر میں نہ اترو گے۔"

یہ بڑا کٹھن لمحہ تھا۔ اباب طرف موت و حیات کی کشمکش میں متبلا جیوی کا دل اور دوسری طرف پیٹ کا سوال۔ وہ ششش دینے میں رہ گیا۔

"میرا دانا نہ بن، تو آج سے پہلے بھی بار بار کہہ چکی ہے اور بلوں بھی یہی جواب دے چکا ہوں کہ کھیلے ہی میں کھر بیٹا نہ بناؤں۔ نگہ پیر چینی کا گلیا بند دوست ہو گا۔ سبب دروازے تیرے دلجو کہہ ہی تو ہیں

سنے یہ راہ نکالی ہے، ورنہ کیا تو سمجھتی ہے مجھے اپنی جان پیاری نہیں۔
 میری جان عزیز نہیں اور کیا یہ ننھا سا بچہ عزیز نہیں۔ مگر۔ مگر۔
 وہ بے بسی سے ہاتھ ملنے لگا۔

پھر اس کا دل ہاتھ میں کر لینے کو آخری وار پھینکا۔ "تو کیا اپنے
 جانے گوشے کو بھوسا مارے گی۔؟ جب وہ بھوک سے تھلا تھلا کر تیری
 سوکھی چھاتیوں پر ہاتھ مارے گا تو تو کیا کرے گی۔؟ جب وہ بھوک
 سے نہ صاف ہو ہو کر یونہی مردہ سا ہو کر رہ جائے گا تو اس وقت
 کیا کرے گی۔؟" تو کیسی بات کرتی ہے مبدہ۔! ماں بیٹے سے پیار سے منہ
 بنا کر کہتا ہے، مگر تو ماں تو بن رہی ہے۔ غفلت کا دور دورہ پتہ نہیں۔"

حمیدہ نے لپٹ لپٹ کر پوچھا، کراہ کر اس کی صورت دیکھی اور
 بھیجے دھیمے بولنے لگی۔ "یہ سنہاری صورت، دیکھو۔ پچھلی بار جو تو میں
 اتر۔ سنہ نواز آج تک مجھ سے متہیں سدھری۔ میں تو یہ سوچ کر ہی تھک
 جاتی ہوں کہ تم بوجھ کیسے کھاتے، مسلسل بار بار گھنٹے کیوں کر سہکتے ہو؟
 شکور پیٹ ٹھونک کر بولا۔ "پیٹ کی خاطر، صرف پیٹ کی خاطر۔"
 "آگ لگے، ایسے پیٹ کو۔ میں نہیں، خوں کی تاب تم گھرتے، قدم
 تو نکال کر دیکھو ذرا۔" دس کا چہرہ دم بہ دم رنگ بدلتا جا رہا تھا۔

"یہ تو زندہ گی بوجھ چلتا ہی رہے گا۔ مبدہ تو ناحق دل کر دیا رہی
 ہے۔ دیکھو ایسے ذقت غم کھانا اچھا نہ ہوگا۔"

حمیدہ نے آنسو جھری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ نرمی
 سے بولا۔ "مبدہ اگر آج سے تو مہینے پہلے تو یہ بات کرتی تو شاید میں ماں
 سمجھتا، مگر اب۔۔ اب۔۔ وہ خوشی سے بولنے لگا۔ "تو اور بہ"

ایک بچے کے ماں باپ بن رہے ہیں۔ بھلا اس کو کیسے سبوتا کر لیں۔
 حمیدہ پیٹ کو دبائے کھاٹ پر اسٹھ بیٹھی۔ اس کی سافلی گر دی
 پر پسینے کی دھاریں بہی جا رہی تھیں، آنکھوں میں آنسو چمک رہے
 تھے، بال جھول کر سامنے آگرے تھے۔ "تو تمہارا کہنا یہ ہے کہ اب
 تم حرف نہ بنے جی کی خاطر قبر میں سونے پر مجبور ہو۔"
 "ہاں۔" وہ جیسے بات ٹالنے کے لئے بولا۔

"تو۔ تو۔" حمیدہ نے دو ایک بار تنہو کی نگلنے کی ناکام کوشش
 کی پھر بولے: پر آمادہ ہوئی۔ "تو میں نے کوڈاکرٹنی کے ہاتھ بیچ دوں گی۔
 ہزار پانچ سو جو مل جائیں گے اس سے تم کوئی دھندہ کر لینا۔ بچوں کا کیا
 ہے۔ تم سلامت رہے تو اللہ داد دیگا۔" اور وہ ضبط کی کوشش کرتے
 کرتے چھوٹ پڑی

شور پوری طاقت سے چلایا۔ "کیا کہا ہے کو بیچ دے گی؟
 اس سے بہت کم کوئی بات نہ سوچتی تھی۔ اس سے اچھا تو یہی ہے کہ
 مجھے اپنے ہاتھوں مار ڈالے۔ تو جانتی ہے میدہ۔" وہ اس کے قریب
 جب آئی۔ اس کی آواز بھرا رہی تھی اور آنسو اس کے ہاتھوں پر
 ہو رہے تھے۔ "تو جانتی ہے نا کہ مجھے بچے کی کتنی آرزو تھی۔ تو نے تو
 کبھی نہیں کہا۔ مگر شادی کے بعد سے آج تک۔ آج تک میرا ایک
 دن بھی ایسا نہ گزرا جب میں نے اپنے پہلو کو ایک بچے سے سونا محسوس
 نہ کیا ہو۔ میرا جی ان سات برسوں بچے کے لئے کتنا ترسا۔ اور اب
 تو کہتی ہے کہ ہزار پانچ سو کے لئے میرے بچے کو، اپنے بچے کو، اپنی جان
 کے ایک، جیسے کو، اپنے دل، تیرے میرے خون کو بیچ ڈالے گا۔ بول میدہ

تیرا اتنا دل گرہ ہے کہ ایسا سوچ بھی سکے۔ کیا تو چاہتی ہے کہ میں جینے
بھلا جاؤں۔؟“

حمیدہ نے بڑے دکھ کے ساتھ سراٹھا کر اس کو دیکھا، پھر
بڑے دکھ کے ساتھ بولی۔

”مگر اب تمہاری حالت مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔ تین برس سے
دم گھونٹتے گھونٹتے تمہاری کیا حالت ہو گئی۔؟ ناک بالسنہ تک نکل آیا
ہے۔ میں ایسی نیند کی مانی بھی نہیں، جانتی ہوں کل رات تم ٹھسک
ٹھسک کھا سنبھلی رہے تھے۔ کیا تمہیں اپنے بچے کا سکھ نہیں لکھنا
تم تو.....“

ابھی اس کی بات ادھوری ہی تھی کہ وہ پیٹ پر ہاتھ رکھ کر
زور سے چلائی۔ چیخ کی آواز سنکر دلالت میں سوئی بچی پکی آئی۔
شکور نے گے برا کر حمیدہ کو جلدی سے اٹا دیا اور خود دائی کو لینے چل

دیا۔!

”میں کب نہیں کہتا کہ اسے مجھ سے محبت نہیں۔ مگر کیسی اٹھا
پلٹ باتیں سوچتی اور سمجھاتی ہے۔ نوکری ملے گی کہاں۔؟ شہر تو گیا
ہی تو اور چار برس کا رخنہ میں نوکری کی بھی۔ اب مزدوروں کے
ساتھ میری بھی چھینٹی ہو گئی تو میں بھی کیا کر سکتا تھا۔؟ یہاں
گاؤں میں کون پا پڑے بیٹے، مگر کیا ملا۔؟ اب تنگ آکر قبر میں سوتا
ہوں تو یہ سمجھتی ہے کہ جاں بوجھ کر مرے پر تھلا ہوں۔ بھلا یہ نہیں
سوچتی کہ ایک شوہر ہوں اور اب ایک باپ بھی ہو رہا ہوں۔ کس
کا دل اب اس عمر میں مرنے کو چاہتا ہے۔ اونا یہ کھانسی! میں تو

اپنے سبائے رضائی میں منہ چھپائے کھائیں رہا ستھا اور ادھر اسے تو
 رتی رتی کی خبر رہتی ہے۔ ابھی بول رہی تھی تاکہ میں تمہاری کھائنی
 کی آواز سن رہی تھی۔ ہونہ، خدا ایسا بے رحم بھی نہیں۔ ارے گاؤں
 میں رہتے ٹکڑے گئی ہے۔ ہزار بار دیکھا کہ ہالے کالے بادل آسمان
 پر چھپائے اور برس گئے۔ تو کیا ہمارے سر کے ہالے بادل کبھی نہ برسے
 گئے۔ برسیں گے کیسے نہیں؟ ذرا بات تو سنو کہتی تھی بچہ بیچ ڈالوں
 گی۔ ایسے کیسے پینے گی؟ اور میں بھی کیا پاگل پن کی باتیں سوچ رہا
 ہوں۔ جہلا ایک ماں کبھی اپنے بچے کو بیچ سکتی ہے؟ سب بچے
 گرانے کی باتیں ہیں۔ ارے! دائی کا گھرا بھی گیا اور میں اپنے اوپر
 سیدھے خیالات میں ہی غلطیاں پیچاں ہوں۔؟

حمیدہ اور شکوہ ایک دوسرے کو تنگ رہے تھے۔ ابھی ابھی
 دائی ساری غلاظت سیٹ کر باہر چلی گئی تھی اور اب مانتا کی ساری
 ٹھنڈک اور اطمینان کے ساتھ حمیدہ اپنے پہلو میں چھولے سے
 بیٹے کو لٹے پڑی تھی۔ شکوہ کے چہرے کی ساری زردی، ساری
 تھکن اس وقت سرخی اور تازگی سے بدل گئی تھی۔ باہر رات کا سیاہ
 اور گہرا اندھیرا اچھا یا ستھا مگر دونوں کے دلوں میں بھر دھیرے کا "مے"
 سا چمکا رہا تھا۔

"آج رات برسے بغیر خدا نے یہ دن دکھایا ہے۔ میرے "وہ
 جیسی جیسی آواز میں بولا۔ "میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا ہے مالک
 کا شکریہ ادا کروں۔ سچ ہے اوپر والے کے پاس دیر ہے مگر اندھیر
 نہیں۔"

حمیدہ ابھی دو چار گھنٹوں پہلے کی بات جھولی نہ سکتی، اور یہ لمحہ
تو ایسا لمحہ تھا کہ مارے غم و بخش دینے اور سارے راز انکرا لینے
کا لمحہ تھا۔ اس نے بڑے معنی خیز لہجہ میں پوچھا۔

"لاڈ آ رہا ہے بچے کا۔؟"

خوشی سے بھر کر وہ بولا۔ "واہ کیا بات پوچھی ہے۔ بھلا اپنے
دل پر ہاتھ رکھ کر پوچھو، خود ہی جواب مل جائے گا۔"

"اگر یہ کچھ مانگے تو۔؟"

"ارے یہ کیا مانگے گا۔؟ اس کی زبان کہاں ہے ابھی۔!" وہ

سہمے دیا۔

"بچے کی زبان تو بند رہتی ہے مگر اس کا انگ انگ بولتا رہتا
ہے۔ اور اب اس وقت ہمارے لاڈلے کا انگ انگ کہہ رہا ہے،
'بابا مجھے تھاری زہری چاہیے۔' تمہیں میرے لئے جینا ہے۔ میری
ماں کے لئے جینا ہے۔"

شکوہ رسہ پیر تک لرز لرز گیا۔ "کیسی بات کرتی ہے یہ۔؟"
وہ لبس اتنا ہی کہہ سکا۔

"سیدھی رادی سہی بات ہے جی۔ تم یہ دھندہ چھوڑ دو۔
خدا کوئی نہ کوئی بند دہشت نوکر ہی دیگا۔ کیا ایسا ظالم ہو گیا کہ بڑا
ہی مارے گا۔!"

ایسے مسرت بھرے دن بھی حمیدہ وہی روزی اور روٹی کا
جنگڑا اٹھا رہی تھی۔ وہ ذرا رک کر بولا۔
"اچھا اچھا۔ چھوڑ دیتا ہوں یہ دھندہ۔ ابھی، آج اسی

وقت، اسی لمحہ۔ مگر مجھے روپیوں بھری شیشی لا کر دے کہ اس سے
 اور کچھ نہیں لو کپڑے کا سٹیلہ بن چلا سکوں۔“
 ”اگر میں آج ہی رقم کا بندوبست کر دوں تو چھوٹے دو گے یہ منہ
 سچ کہہ رہے ہوں تم۔“ وہ اعتادے ہوئی۔

”ہاں ہاں اور کتنی بار کہوں کہ.....“
 اک دم باہر سے ڈھونڈھی والے کی آواز سنائی دینے لگی۔
 ”آج کیا رہے؟ شکور ناٹک قبر میں سو۔ گا اور لوپرے بارہ گھنٹہ
 بعد باہر نکلے گا۔ زندہ آدمی مردہ۔ قبر یا کھل ٹھکانک دی جاتی ہے۔
 جس کی کو یقین نہ آئے طویلہ والے میدان میں آجائے۔ نماشہ
 کی قیمت صرف چار آنہ۔ صرف چار آنہ۔“
 منہ پر کا دل اچھل اچھل کر دھڑکنے لگا۔ شکور نے منہ سار
 بیوی کو دیکھا۔

”ارسی شیخ کی بیوی ہو کر دل چھوٹا کرتی ہے۔ اب میرے لئے
 کون بڑی بات رہ گئی ہے۔؟ تین سال سے عادی ہو گیا ہوں، مگر تو
 تو میرا دل چھوٹا کرنے بیٹھ جاتی ہے جیسے پہلی بار ہو۔ واہ وا۔
 کیا بولدی عورت ہے سبھی۔“

جبکہ غم سے ہوئی۔ ”مجھ میں دو دو بارہ بارہ بارہ گھنٹہ
 کے لئے بند قبر میں سو کر لوگوں کو تماشا دکھانا اور محض بیس پائیس پلے
 کی خاطر اجلے کس نے ایسی عقل سکھائی ہے۔؟“
 ”پیٹ نے رانی، پیٹ نے۔“ وہ حسب معمول پیٹ ٹھونک کر

دودھ بڑھی والا دالسی میں پھر حمیدہ کا دل اچھا لگا گیا۔ مگر
شکور بغیر کچھ نوٹس لئے چدر اسٹاٹھانے کو چل دیا۔
دس بجے کے قریب وہ حمیدہ کے پاس آیا اور بچے کو پیار کرتا
ہوا بولا۔

”دودھ نہیں اترتا ابھی۔“

ایک بار تو حمیدہ کا دل بھی کانپ اٹھا، پھر رگ کھڑکی بولی۔
”ابھی تو نہیں اترتا۔“ چچی کہتی تھی کھلائی پلائی زیادہ ہوتو
جنائی سے پہلے ہی دودھ ٹپکنے لگتا ہے نہیں تو.....“ وہ رگ گئی۔
”اچھا۔“ وہ ہنس کر بولا۔ ”شام کو دالسی میں تیرے لئے
میوہ لیتا آؤں گا۔ اچھا اب جاؤں۔“ انتظام کرنے والے میری راہ
دیکھ رہے ہوں گے اور پھر مجھے بھی تو آج گھر آنے کی جلدی ہے
نا۔“ وہ ہنستا ہوا اٹھا اور حمیدہ اور بچے کے بکالوں پر ایک
ساتھ پیار کرتا ہوا چل دیا۔

شکور کے جونوں کی پٹ پٹ دور ہوتی گئی اور حمیدہ کا دل آئی
رقم سے تھمتا گیا اور پھر سہم کراہتگی سے دھڑکنے لگا۔ دھک۔
دھک۔ دھک۔

اس نے پہلو میں پڑے ہوئے بچے کی لمبوت دیکھا۔ سرخ سرخ
چہرہ، کالے کالے بال پیشانی پر بکھر کر رہ گئے تھے۔ سوکھے سوکھے
نہے نہے ہونٹ۔ وہ دنیا کی ہر حسرت اور غم سے میگا نہ ماں کے پہلو
میں سکون کے ساتھ لیٹا ہوا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ اس کا سرخ چہرہ
ماں کی آنکھوں سے اوجھل ہوتا گیا اور پھر اس کی جگہ ایک تھیلی

باقی رہ گئی۔ تھیلی! جس میں روپے ہی روپے بھر رہے ہوئے تھے۔
 ”دیکھ حمیدہ یہ غور کرنے کا وقت نہیں ہے۔ ایسی باتوں پر
 زیادہ سوچنا نہیں کرتے۔ تو جانتی ہے اس وقت تو ایک ایسے خزانے
 کی مالک ہے کہ پلک جھپکتے میں تیرے پاس پانچ سو روپے ہوں گے
 اور ذرا یہ سوچ کہ ان پانچ سو روپوں سے کیا کیا کام لے سکتی ہے۔ شکر
 کپڑوں کی دوکان کھول سکتا ہے۔ کھلونوں کی دوکان لگا سکتا ہے۔
 چاہے تو کرائے کا ٹھیلہ لگا سکتا ہے۔ بس پیسہ ہو۔ پھر سب کچھ
 ہو سکتا ہے۔ پھر کیا سوچ رہی ہے۔“

”ارے بچے کی طرف دیکھتی کیا ہے۔“ تیرا شکر سلامت
 رہے ایسے کئی بچے ہو جائیں گے۔ شہر کی ڈاکٹرانی ہر مہینے دوسرے
 مہینے گاؤں کا پھیرا لگاتی ہی ہے کہ حرامی اور لادار ث بچے خرید لے
 سہول گئی کیا تاجے چا چائے اپنا پانچ برس کا بچہ کس مزے سے بیچ
 دیا۔ ان کے اوپر بھی چھ بچے تھے! تو کیا فرق پڑتا ہے۔؟ تجھے بھی
 اور ہو جائیں گے۔ مگر اس وقت تو تجھے اپنے میاں کے لئے روپیہ
 چاہیے۔ اس کی صحت، اس کی حالت تجھے دکھائی نہیں دیتی۔؟ بند
 قبر میں لیٹے لیٹے رہنے سے اس کا چہرہ کیسے دق زدہ ہو کر رہ گیا ہے۔
 اس کا سینہ جو پہلے اتنا چوڑا چکلا تھا کیسے سمٹ کر رہ گیا ہے۔ اور
 جب بارہ گھنٹوں بعد قبر سے نکل کر آتا ہے تو کیسے مردہ مردہ دکھائی
 دیتا ہے کہ اب مرا کہ اب مرا سوچنے کا وقت نہیں حمیدہ۔ گزرا ہوا
 لمحہ کبھی پلٹ کر نہ آیا ہے نہ آتا ہے۔ چل اسٹھ سوچ کر رہی ہے۔
 بچے کی یاد آئے گی۔؟ میوہ سے خالی کوکھ کہیں اچھی ہوتی ہے۔ حمیدہ

پھر یہ کیا ضرور ہے حمیدہ کہ تو خالی کوکھ ہی رہے۔ ایک بار درخت
 پھل دینا شروع کر دے تو پھر رکتا نہیں۔ اب تجھ پر مہار آ رہی
 ہے، پھر یہ دسو سے کیسے۔ مسلمان کا بچہ اور عیسائیوں کے ہاتھ
 پڑ جائے! یہ خدشہ ستا رہا ہے مجھے۔؟ ہو نہ! تیرے خدائے
 تیرے ساتھ کون بڑا اچھا سلوک کیا ہے کہ تجھے مذہب کی پڑی
 ہے۔ ارے، سب سے بڑا مذہب پیسہ ہے پیسہ۔ یہاں آکر سارے
 مذہب و مذہب غم ہو جاتے ہیں۔ عیسائیوں میں رہ کر بھی وہ تیرا
 بیٹا ہی رہے گا۔ یاد واد کا مت سوچ حمیدہ۔ عورت کے سہاگ پر
 بن جائے تو پھر وہ اولاد کو دیکھتی ہے نہ خود اپنی زندگی کو پھر تو کیا
 سوچ رہی ہے؟ یہ نہ بھول کہ ایسے موقعے بار بار نہ آئیں گے۔ تو
 تھوڑی دیر کو یہ سوچ کر خود کو نسلی دے لے کہ کبھی ابھی ابھی اولاد
 پیدا ہی نہیں ہوتی ہے۔ جیسی سات سال سے سختی ویسی اب بھی ہے۔
 چین نہیں آتا۔؟ دل پر پھر رکھ لے حمیدہ، سب کچھ بھول جائیگی۔
 ایک لمحے میں فیصلہ کر لے۔ مجھے اپنی کونسی چیز زیادہ پیاری ہے۔
 بچوں کی طرح ہلکتا ہلکتا سہاگ یا بچہ۔؟ جیون مرن کا ساتھی
 یا یہ بھری کوکھ۔؟ شوہر یا اولاد۔؟ شوہر، جس کے دم سے اولاد ہوتی
 ہے۔ اولاد شوہر نہیں دلا سکتی، ہاں شوہر....“
 حمیدہ نے تڑپ کر کانوں پر ہاتھ رکھ لئے۔ دل کی آواز کو
 اور زیادہ سنتے رہنے کی اس میں تاب نہ تھی۔
 ”مجھے اپنا شوہر زیادہ عزیز ہے مجھے اپنے سہاگ کے بھول
 زیادہ ۰۰۰۔ مجھے۔ مجھے۔“ اس نے اسناد دل دلوچ لیا۔

رہ گھڑاتے قدموں سے وہ اٹھی۔ بچے کی پیدائش کو ابھی کل چار پانچ گھنٹے ہی ہوئے تھے۔ ابھی ذہن کے جسم کی وہ قدرتی نمی سوکھ بھی نہ پائی تھی۔ ابھی اس کی آنکھیں بھی نہ کھلی تھیں۔ ابھی اس نے ماں کی چھاتیوں کا رس بھی نہ پیا تھا اور وہ دور کیا جا رہا تھا۔
حمیدہ نے اپنی ساڑی کے آچل میں اسے اچھی طرح لپیٹ لیا۔ دروازے سے جھانک کر دیکھا تو چچی باورچی خانے میں بیٹھی چھوڑکیں مار رہی تھی۔ اس کی پیٹھی صحن کی طرف تھی۔ حمیدہ نے تکر سے سانس لیا اور ڈولتے ڈولتے قدموں سے صحن سے نکلی گئی۔ باہر نکلی کر اس نے ایک سانس بھری۔ تھوڑی دیر کی، پھر چلی گئی۔ لاوارث اور یتیم بچے خریدنے والی ڈاکٹر نے بڑے زمیندار جی کے گھر کے بازو والے لال گھر میں سیرا کرتی تھی۔ حمیدہ نے دھیرے دھیرے ادھر ہی اپنے قدم بڑھانے شروع کر دیئے۔ تھوڑی ہی دور چل کر اس کی سانس پھولنے لگی۔ مگر وہ دل کو سنبھالے (دل، جو اسی کے پہلو میں تھا۔ اور دل، جو اس کے سینے سے بھی چپا ہوا تھا) بڑھتی ہی گئی۔

سانے ہی لال دروازہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے قدموں میں تیزی آگئی اور وہ کمزوری کے باوجود چل پڑی۔ ورائڈ۔۔۔ تیسرا عیسائی ڈاکٹر نے سنسنگ کر رہی تھی۔ حمیدہ کو آتے دیکھ کر اس نے مسکاکر اون کے گونے اور تیلیاں پاس پڑی تپائی پر رکھ دیں۔ حمیدہ نے منہ سے ایک لفظ بھی نہ کہا، دھیرے سے کمری پر اس نہتی سی جان کو لٹا دیا۔ اور ڈاکٹر نے کے آگے ہاتھ پھیلا دیا۔

”میری مائتا کی قیمت۔“ بچنی ہوئی آواز لیں اتنا ہی کہہ سکی۔
 ڈاکٹر ٹینی نے چشمے کی اوٹ سے اسے دیکھا اور پوچھا۔
 ”حرام کا ہے؟“ حمیدہ کے چہرے پر زہر خند مسکراہٹ چھائی
 ”حرام حلال سے فرق نہیں پڑتا مالکن۔ محبت تو وہی رہے گی۔ حرام ہے
 مانگے پر بدنامی کا میکہ ہو یا چڑھاوے کا جھوڑ۔“
 ڈاکٹر ٹینی نے منہس کرات دیکھا، پھر اٹھ کر کرسی تک آئی اور
 کپڑا اٹھا کر بولی۔

”ارے بیٹیا ہے۔!“

حمیدہ کا دل اچھل کر منہ میں آ گیا، نگہ وہ منہ سے کچھ نہ بولی۔
 ”کیا لوگی؟“ وہ پھر کرسی پر بیٹھتی ہوئی بولی۔
 ”یہ تیری کیسی خدائی ہے مولا جہاں پیٹ کی اولاد کی بھی بولی
 اٹھائی جاتی ہے۔“ حمیدہ نے سوچا اور پھر دھیرے سے بولی۔
 ”پانچ سو سے کم نہیں، زیادہ جو آپ کے دل میں آئے۔“
 ڈاکٹر ٹینی نے ایک لمحے کو اسے دیکھا اور بولی۔
 ”کئی دود تو یہ مفت میں بھی بچے مل جاتا کرتے ہیں۔“

”میں نے اس پر کوئی اعتراض تو نہیں کیا۔ میرا یہی بات کہہ رہی

ہوں۔ یہ میری پہلی اولاد ہے، وہ سورج جو سات۔ مائی بعد کسرا اندھیر
 میں چمکا ہے۔ مگر میں پھر اندھیرا بنی رہی ہوں۔“ وہ جھکی اور ڈاکٹر ٹینی کی
 آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔ ”مالکن کوئی ماں اپنے بچے کو خود سے جدا نہیں
 کرتی، نہیں کر سکتی۔ مگر کہہ لے تو صرف سہاگ کی خاطر۔ میرا شوہر ہر
 پندرہواڑے قبر میں سوتا ہے، غماضہ بنتا ہے تاکہ وہ یہ کہتا سکے۔ آج وہ

اور یونہی کرتا رہا تو ایک دن سچٹ سے مرجانے لگا۔ اس کی صحت بالکل تنہا ہو رہی ہے۔ طرہ سنتا ہی نہیں۔ میری خاطر، میرے بچے کی خاطر وہ بس یہی چاہتا ہے کہ پیسہ کمائے۔ میں نے سوچا میں بھی تو پیسہ کماسکتی ہوں۔ عورت کیا نہیں کر سکتی مالکن؟ پس سینے پر پیچہ رکھنے کی بات ہے۔ اس کی سانس بوجھل ہو گئی۔

ڈاکٹر فی نے اور کچھ نہیں کہا۔ اٹھ کر کمرے کے اندر چلی گئی اور واپس آئی تو اس کے ہاتھوں میں کڑکڑاتے نوٹوں کا ایک بندل تھا۔ حمیدہ نے نوٹوں کو دیکھا اور سچہ: ”پہلے بچے کو ادراک دم دہاں سے نظر میں ہٹا لیں۔ بری دیر بعد وہ بولی۔

”مائٹن آپ یہاں کب تک رہیں گی؟“ ”میں آج شام کو ہی جا رہی ہوں۔ چار بجے اور بھی میرے ساتھ ہیں۔“ وہ اسے مطمئن کرنے کو بولی۔

”آج شام کو ہی!“ حمیدہ کا دل ٹوٹ گیا۔
”اچھا ہی تو ہے نا، ورنہ جتنے دن دیکھتی رہوں گی خواہ مخواہ دل اٹکتا رہے گا۔“

حمیدہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنے کو دلچ لیا۔ ڈاکٹر فی نے اسے دیکھا اور جیسے سمجھ کر بولی۔

”دودھ کا زور ہو رہا ہو تو پلا دو۔“

”نہیں۔“ حمیدہ مضبوطی سے بولی۔ ”میں اسے دودھ نہیں

پلاؤں گی۔“

”کیوں؟“ ڈاکٹر فی حیرت سے بولی۔

”مالکن۔“ وہ بھنچی ہوئی آواز سے بولی۔ ”ایک ماں جب اپنے سینے سے اپنی اولاد کو مانتا کارس پلا دیتی ہے تو یہ محبت بالکل ہی اٹوٹ اور نہ بھجھڑنے والی ہو جاتی ہے۔ دودھ کی دھاراں کی چھاتی سے نکل کر بچے کے منہ میں پڑتی ہے تو دونوں کے بیچ ایک واسطہ ہو جاتا ہے۔ ایک خاموش معاہدہ کہ میرے بچے میں تجھے سدا یونہی اپنی اچھاتیوں کا رس پلاتی رہوں گی۔ میں۔ میں اپنے بچے سے ایسا جھوٹا وعدہ کیسے کر لوں مالکن؟“ اس کی بے نور آنکھوں سے آنسو جھرجھریا اٹھے۔ حمیدہ نے دھیرے سے نوٹ تنہا سے اور پلٹ گئی۔ دروازے کے پاس جا کر وہ رکی پھر دوڑتی ہوئی بچے کے پاس آگئی۔ بچہ بے خبر سو رہا تھا۔ وہ تڑپ کر بولی۔

”مالکن آپ اسے کیسے پالیں گی؟ کیا پلائیں گی؟“
ڈاکٹر ٹنی ذرا دھم سے مسکرا کر بولی۔ ”آخر میں بھی ڈاکٹر ٹنی ہوں اور کئی بچے حاصل کر چکی ہوں، دل چھوٹا نہ کر دو، تمہارا بچہ بالکل اچھا رہے گا۔“

”مالکن۔“ وہ پھر سے بولی۔ ”میں بھی اگر اسٹیشن تک آپ کے ساتھ چلوں تو؟“

”مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ ہاں تم اپنے دل کا سوچو۔“
حمیدہ وہیں گھٹشوں میں سر دبا کر بیٹھ گئی۔ کہنی دیر گزر گئی۔ اس کی آنکھوں کے آگے سیاہ دھبے ناچنے لگے۔ کچی زچہ اتنی دور کی تھکن، اور سب سے بڑھ کر بچے کی جدائی۔ اس کا بند بندہ دردمند رہا تھا۔

گھوڑا گاڑی دروازے سے لگی اور پھر وہ سب اسٹیشن پہنچ گئے۔
 "مالکن،" وہ ہچکیاں لے لے کر بولنے لگی، "آپ ڈاکر ٹی ہیں،
 جانتی ہوں گی کہ ایک ماں کتنے کڑے دردوں کے ساتھ بچہ پیدا
 کرتی ہے۔ آپ نے بھی کتنے ہی بچے پیدا کروائے ہوں گے۔ آپ
 کے پاس بھی عورت کا دل ہے۔ مالکن جب جب نہار دئے گا میرا دل
 کٹ کٹ کے بہا کرے گا۔ آپ یہ سوچ لیا کریں مالکن کہ وہ میرا نہیں
 آپ کا۔ آپ کا ہی بچہ ہے۔"

ریل چمک چمک کرتی دور ہوتی جا رہی تھی۔ حمیدہ کے سینے
 میں بچل سی ہونے لگی۔ دودھ سے لبریز چھاتیاں نہنے منے ہرنٹوں
 کے لمس کو بے قرار تھیں اور پھر مانتا کی ماری دوندیاں چمک چمک
 کرتی اٹھ رہی تھیں۔ حمیدہ نے سر نہ جھڑا کر دیکھا۔ اس کا سب کچھ
 چلا گیا تھا۔ خالی کو کھاسے رہ رہ کر دس رہی تھی۔ اس نے دونوں
 ہاتھوں سے اپنی چھاتیوں کو جکڑ لیا۔ "میرا بچہ۔"

ریل چلی گئی اور حمیدہ کتنی ہی دیر تک وہاں کھڑی رہی۔ پھر
 وہ جبرے دھیرے سے ہوش آیا اور کمر میں روپیوں کی موجودگی
 کا احساس ہونے لگا۔ وہ شکور کو کیا منہ دکھائے گی؟ سات برس
 اس نے جس لگن سے اپنے مسافر کی چاہرت کی تو کیا اسی دن کے لئے
 کہ یوں بچھڑ جائے! میں کہہ دوں گی کہ یہ سب تمہارے ہی لئے تو کیا
 ہے۔ تم جیو میرے سر کے تاج! ایسے کئی پھول کھلا دو گے۔ ایسا ہی
 تمہیں بچے کی یاد دتائے تو۔ تو میں کیا کہوں گی؟ کون جانے کس
 دلش کو وہ مسافر گیا ہے۔؟ میں۔ میں کیا کروں۔؟ کیا سوچوں۔؟

مینہ بیٹھا جا رہا ہے۔

ارسی دیوانی! تیرے سر پر تو تاج سا جگمگا رہا ہے۔ تیرے سر کا تاج سلامت ہے۔ تجھے اور کیا چاہیے۔؟ کوکھ پھر بھی بھر جائے گی۔ سہاگ باسبار کہاں ملتا ہے۔! دیوانی! لٹو پوچھ بھی لے، پوچھ بھی لے۔

طبیعی کے میدان کے گیس ہنڈولے یہاں سے صاف نظر آتے تھے۔ اسٹیشن اور میدان کا فاصلہ ہی ایسا بگڑا تھا۔ جس دن شکو قبریں سونے والا ہوتا پھوٹا موٹا میدان ہی وہاں لگ جایا کرتا۔ رات تو یہی گئی تھی، کبوں نہ وہ میدان تک چلی جائے کہ شکور کو ساتھ لے لے۔ گھر پہنچ کر خالی کوکھ دیکھ کر تو اسے برا ہی طیش آئے گا۔ یہاں روپے تباہوں کی تو اسے ذرا سکون مل جائے گا۔

ہاں یہی ٹھیک ہے۔ اور اب یہ آئینہ نہیں بننے چاہئیں۔ اب تو خوشیاں آئیں گی۔ کالے بادل ہٹ گئے، روشنی جھانکتی آرہی ہے۔ اب کہہ! کو پیٹ بھر روٹی ہوگی۔ مینے کونین بھر کپڑا۔ اور منا؟ مئے چپڑوں کا کیل ہے، سال دو سال میں گھر بھر جائے گا۔

خیالات کی رو میں بہتی بہتی وہ عین میدان کے بیچ پہنچ گئی۔ لوگ ہنڈولے جھلاتے ادھر ادھر رہے، رہے تھے۔ چیخ چاہت تھی۔ وہ اپنے کچے زخموں کو چھپائے سراپمہ سراپمہ سی کھڑی تھی کہ اکدم کوئی اس کے قریب سے گزرا۔

”ارے کوئی اس کی چچی اور بیوی کو خبر کر دے۔ بے چارہ قبر میں ہی گھٹ کر رہ گیا۔ آخر لاش گھر کیسے پہنچے؟“

"ہوا کیا۔؟" دوسرا آدمی تاسف سے پوچھ رہا تھا۔
 "ارے تپہ نہیں سجائی، وہ شکور ناکہ قبر میں سوتا تھا کہ نہیں
 تو آج ہمیشہ کے لئے ہی سو گیا۔ صبح ہی کھانسی رہا تھا۔ اور اس کی
 صحت بھی خراب دکھائی دے رہی تھی، مگر پیٹ برا ہے سجائی، کیا کرنا؟
 اور نا ہے غریب آج ہی ایک بچے کا باپ بھی بنا تھا۔!"

سہاکن

(۱۱)

سلیمان میاں تو سدا کے بگڑیل تھے۔ اس میں ان کا اتنا اپنا قصہ بھی نہ تھا۔ جتنا کہ ماں باپ کا۔ اور باپ سے بڑھ کر ماں۔ اکلوتی اولاد تھے۔ جو بولنے والے پورا کر دکھائیں۔ جوانی آئی مگر ان کے چلن میں کوئی فرق نہ آیا۔ بس وہی کریں گے جو دل میں سلئے گی۔ ماں باپ نے چھوٹ ہی ویسی دے رکھی تھی۔

بھری برسات کے دن۔ ہالے میں پانی اچھل اچھل کر کتھی رنگ کا ہو گیا، بھر لٹے دار ہوا اور جھرا لٹے کا بہاؤ۔ ایسے میں بھلا کوئی یوں نیرنے کو جابا کرتا ہے۔

باہر نکلنے لگے تو ماں نے پوچھا بھی۔ ”کہاں جاتے ہو سلو میاں؟“
 بولے۔ ”ایسے ہی ذرا باہر گھوم کر آتا ہوں اماں۔“
 ”دوئی ایسے میں کہاں گھومنا ہے میاں۔؟ سارے میں بھپو یا میٹ ہو رہی ہے۔ ایسے میں گھر بیٹھے ہیں یا سیر سپاٹے کو جاتے ہیں۔؟“
 ”آپ تو چاہتی ہیں میں لڑکیوں کی طرح گھر ہی میں بیٹھا رہا کروں۔ بھلا اس موسم میں تیرنے کا جو مزہ ہے وہ پھر کہاں۔؟“ دھڑک

سے دروازہ کھول باہر نکل گئے۔

صبح سے دوپہر ہوئی، دوپہر سے سہ پہر، سہ پہر سے شام اور
پھر کالی گھور اندھیری رات۔

رات کے سناٹے میں محلے والے سلومیاں کی لاش حفیظ میاں
کے گھر میں چپا گئے۔

”ہائے میرا لال۔!“ حفیظ میاں دھاڑے۔

اندھیرے کو ٹوٹو لیتی ہوئی ماں دروازے تک آئیں تو دیکھا
کھری چار پائی پر دھلی دھلائی لاش رکھی ہے۔ اور کچھ ان سے
دیکھا نہ جاسکا۔ دھڑ سے چوکھٹ پر گر پڑا
اختر، بھائی کے بچے کو گود میں لئے دد دھو روٹی کا چور ما کھلا رہی
تھی۔ ”راجہ کیا کھائے گا۔؟“

”ہاں۔ منا منہ بچا کر بولا۔

”راجہ کیا پئے گا۔؟“

”مما۔“

”اور راجہ دلہا کیسے بنے گا بھئی۔؟“

”ڈھم۔ ڈھم۔ ڈھم۔“ منادوں ہاتھوں سے ہوہو کے

تالیاں پیٹنے لگا۔ اختر زور زور سے ہنسنے لگی۔

اک دم باہر سے عزیز میاں لپکے ہوئے آئے۔ ان کے ہاتھوں
میں مسلا مسلا یا پورٹ کا رڈ تھا اور چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔
اختر کو یوں بے تحاشہ ہنستا دیکھ کر ان کا منہ کھینچ گیا۔ اپنی ساری طاقت
سمیٹ کر وہ بڑی خشک سے پکارے۔

”اجی کہاں ہو۔؟ سنتی ہو۔!“
 وہ بوکھلائے بوکھلائے اختر کی اماں کو آواز میں دینے لگے۔
 ”جی۔“ عارفہ بیگم کھلا سر دھا بچتے ہوئے، ذرا مسکراتے ہوئے
 باورچی خانے سے نکل آئیں۔

”ذرا انڈے تلوار ہی تھی، مانا تو جلا کر رکھ دیتی ہے۔ تو پ میری
 آپ بھی یوں چلانے لگتے ہیں کہ آدمی بدحواس ہو جائے مگر۔“ اک دم ان
 کے ہاتھ کی طرف دیکھ کر بولیں۔
 ”کس کا کارڈ آیا ہے۔؟“

عزیز میاں کہیں بہت دور سے پورے۔ ”سیلیمان میاں کہیں
 تیرے لگے تھے۔“ اختر کے کان کھڑے ہو گئے۔ عارفہ بیگم کا منہ ذرا
 ذرا کھل گیا۔ میاں رک گئے تو بے تابی سے بولیں۔

”ہاں ہاں تو کیا ہوا سپھر۔؟“
 ”آدھی رات سواں کی لاش گھرائی گئی۔“

”لاش۔؟“ عارفہ بیگم نے سوئے ہوئے انداز میں کہا۔ ”لاش؟“
 سفید آنچل ان کے سر پہ پھڑپھڑ کرنے لگا۔ اختر کے ہاتھوں
 سے دودھ روٹی کا نوالہ چھٹ کر رکابی میں جا گرا۔ اک دم عارفہ بیگم
 دوڑیں اور اختر سے لپٹ کر بین کرنے لگیں۔

”ہائے میری بیٹی! ہائے میری دلاری۔ ابھی تیرے سہرے کے
 پھول کھیلے تھے نہ سمجھے کہ بیوہ ہو گئی۔ ہائے!“ ماں کے آنسوؤں سے
 اختر کا منہ دھل رہا تھا اور وہ سہم کر ماں کو دیکھے جا رہی تھی۔ چند ہی
 لمحوں میں وہ اس قدر بوڑھی ہو گئی تھیں۔

سلو میاں خود تو قبر کی گود میں جا سوئے اور اختر کے نعیموں کو روگ لگا گئے۔ اختر گیا ہویں سال میں تھی۔ زمانہ ہوا سلو میاں سے نسبت طے پا چکی تھی اور اب تو شادی کی تاریخ مقرر ہوئے کی گڑبڑ بچ رہی تھی۔ چھوٹی سی دھان پان سی گڑیا۔ یوں تو گیا رہ برس پورے ہونے کو آرہے تھے مگر ذرا بھی سمجھ نہ تھی۔ ساس کی مہی خوشی تھی کہ گڑیا ایسی ہو گھر میں جیم جیماتی چلے۔ ادھر ماں کہتی تھیں۔ ”کچھ نہیں تو بیٹیا کو ہر ادویہ تو اڑھا دوں۔“

اب لاکھ نہیں تھیں بی اختر، مگر یہ تو سمجھ تھی ہی کہ اپنی نسبت لگ چکی ہے۔ خالہ کے بیٹے سلو میاں کبھی چھوٹی خالہ سے عبید بقر عبید کو ملنے آتے تو اماں پھسکارتیں۔

”دوئی لڑکی شرم ہے یا نہیں؟ اندھا کر بیٹھ۔ کیا ہونے والے مرد سے دیدے لڑائے گی۔“

اندھا کر بیٹھ تو جانیں، مگر دروازے کی جھری سے آنکھ لگ جاتی۔ ”کالی ٹوپی، ناسی رنگ کی اچکن، چست پاجامہ۔ ہائے کیا پیارے شہزادے سے لگ رہے ہیں۔ میں مرجاؤں! اماں نے ان کی پیشانی پر کیسے چٹ سے بوسہ لے لیا۔ لو وہ بیٹھ بھی گئے۔ جانے کیوں ادھر ادھر نظر بدوڑا رہے ہیں۔ اب ایسی سبھی کیا شرم! سبھی اماں اتنے چاؤ سے سیویاں کھلا رہی تو کھا کیوں نہیں لیتے۔؟“

”ادر تو گھر میں سب خیریت سے ہے خالہ بی۔؟“ وہ بڑی شرم سے پوچھ رہی لیتے۔

خالہ بی کے چہرے پر مہیسی کی ہر سی آئی، مگر وہ سنجیدہ ہو جاتیں۔

”ہاں اللہ کا فضل ہے۔“

”اے لو۔ کیسی مطلب کی بات کرتے ہیں۔ اب سہابی دلہن سنا بیٹھی ہیں۔ سنا وہیں اچھل پھاندر رہا ہے، جیسا ساتھ بیٹھے سیو لڑوں میں حقہ لگا رہے ہیں، ابا تو ہوں گے ہی بیٹھک میں۔؟ پھر آپ کس کی خیریت پوچھتے ہیں۔؟ سبھی یہ، واہ، ذرا سی شرم بھی تو نہیں آتی؟“

سہابی دلہن جان بوجھ کر اندر آجائیں اور مندر ہونے کے ناطے مذاق کرنے سے کبھی نہ چو لیتیں۔

”اے بی بی یہ جھری سے لگ کر کیوں بیٹھی ہو۔؟“

”ہائے سہابی دلہن، قسم لے لو جو میں نے کسی کو دیکھا ہو۔ مجھے دیکھنے کی فردرت بھی کیا ہے۔؟ اماں تو پاس بیٹھی خود ہی منہ میں لاڈ سے سیویاں بھرے جارہی ہیں، پھر میں.....“

”کیوں سی بد ذات! تو نے دیکھا نہیں تو آپ ہی آپ غیبی حال کیسے معلوم ہو گیا۔؟“

”اب سہابی دلہن سے کون بتائے! سہلا منگیتر کو دیکھ بنا کیسے رہا جاسکتا ہے۔؟ ہائے اتنے دور سے تو بے چارے عید کو آئیں اور کوئی انہیں دیکھے بھی ناں! ایسا کیا سہابی نے کبھی سہیا کو نہ دیکھا ہوگا۔“ وہ جان بوجھ کر ہاتھ ہلانے لگتی کہ چوڑا کھن کھنا اسٹھیں او وہ سمجھ لیں کہ اتنی دور آنے کی محنت اکارت نہیں گئی۔ ”ہاں جی نہیں دیکھ لیا ہے۔“

بچپن کی حدوں سے نکل کر جوانی کی سرحد میں داخل ہونے ابھی ننھوڑے بہت دن باقی تھے، مگر اکوماں یہ تو جانتی تھیں کہ سلیمان

میاں کے نام سے ان کی کلیاں مہکنے والی ہیں۔ اب جو جان جوان موت کی خبر ان کے کانوں میں پڑی تو اسی دم وہ کلیاں مرجھا گئیں۔ اتنی دیر میں کتنے خیال آئے اور چلے گئے۔ آنکھیں اکب آئینہ ٹپکا۔ اماں ایسے ہلک ہلک کر رو رہی تھیں۔ "ہائے میری آلو کا کیا بنے گا، ہائے میری لاڈلی۔"

اماں کو یوں رونے دیکھ اختر کی آنکھوں سے بھی ندی سی امڈ پڑی۔

(۳)

اس دن صبح اختر اپنے بستر پر سے اٹھی تو چھوٹی سی ریشمی رضائی کو لات مار کر دوڑا دیا۔

"اتنی سی رضائی لے کے میرے پلے باندھ دی۔" وہ دناؤں تو پیر باہر نکل پڑتے ہیں۔ پیر ڈھانکوں تو کم بخت سر کھلا رہ جاتا ہے۔ "وہ بستر پر سے آنکھیں لپیتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ مارنے بیگم نے سہم کر سر اٹھایا۔

جوانی بوں چپکے سے کیسے گھ گھس گئی، ارے بیٹی کی جوانی تو ڈھول تاشے بجاتے آتی ہے۔ پیر آنکھوں کی پلکیں گہری اور لمبی ہو جاتی ہیں، سچ آنکھیں آپ، آپ جھکی جھکی رہنے لگتی ہیں۔

بازوؤں پر صندل کی شاخوں کا گمان ہوتا ہے اور پیر سے سونے جی رہیں تو لگتا ہے چلتے میں پالمیں کی پنچنگ رہی ہیں۔

یہ کیسی جوانی ہے خدایا! جویوں خاموشی سے گھر پر گھس گئے۔

پلکوں کی وہ جھلک چھپی چھپی کیوں تھی۔؟ آنکھوں میں وہ شرمیلا انداز کہاں تھا۔؟ بازو صندل کی شاخوں ایسے کب لگے۔؟ اور نواور چلتے ہیں کبھی پائل نہ چھینکی۔ اور یہ سب کچھ ایک ہی رات میں ہو گیا۔ راتوں رات اس باغ پر بہا کر کیے آگئی کہ کالی آنکھوں پر پلکوں کا پردہ دبیز سے دبیز تر ہو گیا۔ آنکھیں جھل جھل مل جھل مل قندیلیں سی بن گئیں۔

وہ رہ کر جگمگاتی اور کانپتی سی قندیلیں! بازوؤں میں رسا بھر گیا۔ یہ سب کچھ کیسے ہوا۔؟ کب ہوا۔؟ اور جب اکو ماں بستر سے اٹھ کر حمام تک گئی تو خاموش آواز کے ساتھ یہ چھپا چھپ کیسی۔؟ گہرا بہا کو قید کیسے کیا جاسکتا تھا۔؟ سرسراتی ہوا میں تو آپ تباہی ہیں۔

"تو بھئی بہا ر آگئی — بہا ر آگئی — بہا ر آگئی۔!"
عارف بیگم کے ہاتھ کا نوالہ ہاتھ ہی میں رہ گیا۔ وہ سہمے ہوئے دل سے اس بہا کی منتظر تھیں۔ بھرے گھر میں یہ ایسی کیسی بہا آئی کہ بجائے خوشی کے دل ڈوبنے لگا۔

عزیز میاں کے لئے حنفہ گرم کر کے بیچیک میں لے گئیں تو عارفہ بیگم یوں چپ چاپ تھیں۔

"کیا بات ہے۔؟" عزیز میاں حنفہ گرگڑا کر بولے۔

انہوں نے ادھر ادھر دیکھا اور ذرا بے بسی سے بولیں۔ "اپنی اکو ماں سیانی ہو گئی۔"

اپنے لگائے ہوئے درخت پر پھول کھلیں، بہا ر جھومے تو چہرے پر ہنسی آتی ہی ہے۔ خوش ہو کر بولے۔

"اچھا۔؟"

عارف بیگم نے حیرت سے میاں کو دیکھا۔ ”آپ تو یوں مطمئن ہیں، ایسے خوش ہو رہے ہیں جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ میں کہوں یہ کوئی خوش ہونے کی بات ہوئی۔“

عارف میاں نے حنفہ گڑ گڑایا۔
 ”اور مجھے تو اس میں رنج ہونے کا کوئی ٹک نظر نہیں آتا۔ بھلا اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟ اس میں فکر مند ہونے کی کیا بات ہے کہ بیٹی جوان ہو گئی۔“

عارف بیگم نے ترس بھری نگاہوں سے ماں کو دیکھا۔
 ”نزدور اپنا بوجھ زمین پر اتار کر خوش ہوتا ہے۔ سر پر دھرا ہے تو اس کی جان کھوکھلی پڑ جاتی ہے۔“

عارف میاں نے چونک کر بیوی کو دیکھا، پھر خود کو مطمئن بنا کر بولے۔ ”وہ تو ٹھیک کہا تم نے، مگر خواہ مخواہ فکر مول لینے سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے بھلا۔“

”خواہ مخواہ کی فکر؟“ وہ درد سے مسکرائیں، ”یہ تو اتنی بڑی پریشانی کا سودا ہے۔ میری تو ابھی سے جان آدھی ہوتی جا رہی ہے۔“
 ”ارے دنیا کی بڑیاں جوان ہوا کرتی ہیں، مگر کہیں مائیں یوں پریشان ہوا کرتی ہیں؟ ہم نے تو ایسے موفعوں پر ماؤں کو مٹھائی بانٹتے دیکھا ہے۔ خوشی خوشی عزیز رشتہ داروں کو جوڑتی ہیں، گانا بجانا ہوتا ہے، ہنگامے ہوتے ہیں۔ اور بات ہے سبھی ٹھیک۔ مالی سچوں کے کھیلنے پر اداس نہیں ہوتا، وہ تو سچوں کو نہیں سماتا کہ چلو میری محنت ٹھکانے لگی۔“

”مگر سہارا بھول.....“ وہ آگے کچھ نہ بول پائیں۔
 ”ہائے! آپ اتنی بڑی بات بھول رہے ہیں۔ بھلا اس کی شادی
 کیسے ہوگی؟“

عزیز میاں اور زیادہ حیرت زدہ ہو گئے۔
 ”کمال کی بات ہے! ارے ہماری اکو ماں اتنی حسین، اتنی پیاری
 ہے کہ اس کے لئے ستر پیام آئیں گے اور ایک سے بڑھ کر ایک آئیں گے۔
 بلکہ تمہیں تو یہ پریشانی اور الجھن ہوگی کہ کس کو دوں اور کس کو نہ دوں۔“
 عارفہ بیگم نے آنکھوں میں امدے ہوئے آنسوؤں کو دوپٹے
 سے پونچھ لیا۔ ”کاش ایسا ہی ہوتا۔“

”کاش ایسا ہی ہوتا؟“ میاں چمک کر بولے، ”اس میں
 یوں مدد ہالسا اور آئندہ ہونے کی کیا بات ہے بھئی؟ ہوگا اور ایسا
 ہی ہوگا۔“

مگر آپ اتنی بات بھول رہے ہیں، ہماری اکو کا منگینتر سال بھر
 پہلے ہی جان جوان مرجکا ہے۔“

عزیز میاں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ ”ہم چاروں کی کتنی
 خواہش تھی کہ یہ رشتہ ہو جاتا! ہو تو جانا، مگر قسمت کو کیا کہہ سکتے
 ہیں؟ کیسے جوڑ کو جوڑ تھا۔ چاند سورج کی جوڑی تھی۔ مگر عارفہ
 بی بی خدا کی مصلحت خدا ہی جانے۔ اب کیا کیا جاسکتا ہے۔ سوا
 افسوس کسے!“

دونوں خاموش ہو گئے۔ صرف حقہ کی گر گر اہٹ باقی رہ گئی۔
 عارفہ بیگم نے خاموشی سے کہنا شروع کیا۔ ”کل دہن بیگم کہہ رہی تھیں

حسینہ بیگم سے ملاقات ہوئی تھی۔“

”پھر۔؟“ عزیز میاں نے ذرا تعجب سے پوچھا۔

”اُن کا خیال تھا کہ اختر کو اپنے بیٹے کو.....“

عزیز میاں نے مارے خوشی کے حلقہ کی نئے چھوڑ دی۔ دیکھا۔

میں نہ کہتا تھا کہ اختر کے لئے پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں! جی دیکھا اس کے لئے ایک چھوڑ سوا بیٹے گئے۔ ہاں مگر وہ لڑکا کرنا کیا ہے؟

شاید ریلوے میں ملازم ہے۔! سبھلا تنخواہ کیا ہے اس کی۔؟“

”سارے تین سو۔“ وہ مرے ہوئے لہجہ میں بولیں۔

انہوں نے خوشی خوشی پھر حلقہ کی بنے پکڑ لی۔ ”تب تو کچھ

ٹھیک ہے۔ آج کل کے زمانے میں سارے تین سو کچھ کم تو نہیں ہوتے

اور پھر وہ بی۔ اے پاس بھی ہے نا۔“

بیگم کچھ نہ بولیں تو پھر بولے۔

”اور اشارۃ اللہ صورت شکل بھی خاصی ہے۔“

وہ پھر حلقہ گڑ گڑانے لگے۔ عارفہ بیگم ٹھنڈے لہجہ میں بولیں۔

”تو حسینہ بیگم کہہ رہی تھیں کہ لڑکی تو ایسی ہے چاہو تو چاند سورج

کے مقابل بٹھا دو۔ مگر ایسی منحوس لڑکی کو اپنی بہو بنالیں جس نے آگے

ہی اپنا منگیتہ کھا لیا ہو۔!“

”منحوس۔“ عزیز میاں چلائے نے پھر ساتھ سے چھوٹ گری۔

انہوں نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔ ”جس نے آگے ہی اپنا منگیتہ کھا

لیا ہو۔!“

کتنی ہی دیر خاموشی رہی، پھر عارفہ بیگم بولیں۔

”بس اتنے دنوں سے مجھے تو یہی ڈبکا لگا ہوا ہے، ورنہ کون بیٹھی ایسی ہوگی جسے پیام نہ آتے ہوں۔؟ برے بھلے، کھٹے میٹھے، کیسے ہی بیر ہوں، پیچھڑو مارے ہی جاتے ہیں۔ مگر.....“

دونوں نے بڑی بے بس نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ غم نے جیسے ان کے چہروں کی تار لگی چھین لی۔ دونوں کی آنکھیں خشک اور بے جان نظر آرہی تھیں۔

مگر عزیز میاں اور عارفہ بیگم جس بات سے پریشان تھیں وہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ کیونکہ ابھی ہسینہ بھر بھی نہ گزرا ہوگا کہ اکوٹا کے لئے نسبت والے آگئے۔ لڑکا شہر میں کوئی ملازمت کرتا تھا۔ پچیس برس چھبیس کے لگ بھگ عمر تھی۔ یعنی لڑکے اور اکوٹا کی عمریں ہیں آدھوں آدھ کا فرق تھا۔ تنخواہ یہی کوئی دو ڈیڑھ سو کے قریب تھی۔ ماں باپ نے ان باتوں میں سے ایک کو بھی برا نہ جانا۔ چار پانچ برس گزریں گے، دو چار بچے ہو لیں گے تو عمر کا فرق مٹ جائیگا۔ جسم بھاری ہو جائے گا تو خود اکوٹا میاں سے نکلتی ہوئی دکھائی دے گی۔ تنخواہ کا کیا ہے؟ کھانے والی اپنی قسمت سے کھاتی ہے۔ بڑی چھان بین کر کے بھی دو لڑکے کھانے والی کے نصیب میں نہ ہوتو ہوا بھی سوکھتا ہے۔ اپنے اپنے نصیب کی بات ہے۔

اور خاندان کا کیا پوچھنا یا چھینا تھا؟ مسلمان تھے لہذا...
تھے۔ جیسی بس تھا۔ شگنی کے وقت انگوشی چھینانے جب انہوں نے لڑکی دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو گو کہ یہ عین ناممکن سی بات تھی (بجائے شریفوں میں کہیں یوں بیٹیوں کی صورت شکل دیکھی بھائی جانی ہے)

پھر بھی عارفہ بیگم نے مصلحت اسی میں جانی کہ چپکے سے دلہن کی شکل تباہی دیں، ورنہ کل کلاں کو وہ کہنے کو بیٹھیں گی۔

”بھئی کیا شادی کرنے۔؟ لڑکی کی ایک جھدک تو نہ تباہی۔
اب ہم کیا جانیں کیا سبید تھا جو بیٹی چھپائی گئی۔؟ اے کیا ہم مرد تھے کہ بیٹیا کو کونے میں لے جا کے بٹھا دیا۔؟“
بیٹی کی شکل جس نے دیکھی اس کے منہ سے ”ہا“ نکل گئی۔ کسی منہ نہٹ نے تو منہ پھوٹ کے پوچھ بھی لیا۔

”اے ایسی چاند سی صورت پر انہی عمر ہو گئی۔؟“
عارفہ بیگم نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

”دوئی مہن چاند سی صورت کا کیا ہے۔؟ بیٹی سیانی ہوتی تھی دواغ کہتے ناکہ لمے کے یوں ہی کچی ہنڈیا دسترخوان پر برت دیتے ہیں۔ اور انہی کم عمری میں ان کے بادا کی مرضی بھی نہیں۔“

سمد جھانے میں لوگ یوں ہاتھ لیے کر کر کے لڑتے بھڑنے کو تو جاتے نہیں ہیں، چپ رہ گئے۔ مگر عارفہ بیگم کے جی کو ادھر ٹپکے لگ گئے۔
”نکاح خوانی کے چار بولی جب تک نہ پڑھائے جائیں، میرا جی تو یوں ہی ہڑکے گا۔ پھر بعد کو نیک بخت پر جو بھی گزرے سو گزرے۔“
”کیوں کیا ہوا۔؟“ میاں بڑبڑا کر بولے۔

”ہوتا کیا۔؟ بیٹیا کی صورت دیکھی تو وہیں سلفے ہی چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ ایسی چاند سی صورت والیاں تو منگوترے میں ہی دوسرے کی ہو جاتی ہیں اور یہ تو اتنی بڑی ہو گئیں کہ چلنے میں زمین ہلا رہی ہیں۔“
عزیز میاں کھنچا کر بولے۔

”ہونہ ! یکٹنے والوں کو یکٹنے دو۔ شادی ہو جائے گی تو آپ ہی سبھوں کے منہ بند ہو جائیں گے۔“

سمدھیانے والوں نے جب بنارس سرخ دوپٹہ اڑھا کر انگوٹھی پہنائی تھی تو بنا، سنگا رپار کے اختر کی صورت ایسی چاندیسی چمکنے لگی کہ سیاہی لوٹ لوٹ ہو ہو گئیں اور جاتے جلتے بول گئیں۔

”دوئی میں جلد ہی اپنی بہو کو بیاہ لے جاؤں گی۔ ایسے اجاے تو میرے گھر میں ہونے چاہئیں نا بہن۔؟“ وہ عارفہ بیگم سے مخاطب تھیں
”ہاں بہن۔ آپ ہی کی لڑکی ہے، جب بھی لے جائیے : چاہیے
اسی وقت۔“

”ناں بہن، اس وقت کہاں لے جاسکتی ہوں۔؟ ابھی تو بیٹے کو چھٹی نہیں ملی۔ ورنہ میرا بس جو چلتا تو ساتھ ہی لے کر چلی جاتی۔“
کہاں تو بہو اتنی پیاری تھی کہ بار بار دروازے میں سے پلٹ پلٹ کر دیکھتی تھیں اور جلد سے جلد اٹھا لے جانے کا جتن تھا یا اب دو مہینے چھوڑ چھ مہینے گزر گئے اور کوئی ٹھور ٹھکان ہی نہیں۔ ایک ایسی ہی مل لگی سی شام کو سمدھیانے کا آدمی ایک پرچہ پاٹ لایا۔
بہن صاحبہ - !

آداب عرض۔ ہم تو بیٹی کی پیاری شکل دیکھ کر تبھی چونکے تھے کہ ہر وصال میں کالا ہے، مگر آپ نے بات کی تہہ تک نہ جلتے دیا۔ وہ تو بھلا ہوا کہ ہمیں پہلے ہی پتہ چل گیا کہ صاحبزادی منحوس ماری ہیں۔ اپنے منگیتز کو کھائے بیٹھی ہیں۔ ورنہ جاتے ہمارے۔

گھر کا کیا حشر ہوتا۔ بہن آخر آپ کے دل میں بھی دیا
محبت تو ہو گئی ہی، پھر آپ اپنی اولاد کے لئے دوسرے
کی اولاد کا برا کیوں چاہتی ہیں۔؟ آپ کے رویہ سے
ہمیں سخت تکلیف پہنچی ہے۔ وہ تو اللہ بھلا کرے ان
بے چاروں کا جنہوں نے ہماری معلومات میں اضافہ
کیا اور صورت حال سے مطلع کیا، ورنہ ہمارے گھر بھی
اوبول جاتا۔ ہمیں سب کچھ پتہ چل گیا ہے۔
امید ہے کہ آپ ہمارا سرخ دوپٹہ اور سونے
کی انگوٹھی، جو پورے سات ماٹھے کی تھی، واپس کر
دیں گی۔

آپ کی بہن، سلطانی بیگم
پرچی ہوا کے زور سے اڑی، دیواروں سے ٹکرایا، ہر آدمی
میں گھومتی پھری۔ والائوں میں رکی اور پھر ہوا کے ایک زناٹے دار
جھکڑ کے ساتھ اکوماں کی گود میں جا پڑی۔
"ہمیں سب کچھ پتہ چل گیا ہے۔!"
"ہمیں سب کچھ پتہ چل گیا ہے۔!!"
"ہمیں سب کچھ پتہ چل گیا ہے۔!!!"
ہواؤں نے زور باندھا اور چلائی۔
"ہا جنرا دی منجوس ماری ہیں۔!"
"دیواریں سرگوشیاں کر لے لگیں۔"
"ہا جنرا دی منجوس ماری ہیں۔!"

والان، پیش والان، ہا مدے خاموش آوازوں سے چلانے لگے۔

”ہاں سچ۔ صاحبزادی منحوس ماری ہیں۔!“
 بی بی نے گہرا کر میاں کی صورت دیکھی۔ ”میں نہ کہتی تھی کہ
 اب زندگی نے آزمائش شروع کر دی ہے۔!“
 میاں کچھ نہ بولے۔ بولنے کو تھا بھی کیا؟
 ”جانے ہم سے کون سا گناہ سرزد ہوا ہو گا جو بولوں را ندے
 جا رہے ہیں۔“ عارفہ بیگم تنہا کی ماری سانس لے کے بولیں۔
 ”سکھ دکھ سب اسی کی دین ہے بی بی، برداشت کرو۔“ عارفہ
 بیگم کے آنسو بہہ اٹھے۔

”منہیں ہوتا برداشت۔ بالکل نہیں ہوتا کھا یا پیا انگ نہیں
 لگتا۔“ راتوں کی فینداڑ گئی۔ دلی کا چین، آرام مٹ گیا۔ ہائے میری
 معصوم سچی۔“

”برداشت کرو بی بی، برداشت کرو۔ ادھر والے کے پاس
 انصاف ہے۔ ہاں دیر ہے مگر اندھیر نہیں۔ برداشت کرو۔!“

(۳)

دوسرے دن عارفہ بیگم روز کی طرح صبح صبح چائے کی پیالی لے
 کر میاں کے بستر کے پاس گئیں تو وہ روز کی طرح بی بی کے قدموں کی
 چاپ سنکر اٹھ کر نہ بیٹھے۔ بی بی نے کندھا پکڑ کر بلایا۔

”جائے لیجئے۔ کلی کا پانی بھی یہاں رکھے جا رہی ہوں۔“
 عزیز میاں منہ اندھیرے ہی اٹھا کرتے تھے۔ پاس والی مسجد
 میں جا کر نماز پڑھ کر آتے۔ منجن علی کر دانت صاف کرتے، منہ ہاتھ
 دھو لے، پھر قرآن شریف لے کر بیٹھ جاتے۔ پارے دو پارے پڑھ
 کر وہیں پلنگ پر لیٹ جاتے۔ سورج کی کرنوں کے ساتھ ادھر چلے بھی
 جل جاتے۔ بی بی میاں کو سوتا پاکر جلدی جلدی خود اپنے ہاتھوں چائے
 تیار کرتیں اور چائے کی پیالی اور کلی کے لئے پانی لے کر جگانے آتیں۔
 نیند گہری ہوتی تو وہ پانی اور چائے کی پیالی وہیں پٹی کے سر ہانے دھر کر
 چلی جاتیں۔ پانچ دس منٹ کے بعد سپر آواز دیتیں۔
 ”اے اٹھئے بھی۔ ٹھنڈی پالا ہو جائے گی تو کیا مزدائے گا؟“
 وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتے۔

آج بیٹھے بیٹھے انہوں نے آواز دی۔ ”اجی اٹھئے بھی۔“
 مگر میاں یوں ہی سر سے پیر تک رضائی اڑھسے پڑے رہے۔
 پانچ، دس، پندرہ، بیس منٹ چھوٹ گھنٹہ گزر گیا۔ بی بی اٹھیں
 اور ذرا التجہ کر بولیں۔
 ”دوئی ایسی بھی کیا نیند کہ جراتوں سے بڑھ کر ہو گئی۔ اس سے جلد
 تو ظہیر میاں اٹھ جاتا ہے۔“

”قریب آکر زور سے شانہ بلایا۔ پھر بھی نہ اٹھے تو منہ پر سے رضائی
 کھینچی۔ بڑی شکلوں سے رضائی کھینچ سکیں۔ وہ منہ پر جھکیں۔
 ”دوئی کم نجات چائے تو دیجئے کہ.....“
 مگر الفاظ ان کے منہ میں ہی رہ گئے۔ اک دم وہ چلانے لگیں۔

”ارے دیکھو تو۔ سنو تو۔ یہ تو بولتے ہی نہیں۔!“
 بیٹیا، بیٹی اور بہو دوڑتے ہوئے آئے۔ رضائی الگ کر کے
 دیکھا کہ ابامیاں ہمیشہ کے لئے سوچکے ہیں۔

(۴)

جیسا وقت عارفہ بیگم پر پڑا، خدا دشمن پر نہ ڈالے۔ امیر گھر کی
 لاڈوں، نازوں میں پلی اکلوتی اولاد تھیں۔ بھلا گھر میں کس بات کی کمی
 ہوگی۔؟ ثنادی ہو کر سسرال کو آئیں۔ میاں بھی اللہ کا فضل تھی۔
 بڑی ساری زمیندار سی تھی۔ اگر روپوں کو کھوند لیتی نہ چلتی تھیں۔
 تو یہ بھی نہ سمجھا کہ پیسے کو ترستی ہوں۔ ہزاروں سے اچھی حالت تھی۔
 پھر سسرے مرے تو جائیداد کا بٹوارہ ہوا۔ تین دیوڑ، دو
 جٹید۔ ساس، مندی۔ سب کے حصے بخرے لگے۔ پھر بھی خوش تھے۔
 یوں کہ اپنے آگے اپنی دال روٹی۔ وہی بس تھی۔ اگر دل کو اطمینان
 اور سکون میسر رہے تو دال روٹی تو پھر بھی اچھی بات ہے فاتے
 بھی برے نہیں لگتے۔ اور اطمینان و سکون کیوں نہ ملتا۔؟ میاں
 دل و جان سے واری۔ اولاد بھی اللہ نے دے رکھی تھی۔ ایک
 بیٹا، ایک بیٹی۔ زندگی سکون سے گزرتی تھی۔ گھر کی آمدنی تو تھی ہی
 جوان ہوئے تو بیٹے ظہیر میاں بھی نوکری سے لگ گئے۔ یہیں بڑے
 زمیندار خلیل خاں کے کاموں کی دیکھ رکھیہ کرتے تھے۔ ڈھائی سو
 دو سو ان کے بھی آتے تھے۔ بیٹیا جوان ہو تو ماں باپ کو اپنے دکھ درد

سجول جاتے ہیں۔ اور پھر کماؤ پوت سہی ہو تو پھر گھر میں خوشیوں کی بھری برسات برسنے لگتی ہے۔

مگر یہ تو پیدا کرنے والا ہی جانتا ہے کس کے نفیسوں میں کیا بدایا
 بیٹی کی نسبت بھی بچپن ہی سے خلیری بہن کے بیٹے سے لگی ہوئی
 بیٹی کی شادی چھائی کی بیٹی سے ہو چکی تھی کسی بات کی، اگلی پھلی
 کی کہیں نہ تھی۔ اطمینان سے بیٹھے تھے کہ بیٹی جوان ہوگی تو بہن اٹھانے
 چائے تھی۔ گھر میں جی بہلانے کو پوتا تھا اور دوسرے کی آمد آمد تھی۔
 مگر بیٹھے بٹھائے یہ ہوا کہ داماد سہرا ایک کا ہاندھنے سے پہلے ہی
 کھن پھٹ بیٹھے۔ بھرے گھر میں دھول اڑ گئی۔ جوان بیٹی کا ساتھ
 اور ساتھ میں بوم ہو گئی کہ محسوس ماری ہے۔ برے بھلے میں دل کو
 سہارنے والے میاں تو سنگی سا تھی تھے، سو وہ بھی ان دکھوں کو
 سہار نہ پائے اور چپن سے آنکھیں موند کر ایسے سوئے کہ پھر کبھی تو
 نہ اٹھے۔

”اب کیا ہو گا۔؟“ عارفہ بیگم اپنے آپ میں بس یہی سوچے جاتیں
 اور کڑھتی جاتیں۔ میاں کا چالیسواں ہونے ہوتے اس کڑھانے
 نے انہیں بڑھاپے کی آخری سرحد پر لے جا کر بٹھا دیا۔ آنکھیں سیاہ
 گردھوں کے اندر چلی گئیں۔ ناک کا بالنا اٹھل آیا۔ ہاتھ پیر جھولانے لگے
 دیکھ کر ترس آتا۔ اگر اکو ماں کا ساتھ نہ ہوتا تو حالت اتنی تباہ نہ ہوتی
 اور اکدم سے اتنی بوڑھی نہ ہو جاتیں۔ گمراہ تو بھرے گھر میں کوئی
 چھایا ہوا تھا تو بس اکو ماں۔ بیٹیوں کی جوانیاں تو پونم کا چاند ہوتی ہیں
 جو بادل کی ادٹ میں رہے یا نہ رہے چمکے ہی جاتے ہیں۔ بادل نہ ہو تو پھر تو

کیا کہنا، صاف سیدھی طرف آسمان پر جاگتا رہتا ہے۔ مگر کالی سیاہ بدلیاں ڈھانچے میں بھر بھی اندر سے جھلک مارتا ہی ہے۔ ایسے چاند کو کون سی بدلی ڈھانچنے کا حوصلہ کرے جس نے اپنے پورے پندرہ دن پورے کر لئے ہوں۔؟

اتنے دن ہو گئے تھے، کوئی تو نہ پلٹا۔ جہاں وہم، دسو سے اور اندیشے گھیر لیں وہاں نہ بٹنی کی خوبصورتی کام آئے نہ روپیہ پیسہ؛ سلیقہ کام آئے نہ تعلیم تربیت۔ عارفہ بیگم کھاتے پیتے بیمار ہو گئیں۔ سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے، ہنستے روتے بس یہی فکر، یہی دھن گھن کی طرح کھلے جاتی۔

”اکو ماں کا کیا ہوگا۔؟ اکو ماں کا کیا بنے گا۔؟“

یہ گنت تو انہیں آج کل سے نہیں اسی گھڑی سے نظر آ رہی تھی جب سے کہ سلو میاں جان جوان اس دنیا سے سدھار گئے تھے۔ کوئی نہیں سی امید کی کرن پھر بھی باقی تھی ہی جو بھرے اندھیرے میں اجالا کرنے کو کافی تھی۔؟ وہ میاں کا ساتھ تھا، مگر وہ کرن بھی جلتی بجھتی آخر کو دم توڑ گئی۔

سسرے کی موت نے دلہن بیگم کو شیر بنا دیا۔ پہلے یہ تھا کہ زمیندار کی آمدنی اور ظہیر میاں کی تنخواہ مل جل کر آتی اور گھر کا خرچ چلتا تھا اور بغیر کسی چپقلش کے گزر رہتی تھی۔ اب بھی وہی حال تھا، مگر ادھر عزیز میاں کیا مرے کہ دلہن بیگم نے یہ فرض کر لیا کہ گھر کی ساری ضرورتیں بس میرے میاں کے پیسے سے پوری ہو رہی ہیں۔ اور یہ خیال جوان کے دل میں جڑ پکڑتا گیا تو انہوں نے

سائیں نند کے ذلی چھید ڈالے میاں کا دل پھیر دینے میں کوئی جتن نہ اٹھا رکھا۔ باپ کی موت پر جایز ادبیے کو ملنی ہی تھی۔ اور ملی بھی، اب ماں بہن کا کیا رہ گیا تھا۔ بس دُورِ وقت کی روٹی اور نن بھر کپڑے کی حقہ اڑھیں۔ وہ برے بھلے مل جاتا تھا، نہ بھی ملتا تو کیا کر لیتیں۔ اختر سے اگر کوئی چیز غلطی سے گر پڑ جاتی تو منہ زور جوانی کو طعنے پڑتے۔

”دوئی بی دیکھ کر نہیں چلتیں۔ یہ مکر میں مارتی کیوں چلتی ہو؟“
دودھ کا پیالہ گرا دیا۔ اب رات کو مناروے گا تو کیا پلاؤں گی۔ تمہارا خون۔“

اس پر بس ہوتا تو سہارا جاسکتا تھا، مگر کنواری نند کو ایسے لہنے دیتے بھی نہ چوکتیں۔

”میری توبہ! اتنی زور سے ٹھوکر ماری کہ دلہن کی مٹی اکھاڑ دی۔ یوں جوانی زور پر آئی ہوئی ہے تو جا کر میاں سے کشتیاں کیوں نہیں لڑتیں۔“

عارفہ بیگم سہم کر بولیں۔ دلہن بیگم کنواری بٹیل کے سامنے خدا کے لئے ایسی گمراہ کن باتیں مت کیا کرو۔ وہ کیا سوچے گی۔“

”اے لو۔! سنو! گمراہ کن باتیں! جیسے تمہاری بیٹیاں بڑی بھولی ہیں۔! سبھی سہیلیوں سے گھنٹوں سر جوڑے کیا باتیں ہوتی ہیں۔! کوئی جانتا ہی نہیں جیسے۔!“

”تمہارے آگے بھی اولاد ہے دلہن بیگم، یوں جھوٹے الزام نہ تراشو۔! کون اس کی ڈھیر ساری سہیلیاں جڑی ہوئی ہیں کہ وہ باتیں

”سٹھارے گئی۔؟“
 دلہن بیگم کو قرار نہ آتا۔ نہ بچے کے منہ میں چھاتی گھسیڑتے ہوئے
 بولیں۔

”اب کیا سنائیں کیا کیا دیکھتے ہیں۔ میرے بچوں کو یوں بھینچ بھینچ
 کر پیار کرتی ہے کہ بس منہ میں چھاتی دنیا باقی رہ جاتا ہے۔ بے چارے
 کرے بھی کیا۔؟ بچوں کے لئے دل چاہتا ہوگا، مگر ماں نے تو کو لے
 سے لگا کر بٹھا رکھا ہے۔ اس کے ارمان پھیلے بھی کیسے۔؟“
 اختر کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ ”بھلا کون کچھ بھی ہوگی چولہے
 سبھیوں سے پیار نہ کرتی ہوگی۔؟ بھلا کیا میں اس لئے پیار کرتی ہوں
 کہ میرا جی ماں بننے کو ترستا ہے۔؟“ دلہن بھابی انہی گہری اور گھنی
 ہیں، اسے آج نہ چلا۔ اماں تو ادھر سن ہی رہ گئیں۔

”دلہن بیگم، خدا کے لئے یوں اپنا آپ بھول کر بات مت کرو۔
 بھلا کہیں کنواری نندوں کو یوں طعنے دیئے جاتے ہیں۔؟“
 ”اے لو، طعنے دیئے ہی کس کم بخت نے ہیں۔؟ جو حقیقت
 سختی وہ بیان کر دی۔ ایسی ہی کڑی حقیقت طعنے بن بن دل چھبیرتی
 ہے۔ تو بیٹا کے ہاتھ پیلے کیوں نہیں کر دیتیں۔؟“ دلہن بیگم نے جلتے
 بوجھتے صاف طعنے مارا۔

”پیدا کر لے والے نے غم دیا ہے بی بی، خوشی بھی وہی دیگا۔!“
 عارفہ بیگم ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئیں۔

اکو ماں اب تک عمر کے ایسے دور میں تھی کہ جوانی کا احساس تو
 تھا، مگر اپنے مفرد کی تباہی کو اس سنجیدگی سے نہ سوچا تھا۔ اس کے

بھائے تو یہ کوئی بات ہی نہ تھی کہ کنواری بیٹی ہوں۔ سب ہی لڑکیاں ایک خاص عمر تک کنواری رہتی ہیں اور پھر ایک ایک دن دلہن بن جاتی ہیں اور پھر سہاگن کہلاتی ہیں۔ دیر سویر سب ہی پر یہ سب کچھ گزرتی ہے، مگر بھادج کے آئے دن کے طعنوں نے تو اس کے خوابیہ جذبات میں ہل چل سی مچا دی۔ رہ رہ کر وہ اپنے سر پرے کو آئیے میں جا جا دیکھتی اور سوچتی۔ ”ہائے میری بہات کب چڑھے گی۔؟“ اور یہ بات تو اس پر کھل ہی چکی تھی کہ منگیتر کی موت نے اسے سارے میں منحوس قرار دیدیا ہے۔ پھر کون ایسا جی گردے والا تھا کہ دیکھتے بھالتے اپنے بھرے پرے گھر کی تباہی کے لئے منحوس کو پیادے جانا۔! سامنے ہی بوڑھی ماں تھیں جو ہر لمحہ موت کی طرف لپک رہی تھیں۔

”میں نہ ہوتی تو اماں کو یہ غم کیوں کھاتا۔؟“ غم کو ہکا کرنے کا واحد طریقہ دونوں ماں بیٹی کے پاس یہی تھا کہ آنسو بہائیں، اور اب تو وہ حد آ رہی تھی جہاں آنسو بھی ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ ایک دن ماں نے بیٹی سے سہمے سہمے کہا۔ ”بیٹیا ظہیر میاں جوان بہن کا بوجھ سر پر ہے۔ تمہیں فکر نہیں ہوتی۔؟ کوئی پیام ڈھونڈو نا، آخر کب تک کنواری کو بٹھائے رکھو گے۔؟“

ظہیر میاں نے نوالہ اٹھاتے اٹھاتے ماں کو دیکھا اور سنجیدگی سے بولے۔ ”ہاں اب ہر گھر پر جا کر دستک دوں گا اور کہوں گا کہ سبھی میری ایک جوان بہن ہے، تمہارے ہاں کوئی لڑکا ہو تو میری بہن کو کمر ڈالو نا۔!“

ماں نے حیرت اور بے بسی سے بیٹے کو دیکھا۔
 ”دوٹی بیٹا ایسی جلی کٹی باتیں کا ہے کو کر نے ہو۔ میں نے بھلا
 یوں کب کہا۔“

”اور آپ کا مطلب کیا ہے۔؟ بس مجھے اتنا ہی کام تو رہ گیا ہے
 کہ مشاطہ بن کر پیام ڈھونڈتا رہوں۔ انسان دیکھ کر بات کی جاتی
 ہے۔ بھلا کیا لڑکے بازاروں میں مولی گاجر کی طرح بچتے ہیں کہ گئے اور
 سیر دو سیر تلو لائے۔“

”میرے نے ایسا تو نہیں کہا میاں۔! ہاں ذرا خیال دلانے کی
 بات تھی۔ میری بیٹی ہے تو تمہاری بھی تو بہن ہے۔ تمہارے آس پاس
 دوست احباب تو ہوں گے ہی۔ خاندان کی بات ایسی ہے کہ سب ہی
 جانتے ہیں کہ سلو میاں کی جوان موت سے اکو ماں پر یہ فہر ٹوٹا۔ باہر
 والوں کو مشکل ہی سے تپہ جل سکتا ہے۔ اگر کسی سے کہہ سنکر بات لگوا
 سکو تو اچھا ہی ہے۔ تمہارے چچا تایا کی اولاد ہیں، یا تو شادی شدہ
 ہیں یا پھر اکو ماں سے جھوٹی، در نہ میں آپ ہی منہ سچوڑ کر لہل دیتی کہ
 میری بیٹی کو اٹھا لو۔“

”بھلا میرے دوستوں میں کون اس لائق ہے؟ ابامیاں کوئی
 ایسے دلچسپ آدمی تو تھے نہیں، ہماری برابری کا کون ہے۔؟“
 اماں نے دہلی زبان سے کہنا۔

”شکور میاں تو مجھے بھلے خاصے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ برابری
 وراہری کا سوال اٹھا سھینکو بیٹے۔ بس شادی ہو جائے، یہی غنیمت
 ہے۔ لاکھ تمہارے باپ کا نام بڑا سٹھا، مگر شکور میاں کے باپ بھی

کون گرے پڑے ہیں! بس غریبی سے مارے گئے، ورنہ خاندان تو ایسا ہے کہ کوئی کھوٹ خرابی نہیں۔ اور میرے خیال سے شکور میاں کی تنخواہ چار سو سے کیا کم ہوگی۔“

”اماں!۔“ ظہیر میاں ہاتھ روک کر بولے، ”مہارڈ کتنا بھی ادھیچا رہے، آسمان سے نیچا ہی رہتا ہے شکور میاں لاکھ امیر کہیں ہو جائیں۔ ہماری ساکھ کو کیا پہنچیں گے۔ میں کب نہیں کہتا کہ کھانے کمانے نہیں ہیں۔ مگر ان کی خود ہی ہمت نہ پڑیگی کہ اس گھر میں پیام لے جائیں جہاں سے ان کی روزی بٹی تھی۔“

”روزی بٹی تھی تب بٹی تھی، اب تو اللہ نے ناک ادھیچا کر دی ہے۔ کہنے والے یہی کہیں گے ناک عزیز میاں کی بی بی نے اپنی بیٹی فقیروں میں دے دی، سو کہتے پھر رہی۔ ہماری بیٹی تو خیر سے اٹھ جائے گی۔“

کسی زمانہ میں جب عزیز میاں کا بول بالا تھا تب انہوں نے رحیم بیگ کے بیٹے شکور میاں کے لئے دیکھ کر جو ایک باپ ہی آپنی اولاد کے لئے کر سکتا ہے۔ محلے ٹولے کے بچے اسکول جانے تو شکور میاں سچس سچس رونے۔

”میں بھی اسکول جاؤں گا۔ میں بھی پڑھوں گا۔“

اسکول جانے کے لئے کتا بین لگتی ہیں، فیس لگتی ہے، اچھے کپڑے لگتے ہیں اور یہ سب ان کے پاس کہاں تھا۔؟ یوں ہی ایک دن عزیز میاں رحیم بیگ کے ہاں بیٹھک میں بیٹھے تھے کہ اندر سے دھندا دھن مارنے کوٹنے کی سی آواز آئے گی۔

”یہ آواز کیسی ہے؟“ وہ حیرت سے ادھر ادھر دیکھ کر بولے۔
 رحیم بیگ کہنے لگا۔ ”بی بی باجری کے بھٹے ٹھونک رہی ہیں۔“
 ”ہیں؟ اس موسم میں باجری کے بھٹے کہاں سے آئے؟ وہ
 حیرت سے بولے۔“

”اجی جناب لونڈے نے دھوم مچا رکھی ہے کہ اسکول میں ہی
 پڑھوں گا۔ اس کا باپ کوئی رئیس اعظم تو ہے نہیں۔ سالا پڑھے
 کیسے؟ روز وہی سبق دہراتا رہتا ہے اور کبھی ماں سے پتا ہے اور
 کبھی باپ سے۔“

عزیز میاں غصے سے بولے۔ ”خود جاہل رہے، اولاد کو بھی جاہل
 رکھو گے؟ داخل کر کیوں نہیں دیتے؟ ایسی کون جاگیر چلی جائے گی۔
 اس کی پڑھائی میں۔؟“

شکور میاں اسکول میں داخل کروادے گئے۔ مہینے کے مہینے
 چپکے سے قیس، کتابیں، کپڑے، قلم اور کاغذ، سب کچھ پہنچ جاتا۔ باپ
 کو کبھی پریشانی کا احساس ہونے ہی نہ پایا۔ وہ تو اچھا تھا کہ آخرتی
 کی نسبت بچپن ہی سے خالہ زاد بھائی سے ملے تھے ورنہ لوگوں نے پہلے
 تو وہ گھاکر ہی افواہ اڑائی چاہی کہ۔

”میاں جی بٹیا کے لئے برڈھونڈ رہے ہیں۔!“

ایک درجے سے دوسرا درجہ، دوسرے سے تیسرا، تیسرے
 سے چوتھا اور پھر وہ دن آیا کہ شکور میاں نے ایم۔ اے پاس کر لیا۔
 اور اب تو وہ سوٹ بوٹ میں دکھائی دیتے تھے اور مہینے کے ختم پر ساڑ
 چار سو کے کر کے نوٹ جیبوں میں ٹھونے لگے آتے شہر میں گورنمنٹ

سروس میں تھے۔ ماں باپ کی خوشیوں کا کیا پوچھنا تھا۔ ؟
 شکور میاں تھے تو باپ کی اولاد، مگر اپنے باپ کی ذرا تو خوش ہوئے
 تھی۔ باپ جھکی ہوئی ڈال تھے، جس سے ملیں گے جھک کے بیٹے سدا
 اکڑے اکڑے رہتے۔ عارفہ بیگم کو خالہ بی خالہ بی بولتے تھے۔ اب
 بچپن سے ہی آنا جانا ہوتو کون پردہ کرتا ہے۔ نہ خالہ بی سے پردہ
 تھا نہ اکو ماں سے۔ اب تو وہ شہر میں نوکر ہو گئے تھے۔ حکومت کی طرف
 سے بنگلہ بھی ملا ہوا تھا۔ کبھی ماں باپ سے ملنے گھر آتے تو خالہ بی
 سے ملنے چلے آتے تھے۔ کوٹ تیلون اڑائے ہوئے۔ اوپچے، پورے
 وجیہ، تشکیل۔ اپنے میں آپ مرے جاتے مگر نگاہ نیچے کی اوپر نہ
 ہوتی۔ کبھی اختر سامنے سے گزرتی تو یوں چھپچھلتی نظروں سے دیکھ
 لیتے جیسے بڑا بیگا رٹال رہے ہوں۔ نہ چہرے پہ مسکراہٹ، نہ کوئی
 ہنسی کی جھلک۔ وہ سلام کرتی تو نظریں چرا کر جواب دیتے۔

”آداب عرض۔!“ معاملہ ختم۔

سہلا عزیز میاں اور عارفہ بیگم کو پری بھی کیا تھی کہ ان کے
 اس سلوک کا برا نہ ملے۔ ماں بھی اگر بیٹی دینے دلائے کا سوال ہوتا
 تو ایک۔ ات بھی تھی، مگر وہ تو بیا ہی جیسی تھیں۔ مگر اب تو عارفہ بیگم
 کو شکور میاں کے رنگ ڈھنگ کھل کھل جاتے۔ ان کے تو سارے
 گھرانے کو تپہ تھا کہ بیٹیاں بچپن کی نسبت ختم ہو گئی ہے۔ منحوس تھیں
 یا مبارک تھیں جیسی بھی تھیں، تھیں تو ان کے محسن کی بیٹی۔ کیا جاتا
 اگر دلہن بنائے جاتے۔ ؟ مگر وہ تو ایسے بادشاہ بن بیٹھے تھے۔
 اس دن بھی، کہ بڑے دنوں کی تعطیل میں گھر آئے ہوئے تھے۔

خالہ بی بی نے چلے آئے۔ بیٹی نے خالہ بی بی سے باتیں کر رہے تھے کہ انتہی انداز سے پانی لئے آئی۔ دھان پانی سا جسم۔ گوری گوری رنگت۔ آنکھیں کھلیں، چمکیلی بھلیاں سی۔ شاید ہنسا کر اٹھی تھی کہ بال شالوں سے گر کر ہمارا پیٹھ پر پھیلے ہوئے تھے۔ ایسے ہیں آکر ہلکی سی مسکراہٹ سے۔ "ہاں، کیا تو کون جی والا تھا کہ مر نہ ملنا۔ مگر وہ شکور میاں کہ ایک اس کو بچہ کر دیکھا اور دوسرے ہی لمحے گجبر آریوں نگاہیں ہٹا لیں جیسے اگر تھیں مری دیر اور دیکھتے رہتے تو نگاہیں جل ہی تو جاتیں۔

ایسے ڈھنگ ہوں تو کوئی کیا آس باندھ سکتا ہے۔؟
 بیٹے اگر کسی لڑکی پر رنجیدہ جائیں اور اڑ کر بیٹھ جائیں کہ "میں نہیں کروں گا تو بس اسی سے" تو ماں باپ لامحالہ ہار جاتے ہیں۔ مگر ماں باپ کسی بیٹی کو پسند کر لیں اور بیٹے کی جان کو آبیں تو باپ بائیں ہاتھ بنتی۔ زندگی تو بیٹے بہو کو گزارن پڑتی ہے۔ اگر بنام صنی گئے ہیں دھواں لاکر باندھ بھی دیا تو وہ بھائی گئے کا ہے۔ کون جالنے رحیم بیگ اور ان کی بی بی نے دل ہی دل انتہی کو بہو بنانے کے بارے میں سوچا بھی ہو مگر شکور میاں کے تئیں رہنا ہے تو بس نہ موش نہ موش ہی رہیں گے۔
 انتہی پر بھی مار نہ ہوگا خاموش نہ ہوئی۔ ماما کہ شہر کی کوئی اور بہو بانک دل پر چڑھ بیٹھی ہوگی۔ گھر پر بھی شادی ہو جائے گی اور چار بال بچے ہو جائیں گے تو خود ہی دل میں حائیں گے۔ گھر بھر جائے گا تو پھر منہ نہیں پھیرا جائے گا۔

پیر پیر سے پوچھا بھی، خود طییر میاں کے دوہنوں نے بھی توہ لگائی، مگر کچھ تپہ ہی نہ چل سکا۔ وہ تو ہونٹ سینے بیٹھے تھے۔ نہ بہ نہ

چلا کہ مرضی ہے یا نہیں، نہ یہ پتہ کہ پھر آخر کس سے کر لے گا ارادہ رکھتے ہیں۔ بس منہ سے کچھ بھڑکتے ہی نہیں! عجب کم بخت لوگ ہیں۔
اختری بی کے نصیبوں کا یہ ستارہ بھی ایک جھلک دکھلا کے چمکا اور پھر ڈوب گیا۔

(۵۱)

بھاوج تو چاہتی تھیں کہ جیسے بنے نیسے نہ اس گھر سے لے۔ ان کی چلتی تو کس بھک منگے کو اٹھا کر دے ڈالتیں مگر قسمت سے کوئی بھک منگا کسی تو نہ ملتا۔ بھائی جیسے بھی تھے، جو چیز لاتے، دونوں کے لئے چاہے وہ کھانے پینے کی ہو یا اور جتنے پہننے کی۔ انہیں یہ حسد داری بھلا کا ہے کو بھاتی؟

”دوئی بہنیں اپنی عمریں یوں بھائیوں کے گھر نہیں بنایا کرتیں۔ اتنی عمر میں تو ہم لے دو بچے پیدا کر لے تھے، اور حمل ساقط ہوا وہ الگ محلے ٹولے میں شادیوں کا موسم آتا تو آئے دن دعوتیں آتیں۔ نہ جائیں تو رشتے ناٹے کیسے باقی رہیں۔؟ ورنہ مفرو رگنائے جائیں۔ جانا ہی پڑتا۔ اختری پڑھی لکھی، گمنوں بھری، اور سپر عزیز میاں زمیندار کی بیٹی۔ اوپر اوپر جمیلی جائیں۔ گھر والیاں ان کے ذمہ میں سارا کام لگا دیتیں۔ دلہن کا سنگھار سبھی وہی کریں۔ دان دہیز بھی لوگوں کو وہی بتائیں۔ پیشیاں کام سے منہ کیسے پھریں۔؟ نہ ہی منی دہیں۔ کوئی یارو کی، کوئی تیرہ کی، کوئی چودہ کی، کوئی پندرہ کی۔ کسی کی بہت ہی عمر ہو گی تو سولہ کی — حد ہو گئی ستارہ — یہ ہونٹوں پر مسی کی تہہ

جہاں تو کوئی طعنہ دل چھید جاتا۔
 "دوئی مہنیں انہی عمر میں یوں بھائیوں کے گھر نہیں بنایا کرتیں۔"
 سسرال کا چڑھا دا چڑھا تیں، کالی پوت کا لچھا پہنائیں تو سنسنا
 نیراتا۔

"یوں بھینچ بھینچ کر پیار کرتی ہے کہ بس منہ میں چھاتی دنیا باقی رہ
 جاتا ہے۔ کرے بھی کیا بے چاری۔؟"
 زمین کے اندر جو بیج سویا ہوا تھا، سجاد نے پانی ڈال ڈال
 کر اگا چھوڑا۔ باہر کس قدر تیز دھوپ تھی۔ کیسی کٹھن اور تلخ زندگی!
 یہ پودے اگا ہی کیوں کرتے ہیں کہ فضول بیج بھری ہواؤں اور چلتے
 سورج کا سہن کرنا پڑے۔

خدا دعائیں نہ سنے، ولی آرزوئیں پوری نہ کرے تو انسان کا
 یقین ڈگر کا جاتا ہے۔ یہیں ایمان کی آزمائش ہوتی ہے۔ کفر کا فاصلہ
 یہاں سے کم رہ جاتا ہے۔

سکاوں کی سرحد سے لگ کر ایک نئی مہنت تھی۔ اس سے لگ کر
 کالی مسجد تھی۔ اور کالی مسجد سے لگ کر بڑے پیر کا سفید مزار۔ کہنے
 والے کہتے تھے یہاں مانگی گئی ہر مراد پوری ہو جاتی تھی اور خصوصیت
 سے کنواری بیٹیوں کی ماؤں نے جب بھی پریشان ہو کر بروں کی دعا
 مانگی۔ دیو سوبر، ہرے بھلے برتر ہو گئے۔ اتنے اونچے سارے مزار
 کی ایک مجاور رکھوالی کرتا تھا۔ نیا نذرین بھی وہی قبول کرتا تھا۔
 اسکا دن مار فہریم نے بیٹی کے ہاتھ میں چوڑیاں لاکر پہنائیں
 خواستہ کامی دو۔ اگلا۔ دل خون ہو کر جیسے بہہ اٹھا۔

”اماں یہ کیا کر رہی ہیں آپ۔؟“

اماں نے بیٹی ہی سے راز چھپانا چاہا۔ ”ایسے ہی بیاری والے کے پاس اچھی چوڑیاں نظر آئیں تو تیرے لئے لے آئی۔“ مگر وہ مزار کی ہری باریک سی چوڑی سب سے الگ نمایاں نظر آ رہی تھی اور آخرت کا منہ دیکھ کر جیہ منہ سھوڑ کر بول اٹھی۔

”نہیں نہیں، مجھے تو تمہاری اماں منت مان کر مزار سے لائی

ہیں۔ میں بھلا ان ہانکوں کی بہن لگتی ہوں۔؟ میں تو تمہارے سہاگ کی مسرت ہوں۔ مجھے توڑ و منہیں، مجھے گھورو نہیں۔“
آخر نے بے بسی سے گھٹنوں میں سر چھپا لیا۔

”اماں خدا کو نہ سھولئے۔ دہی سب سے برا سہارا ہے۔ دہی لوں کی مرادیں پوری کرنے والا ہے۔“

گھٹنوں میں دھنسا ہوا سر رد کر کا پنتا رہا۔
کوئی دو چار دن بھی نہ گزرے ہوں گے، عارفہ بیگم چوڑی کی کرامت کی منتظر ہی تھیں کہ اس دن ان کو اکوماں کے ہاتھ سھونٹے نظر آ گئے۔

ان کا جی دھک سے رہ گیا۔

”چوڑیاں کیا ہوئیں بیٹیا۔؟“ انہوں نے آنسو پیتے ہوئے کہا۔

”حمام میں دھو کر لگی اور ساری کرچی کرچی ہو گئیں۔ دو ایک باقی

رہ گئیں تو میں نے آپ ہی سھوڑ ڈالیں۔“ وہ صاف جھوٹ بول گئی۔

”ہائے بیٹی ان میں تیرے سہاگ کی چوڑی بھی تھی۔“ انہوں

نے چلا کر کہنا چاہا مگر آواز وہیں کہیں دل ہی میں گھٹ کر رہ گئی۔

"منت ماننے سے سہاگ نہیں ملا کرتا ماں۔ سب قسمت کی بات ہے۔" اس نے رو کر کہنا چاہا مگر آنسوؤں نے گلا پکڑ لیا۔
 "سب قسمت کی بات ہے، سب قسمت کی بات ہے!"

(۶۱)

عید پر پندرہ دنوں کی رخصت لے کے شکور میاں گھر آئے ہوئے تھے۔ عید سے پہلے خالہ بی سے ملنے آئے۔ خالہ بی کے دل میں چاند سا چمکا۔ "یہ بار بار میرے گھر کے چیرے کیوں کرتا ہے؟" اختر باہرائی نے شکور میاں نے سہم کر، اور سپر چوک کر یوں جلدی سے بنگا پس ہٹا لیا کہ اگر تھوڑی دیر اور دیکھتے رہتے تو وہ تپا پس دپھا جل کر رہ جاتیں۔

نفسرت کا وہی پرانا انداز! خالہ بی کے دل کا چاند وہیں ڈوب گیا۔

"جیا، مردت سبھی کوئی چیز ہے۔ خلوص، محبت، انسانیت تو دنیا سے اٹھ ہی گئی ہے۔ بھلا یہ شکور میاں اختر ایسی بیٹی کو کر لیں تو کیا برائی ہے؟ اختر ایسی دلہن سے تو گھر بھر میں جھما جھما اچالے بھج رہا ہیں۔ مگر کرے کون؟ انہوں نے بڑے دکھ کے ساتھ سوچا۔ ایک دن صبح اکو ماں ناشتہ کرتے کرتے بولی۔ "اماں میں نے رات بھر عجیب سا خواب دیکھا۔

"کیا؟" اماں نے لا پر والی سے پوچھا۔

"میں اماں مجھے ایسا لگا کہ آپ ادھیں، وہ کالی مسجد کے

ساتھ والا اونچا سا مزار ہے نا، وہاں کھڑی ہیں۔ بس دیکھتے ہی دیکھتے آپ نے دھکا دیکر مجھے ندی میں وکیل دیا۔ ”اس نے معنی خیز نگاہوں سے ماں کو دیکھا۔

اماں چونکیں اور چلا کر پوچھا۔ ”میں نے؟“
 اختر نے سکون سے جواب دیا۔ ”ہاں اماں آپ نے۔“
 عارفہ بیگم ہنسنے لگیں۔ ”واہ ری لڑکی! خواب بھی کیا دیکھا نا۔ سیدھی کر ڈٹ سویا کر۔“

دوسرے دن ناشتے پر اختر ماں سے بولی۔
 ”اماں رات میں نے پھر وہی خواب دیکھا، جیسے میں اور آپ مزار کھاؤ نچے چھبے پر کھڑی ہیں اور اکدم آپ نے دھکا دیکر لوٹ دیا۔“
 وہ رکی اور ماں کو دیکھتی ہوئی بولی۔ ”اور اماں میں چلا رہی ہوں میں مرنا نہیں چاہتی۔ اماں مجھے دھکا نہ دیجئے، مگر آپ نے ایک نہ سنی اور بولیں۔“

”تیرا مرنا ہی ٹھیک ہے، اور مجھے لوٹ دیا۔ جانے کیسا خواب ہے۔!“ اس نے ماں کے چہرے پر نگاہیں گاڑ دیں۔
 ”روز روز وہی خواب دیکھتی ہے۔ دماغ کی کمزوری ہے ساری۔“ انہوں نے کھوئے کھوئے انداز میں جواب دیا۔

اب عارفہ بیگم سدائے ادھیر طہن میں دکھائی دہنیں۔ اختر دیکھتی کبھی اماں اپنی مٹھیاں بند کر رہی ہیں، کبھی کھولی رہی ہیں۔ کبھی اپنے آپ میں سنہستی ہیں، کبھی آنکھیں پونچھتے لگتی ہیں۔ کبھی خود سے باتیں کرنے لگتی ہیں۔

”نہیں نہیں یہ کیسے ممکن ہے۔“ پھر خود ہی جواب دیتیں۔

”اس کے سوا چارہ بھی کیا ہے۔“

ان ہی دنوں گاؤں میں جو بڑے زمیندار خلیل میاں تھے، ان کی بیوی کا یکا کی انتقال ہو گیا۔ مرنے والی اپنے سچے ایک کنبہ چھوڑ مریں۔ جوان بیٹیاں، جوان بیٹے، پوتے، پوتیاں، بہنیں۔ خلیل خان کا اتنا بڑا کاروبار، اتنی بڑی زمینداری تھی۔ گھر بھی خوب بڑا سا را۔ کھانے والے اتنے جی، بغیر گھر والی کے کیا پتہ بھی چل سکتا ہے۔ طہیر میاں ان کے ہاں لوکری لوکرنے ہی تھے، خلیل خاں کو رنڈا دیکھ انہی بہن کا خیال آ گیا۔

”اگر آپ کہیں تو یہ رشتہ ہو سکتا ہے۔ ہاں بس یہ بات ہے کہ

وہ ذرا بوڑھے ہیں۔“ وہ ماں سے بولے۔

”ذرا بوڑھے ہیں۔“ عارف میگم چلائیں۔ ”تمہارے باپ

ان کی جوانی میں گھٹنے برابر کے تھے۔ اچھا جوڑا ڈھونڈا رہے میاں تو نے انہی بہن کا۔ سہاگ اور رنڈا پاسا تھا ہی ساتھ کیوں نہیں چڑھا دیتا۔ ایسی جگہ بیاہنے سے اچھا جوڑا ڈھونڈا رہے میاں تو نے انہی بہن کا۔ سہاگ اور رنڈا پاسا تھا ہی ساتھ کیوں نہیں چڑھا دیتا۔ ایسی جگہ بیاہنے سے اچھا تو یہ ہے کہ اپنے ہاتھوں کنوئیں میں ڈال دو اس کو۔“

اک دم ان کے ہونٹ کانپ اٹھے، دل دھڑک اٹھا۔

”اور اماں میں نے دیکھا کہ آپ اور میں اس چھپے پر کھڑی ہیں

اور اک دم آپ نے مجھے لوٹ دیا۔“

ان کے ذماغ پر دھیرے دھیرے اختر کا خواب چھانے لگا جو وہ مسلسل تین دنوں تک دیکھتی رہی تھی۔ "اس سے اچھا تو یہ ہے کہ اپنے ہاتھوں کنوپی میں ڈال دو اس کو۔"

"اور اماں میں نے دیکھا کہ آپ نے مجھے دھکا دے کر..... ان کا دل دھڑ دھڑ کر اٹھا۔ دھک..... دھک۔ تیز تیز دھڑکن۔ دھڑ..... دھڑ..... دھڑ۔ پھر دھبی دھبی رفتار سے دھڑکتے دھڑکتے ان کا دل جیسے مطمئن ہو گیا۔"

جمعات کے دن صبح ہی صبح، کہ ابھی تارے جھلکے ہوئے ہی تھے۔ غارِ بیگم نے اختر کو جگا دیا۔

"بیٹی۔ ادبیا۔ اکو ماں۔"

"اوں۔ اوں۔ جی۔" وہ کسماکر سہجہ سو گئی۔

"بیٹی اٹھو تو سہی۔ ذرا کالی مسجد تک چلیں گے۔"

"جی۔ کیا؟" وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

"پیر صاحب کے مزار تک چلیں گے۔" وہ سکون سے بولیں۔

"کیوں؟" اس نے چھوٹا سا سوال کیا۔

"نہیں بیٹیا۔ رجب علی کی بی بی مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ

جمعات کو منہ اندھیرے مانی گئی منت بائکل پوری ہو جاتی ہے چل آج یوں ہی قسمت آزماتے ہیں۔"

"آپ کو ایسی کون سی منت ماننی ہے؟" وہ حیرت سے بولی۔

"دل کا سکون بھی بڑی چیز ہے بیٹی۔ بس میں آج یہی منت

ماننے والی ہوں کہ خدا تو میرے دل کو اطمینان دے، سکون دے۔"

”اچھا چلے۔“ وہ جوتیاں ٹسولتی ہوئی بولی، ذرا منہ ہاتھ دھو آؤں۔“

تزل۔ تزل۔ تزل۔ نیچے ندی کا پانی بہہ رہا تھا۔ ہر اہرا سا نیلا نیلا سا، صاف شفاف پانی مزار کے سب سے اونچے چھپے پر عارفہ بیگم اور اختر کھڑی تھیں۔

”بہت سوں سے سا ہے اندھیرے وقت، صبح ہی صبح مانی گئی منت پوری ہو جاتی ہے۔ اور پھر آج جمعرات تھی ہے۔“ انہوں نے ٹھنڈے لہجہ میں کہا۔

بیچے پانی بہہ رہا تھا، اوپر وہ دونوں کھڑی تھیں۔

اختر نے ماں کو دیکھا۔ ان کا چہرہ بے جان بے جان سا اور ستا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ”اماں آپ اس قدر پہلی کیوں نظر آ رہی ہیں۔؟“ اس ماں کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں! میرا چہرہ! نہیں تو۔!“ وہ چونک کر زور سے ہنسنے لگیں۔ ”ماروں کی روشنی میں پیلا نظر آ رہا ہو گا۔“ اور بیٹا بچ تو یہ ہے....

وہ سنجیدہ ہو گئیں، ”کہا دھڑ جب سے تمہارے باپ کا انتقال ہوا ہے دن رات روتے روتے اور فکر میں اٹھاتے اٹھاتے میرا خون سوکھ گیا ہے اور خون ہی سوکھ جائے تو انسان پیلا نظر آئے تو کیا ہو۔؟“ وہ ذرا مسکرائیں۔ ان کی مسکراہٹ میں عجیب غیر یقینی انداز تھا۔

اختر نے بڑے سکون سے جواب دیا۔ ”فکروں پر جمی جلاسنے کی کیا بات ہے اماں۔؟ سوچنے سے فکر میں کچھ کم تھوڑی ہی ہو جاتی ہیں۔ آپ خواہ مخواہ خود کو کر لکھاتی رہتی ہیں۔“

”ہاں میں خود کو خواہ مخواہ کڑھاتی رہتی ہوں۔“ وہ نیچے بیٹھ ہوئے پانی کو دیکھ کر بولیں۔

تھوڑی دیر خاموشی رہی، پھر وہ بولیں۔ ”مگر میں آج خلوص دل سے دعا مانگنے آئی ہوں، اور مجھے یقین ہے کہ آج میرے دل کو دایمہ سکون مل جائے گا۔“

انہوں نے بے جان ہاتھوں سے، کانپتے ہاتھوں سے پاس کھڑی اختر کو اپنی طرف کھینچا۔ ایک خوفناک ہلکی سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پہ چھا گئی اور انہوں نے اختر کو پوری طاقت سے پیچھے کی طرف لوٹ دیا۔ اختر کا پھول پان سا جسم پانی میں تلا بازی کھا گیا۔ کچھ دور پہ اس کا سرا سبھرا، سیاہ بالوں میں چاندیسا چہرہ چمکا اور دوب گیا۔ تھوڑی دور پہ پھر اس کا سرا سبھرا، پھر دوبا، پھر سبھرا، پھر دوبار اور پھر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ عارفہ بیگم کی آنکھیں چمٹی ہوئی تھیں۔ اور ہونٹ پھیلے ہوئے۔ یوں کھڑے کھڑے ایک صدی ان کے سر پر سے گزر گئی۔ مردوں کی طرح وہ اندھیری سیڑھیوں پر سے اترنے لگیں کہ اکدم کسی سے ٹکرا گئیں۔

آنے والا کوئی مرد تھا۔

”ارے آپ؟ خالہ بی! یہاں؟“ وہ میچاں کیا۔ اکدم وہ

خالہ بی کو آجالے میں لے آیا اور بڑی بے بس سے گھبرا کر بولنے لگا۔

”خالہ بی، جانے کس نے مجھ سے بتایا تھا کہ جہرات کی صبح مانی

گئی منبیں قبول ہو جاتی ہیں۔ ہر بار جب گناہوں آتا ہوں تب ماستھار گڑ رگڑا کر دعائیں مانگتا ہوں، مزار پر آکر نصیحتیں مانتا ہوں، مگر خالہ بی۔۔۔ مگر

آپ سن رہی ہیں نا۔؟ مگر کبھی میری دعا قبول نہیں ہوئی۔ میں زمین پر رہنے والا ذرہ آسمان پر چپکنے والے ستارے کی آرزو کرتا ہوں خالہ بی۔ مگر میں کس منہ سے کہوں کہ میں اختر سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔؟ میں تو آپ کے گھر کا پروردہ ہوں۔ بھلا آپ لوگ کیا سوچیں گے۔ ڈر کے مارے کبھی اماں اماں کے سامنے اشارتاً بھی نہ کہا کہ وہ اکدم میرا دل نہ توڑ دیں۔ میں دل ہی دل میں اپنی محبت کا درد چھپائے رہا۔ اپنی حیثیت خوب جانتا ہوں خالہ بی، اس لئے کبھی اختر کو آنکھ بھر کر دیکھا بھی نہیں کہ جس چیز کو میں حاصل نہیں کر سکتا اس کی تمنا کیوں کروں؟ کیوں اس ناممکن سی بات کی آرزو کروں۔؟ مگر اب مجھ سے صبر نہیں ہوتا خالہ بی۔ آج آپ کو اکیلا پاکر میری ہمت بندھ گئی۔ میں غریب غرور ہوں خالہ بی، آپ لوگوں کی برابری کا دعویٰ نہیں، مگر آپ یقین مانئے میں اختر کو بہت خوش رکھوں گا۔ بہت اچھی طرح رکھوں گا۔ آج جمعرات ہے، شاید میری دعا قبول ہو جائے۔!“ اس نے کندھا کپڑ کر خالہ بی کو ہلا دیا۔

”میں آپ سے بھیک مانگ رہا ہوں خالہ بی، مجھے خالی ہاتھ نہ لوٹائیے۔ یقین کیجئے میں اختر کے بغیر مر جاؤں گا۔ ہاں کہہ دیجئے خالہ بی۔ میری خالہ بی۔!“

خالہ بی کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ وسیع ہو گئی اور ان کے خوفناک تہقے سنان مزار کی دیواروں سے ٹکرا ٹکڑا کر بری طرح شور مچانے لگے۔

ساتواں شہزادہ

خالد بی یوں تو مرغی کے چوزوں کو دانہ چکارہ ہی نہیں، مگر ان کا
سارا دھیان دھوبی کی طرف تھا۔

صحن میں ڈھیر سارے کپڑے پھیلے ہوئے تھے، اور سجلی بیوی بھی
کپڑے لکھتی بیٹھی تھیں۔ سجلی بیوی کا کام بھی کیا کام تھا۔ وہ ہر لپکتی
سارا معاملہ جو پٹ۔ یوں کہ لے دھرنے کا شوق تو بڑا تھا، مگر کوئی
کام گت سے نہ کر پاتیں۔ پچھلے چکر میں دھوبی کو کپڑے دینے، بیٹھیں
تو اچکنوں اور نمبھوں کی جیبیں تک نہ دیکھیں۔ ہونا گیا، اندر بہاں
کی اچکن کی جیب میں دس دس کے تین نوٹ تھے، وہ دھوبی کے گھر چلے
گئے۔ دھوبی ننھا تو پہچان کا، برسوں سے کپڑے لاتا لے جاتا تھا، مگر
نہیں روپے دیکھ کر اس کی نیت بدل گئی۔ صاف، مگر گیا کہ میں نے
دیکھے ہی نہیں۔ دیکھتا تو دالیں نہ کر دیتا۔؟

خالد بی کا غصہ بہو پر تھا، اور بہو کا غصہ جلیجھ پر۔
"اے داد اتنا بھی نہیں ہونا کہ کپڑے اتارنے وقت اپنی جیبوں
کی تلاشی لے لیں۔"

"اور تم سے اتنا بھی نہیں ہونا کہ کپڑے دیتے وقت دراجیبوں

کا جھٹکا ہی لے ڈالیں۔ مرد مرد ہی ٹھیرا۔ آخر عورتوں کا اور کون کام ہوتا ہے بی۔؟ اٹھے غصہ دکھائی ہو۔

تب کی بات بہو بیگم کو یاد تھی۔ ہر کپڑے کو بڑی احتیاط سے جھٹکا رہی تھیں۔ خالہ بی الگ دیکھ رہی تھیں۔ اک دم بلقیس نے ایک آپن کی جیب سے ایک پوٹلی برآمد کر لی۔

جلدی جلدی گرد کھول کر دیکھا۔ درد و پیسے میں ملنے والی دو گلابی پلاسٹک کی زینیاں اور نہنے بچے کے منہ میں دہنے کا ایک دہرکا نیل "اماں دیکھتی ہیں یہ کیا ہے۔؟" انہوں نے منہ میں ڈال کر زور سے ساس کے کان کے پاس پینپی بجا دی۔ "کیا ہے۔؟" خالہ بی نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ کھلو لے۔!"

"تو کیا ہوا۔؟" خالہ بی جواہری کے دانے آنکھ میں چھینکتی ہوئی بولیں، "ڈیبر سارے توبچے ہیں گھر میں، کسی کے بھی ہو گئے۔ رکو دو دہاں میسر ہے۔"

"بات تو سمجھتی نہیں آپ۔ یہ چھوٹے سبیا کی جیب سے نکلے ہیں۔ ہاں۔" وہ چھوٹے سبیا پر زور دیکر بولیں۔

"اس میں سمجھنے کی کیا بات ہوئی۔؟ نکلے ہوں گے چھوٹے کی ہی

جیب سے۔ پھر۔؟"

بلقیس جھلا گئی۔ "تو کیا کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔؟"

"جا چھو کر ہی تیری تو عقل ہی پلٹ گئی ہے۔ ارے الے سارے

سبائی سمجھتے ہیں، کسی کے لئے بھی لایا ہو گا۔"

”سجائی بھتیجیوں کے لئے لاتے تو دے نہ دیتے، مگر نگاہ کر کیوں رکھتے۔“

اب کہ خالہ بی نے ذرا غور سے بہو کی صورت دیکھی۔ دلہن تمہارا مطلب میں اب بھی نہیں سمجھی۔“

”اب آپ جان بوجھ کر انجان بن رہی ہیں تو میں کیا کر دوں۔“ وہ اکتا کر پھر کپڑوں پر پل پڑیں۔

خالہ بی کا سارا قصہ اس رانی جیسا تھا جس کے ایک نہ دو پورے سات بیٹے تھے۔ اور یہ تو ہوتا ہی تھا کہ سب سے چھوٹا بیٹا بے حد خوب صورت اور بے حد ذہین ہوتا تھا۔ (بہادر ہونا تو خیر لازمی تھا)۔ ملک ملک کی خاک چھاننا اور پھر شہزادی بدر کمال (یا پھر شہزادی گلرخ) کو کھوج نکالنا۔ بڑی دھوم دھام سے راجہ دھانی کو لوٹنا تو ساتھ میں اپنے باپ کی چھٹی ہوئی سلطنت بھی دوبارہ حاصل کرنا آتا۔ بس چھوٹے میاں کا بھی عن دمن دہی حشر تھا۔ سب میں چھوٹے تھے۔

سب میں خوب صورت اور کہانی کے شہزادے کی طرح ماں باپ کے لالچے سبھی ادھر کے چھ بیٹوں کی تو شادی ہو گئی۔ مگر چھوٹے میاں ابھی کنوارے ہی تھے۔ عمر بھی بہت کہاں تھی۔ بس یہی کوئی چوبیس پچیس کے اندازے میں تھے۔

دفعہ دار گھرانوں میں ہوتا ہے کہ ماں باپ جہاں بات لگا دیں بیٹے بغیر کسی پس و پیش کے سر جھکا دیتے ہیں۔ اور یہ بات تو ظاہر ہے کہ باپ پیت اولاد کا برا کیوں چاہیں گے۔ ان کی بات نہ ماننے کو کوئی تو حوالہ ہو۔ خالہ بی کی ساری بہوئیں اپنے ہی خاندان کی تھیں۔

کوئی ماموں کی بیٹی کی سند، کوئی خالہ زاد مہین کی بیٹی، کوئی جھنجی تو کوئی
جھانجی۔ خالہ بی کا گھر بھرا پڑا تھا۔ چھوٹے میاں کی شادی کی ابھی
غزوہ تھی کیا تھی۔ ؛ مگر وہ جوہراں کی خواہش ہوتی کہ "بس بیٹے
کا سہرا دیکھ لوں۔" وہی خواہش یہاں بھی ابھری۔ بیٹی تو دیکھی سہالی
ہی تھی۔ بڑی بہو کی چھوٹی مہین، خالہ کی آنکھوں میں اب تب سے نہیں
اس وقت سے چڑھی ہوئی تھی جب بڑے بیٹے کے آرسی معصوم کے
دفن لال لال اٹلس کا جہم جھاتا جوڑا اپنے ایک چھوٹی سی لڑکی حندل
کی کٹوری لئے آئی اور آتے ہی اڑھینگے پن سے لہ لی۔

"بھیا، ہم آپ کے حندل لے کا لیں گے تو نیک دیں گے نا آپ؟"
انہی پیاری صورت، ایسی بھولی ادائیں کہ سارے لوگوں کی
نگاہیں پیچھے اس پہ جم گئیں۔ اور تو جانے کتنوں نے کیا کیا سوچا ہوگا۔
مگر ادھر فالہ بی نے تو اس تنہی ہی کر لیا کہ سیانی ہوتے ہی اسے بھی
اپنے گھر کا اجالہ بنا لول گئی۔ مگر بات اپنے دل میں ہی رکھی۔

بڑے گھروں کے کھاتے پیتے بچے جلد ہی جوان ہو جاتے ہیں اور
پھر لڑکیاں تو یونہی شرط باندھ کر بڑھتی ہیں۔ کوئی سال بھر بھی نہ
گزر رہوگا کہ بڑی دہن کے میکے سے بلاوا آیا۔ بھائی لینے کو آئے۔ اب
مہین بڑی حیرت زدہ کہ ہائے اللہ کوئی کار نہ کاج، تقریب نہ جلسہ، یہ
بیٹے بھائے بلاوا کا ہے کو آیا۔ بھائی سے پوچھا تو یہ بھی بس اتنا
ہی بولے۔

"مجھے تو معلوم نہیں۔ اماں نے کہا جا کر لے آؤ۔ بس میں چلا آیا۔"
بڑی دہن تو کچھ نہ سمجھیں۔ مگر خالہ بی ہنسنے لگیں۔

”اے دلہن تم بھی بس پوری وہ ہو۔ اتنی بات نہیں سمجھتیں رو کی ذات کا معاملہ ہے۔ اب کیا سمدھن پورے خاندان میں رقعے بانٹ بانٹ کر دوپٹے اڑھائیں گی بیٹا کو؟ چلی کیوں نہیں جاتیں۔“

بات وہی مکلی جو خالہ بی نے سمجھی تھی۔ ماں باپ تو فکر مند ہوئے ہوں گے کہ چھاتی پر بوجھ ڈپرا، مگر خالہ بی کے ایک دل کے ہزار دل ہو گئے کہ چلو اب بہو اپنی ہوئی۔

ادھر یکے بعد دیگرے سب بھائی دولہے بن گئے تھے، ادنیچے کے دو بھائیوں کے منڈوے بھی ساتھ پڑے۔ نکاح خوانی بھی ساتھ ہی ساتھ ہوئی اور اپنی دلہنوں کو گود میں اٹھا ساتھ ہی ساتھ پالکی میں بٹھایا۔ اب رہے کون۔؟ وہی چھوٹے میاں! اب چھوٹے میاں تو لاڈلار کے تھے ہی پہلے اور آخری کاج پر تولیوں ہی زیادہ دھوم دھڑکا ہوتا ہے۔ اور چونکہ چھوٹے میاں اپنے بھائیوں کے مقابلے میں زیادہ پڑھ لکھ بھی گئے تھے، اس لئے بھی ان کے وقت زیادہ ہنگامہ بٹھرا۔

خالہ بی کو کیا اپنے بیٹیوں سے ایسی امید ہو سکتی تھی کہ ان کے ہاں کرتے وہ ناں کریں۔؟ پوچھتیں گوجتیں بھی کیوں۔؟ رمضان کی عید کے بعد پیغام سمجھو ادیا۔ غیر خاندان کے ہوں۔ چال چلن میں کھوٹ چوٹ کا ڈبکا ہو تو جواب میں دیر ہوتی ہے۔ چھان بین کرتے کرتے ہی دن نکل جاتے ہیں۔ میاں تو اپنے ہی گھر کی سی بات تھی۔ بقر عید کے بعد جواب بھی نہ مل گیا اور چھوٹے میاں کو پتہ چلا تو کب چلا جب خالہ بی نے منگنی کے سچول پہننے انہیں سمدھ پر آ بیٹھنے کو کہا۔

”مگر کس تقریب میں۔؟“ انہوں نے سن کر کہا۔

”اے چل باتیں بناتا ہے۔ اب اتنا بھی پتہ نہ چلا ہو گا کہ یوں اترا کہ پوچھ رہا ہے۔“

چھیوں بھا بھیاں ہنستی کھڑی تھیں۔ سبھی بھالی بلبلیس ہنس کر بولیں۔ ”اس لئے کہ اب چھوٹے شہزادے کی باری ہے۔“

سب ہنسنے لگے مگر چھوٹے میاں پھر بھی نہ سمجھ سکے۔
”مگر کا ہے کی باری تھی۔“

”اجی جناب اب آپ کے دو لہا بننے کی باری ہے۔“
ادھر قہقہہ اڑے اور ادھر ان کا جی ڈوب گیا۔

”مگر — مگر مجھ سے کوئی پوچھنا تو۔“

”اے چل بڑا آیا۔ ہم سے بڑھ کر تیری عقل ہو گئی شاید۔“ اماں
بڑے پیار سے ہنس کر بولیں۔ ”سہلا پوچھتے بھی تو کیا جواب دیتا۔؟
کیا نا کر دیتا۔؟“

چھوٹے میاں نے منگنی کے سچول پہنے تو سہی، مگر نئے نئے دلہوں
پر ایسے موقعوں پر جو خوشی چھاتی ہے وہ ان کے چہرے پر دور دور تک
نہ ملتی تھی۔

بیٹی والوں کا منہ ان کے لبس کا نہیں ہوتا۔ بیٹے والے کچھ کہیں
تو جواب دیں، ورنہ منہ کھوڑ کر تو بولی نہیں سکتے۔

”بات تو ہو سکی گئی تھی، اب بیٹی اٹھا کیوں نہیں لیتے۔؟“

ادھر بیٹے والے ایسے ملے تھے کہ سر سر جینے لگے رتے جارہے ہیں۔

نہ ہوں نہ ہاں۔ ادھر ادھر سے تپہ بھی چلایا۔ مگر نہ کھلی۔ پھر بڑی مہن
کی زبانی معلوم ہوا کہ چھوٹے میاں اپنی ٹریلنگ میں الجھے ہوئے ہیں۔

ٹرنینگ ختم ہوئی تو ملازمت کر بی گے، پھر کہیں جا کر شادی وادی کے بارے میں سوچیں گے۔ صرف سوچیں گے، کر لے گا پھر بھی لے نہ سکا۔

باپ کا بچوں پر وہ رعب تھا کہ ان کے سامنے آتے ہی کانپنے لگتے۔ اور ادھر وہ گھر میں گھسے اور بچے ادھر ادھر کھسکے۔ خالو میاں چاہتے تو آج ہاتھ پکڑ منڈ دے تلے بٹھا دیتے۔ "بول بے قبول ہے لڑکی۔" اور میاں جمی کی اتنی محال نہ ہوتی کہ ناپسند ہونے پر بھی انکار کر سکتے۔ مگر خالو میاں نے جو دیکھا کہ چھوٹے میاں ٹرنینگ کے بوجھ سے یوہنی ہو گئے جا رہے ہیں۔ بس ڈھیل دے دی۔

"کام کا بار آٹھرا ہے بے چارے پر۔ ایسے میں گر سہتی ہیں الجھا دیا تو صحت بالکل ہی تباہ ہو کر رہ جائے گی۔ اور کیا ابھی سے بوڑھا تو ہونے نہیں جا رہا۔"

دیور دن، سبھا و جوں کی محفل حبشی تو رنگارنگی باتیں ہوتیں۔ سنجلی بہو سدا ساس کے دل پر چڑھی رہنا چاہتی تھیں۔ اور موقع ملنے پر کوئی نہ کوئی ایسی بات ساس سے جا لگاتیں کہ وہ انہیں اور زیادہ چاہنے لگتیں۔ مگر اس دن خالو بی نے بلبلیس دہن کی بات پر کان ہی نہ دیے۔ جب انہوں نے جا کر سنا یا۔ "اماں، سنا کچھ۔ چھوٹے بھائی تو کہتے ہیں میں تمام عمر شادی ہی نہیں کروں گا۔"

اماں نے چونک کر دیکھا۔

"دماغ تو ٹھیک ہے مہارا۔"

"اے لومیرے دماغ کو کیا ہونے چلا ہے؟ چھوٹے میاں آپ ہی

کہتے تھے، سو میں نے آپ سے کہہ دیا۔"

”مگر کوئی وجہ بھی ہوتی۔!“

”اب یہ تو ان کا اپنا دل جانے۔“

”بات میں کوئی ڈھنگ بھی ہو مگر۔“

”بلیکس بی ہنس کر بولیں۔“ اماں کہانی والے شہزادے کی طرح

وہ تو بس کوئی شہزادی ہی لائیں گے۔“

خالہ جی بدک کر بولیں۔ ”کیوں؟“ بانو، کیا کسی شہزادی سے کم ہے؟

”اب تو مہمی جانیں جو انکا رپرہ تلے بیٹھے ہیں۔“

بات یہیں ختم نہیں ہوئی، بس خالہ بی کے جی کو لگ گئی۔ چھوٹے

میاں گھر میں آتے تو خالہ بی ایسی کوری کوری نظروں سے ان کا جائزہ

لیتیں کہ اپنی جگہ وہ بھی ٹھٹھک ٹھٹھک جاتے۔

ایک دن رات کے کوئی گیارہ بجے چھوٹے میاں گھر لوٹے۔ سب

لوگ سوچکے تھے۔ ملازم باہر ہی سونا ستھا، اس نے بڑے دروازے کی

کنڈی کھول دی اور یہ گھر میں آ گئے۔ خالہ بی کو تو ماوس قدموں کی چپا

سن کر سونا دو بھس ہو گیا، سراٹھا کر بولیں۔

”کہاں گیا تھا چھوٹے میاں۔؟“

چھوٹے میاں پہلے تو ذرا گڑبڑائے پھر سنبھل کر بولے۔ ”رات کا

شود کیجئے چلا گیا تھا۔“

”اور مجھ سے پوچھا بھی نہیں۔؟“

”بھولی ہو گئی؟“ اماں بی۔ دوستوں نے گھبرا اور بس لے کر چلے ہی گئے۔“

خالہ بی نے بھی کوئی دھیان نہ دیا کہ جو ان جہاں جہاں ایسی چھوٹی

چھوٹی بانوں پر نگرانی ٹھیک نہیں ہوتی۔ مگر اس دن کے بعد تو یہ

ہونے لگا کہ چھوٹے میاں کو روز ہی دوست گھیر لے لے۔ کریم ان کا یا مہار
بن گیا کہ وہ دہلے پاؤں راتوں کو آتے اور یہ دھیرے سے دروازہ کھول
دیتا۔

رمضان کے تیس روزے ختم ہو چکے تھے۔ جمعہ کو عید پڑھنی تھی۔
جمعرات کی رات خالہ بی اپنی تمام بہوؤں کے ساتھ شیر خورے اور
سیویوں کے لئے میوے تیار کرتی بیٹھی تھیں۔ ایسے کام ساج میں تو
رات یوں بیت جاتی ہے۔ ادھر صبح ہی صبح نہ بچ بکڑوں کے لئے
غل غیاڑہ مچانا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر بڑے لوگوں کی بھی برابری
کرتی ہوتی ہے۔ نمازیوں کی گرڈ بڑ، بچوں کی گرڈ بڑ، پھر خود عورتوں
کے نہانے دھونے۔ سب مائیں اپنی بچیوں کے پیشی رنگین اور بچوں
کے ٹکلا بی نیلے کپڑے اور اچکیں نکال نکال کر اوپر ہی رکھ رہی تھیں۔
کہ صبح صبح پھر گرڈ بڑ نہ مچے۔

چھوٹے میاں کو معلوم نہ تھا کہ آج گھر میں رات جگا پڑا ہے۔
یہی ہی اپنے پیچھے دھیرے سے دروازہ بند کر لئے پوچھتے گھر داخل
ہوئے تو سٹ پٹا گئے۔ چراغوں کی دھما دھم روشنی میں دیکھتے کیا ہیں
کہ اماں تو بن کشن پہ کھوپرہ چھیلتی بیٹھی ہیں اور بھابیوں نے مائے
خوشی اور اودھم کے رات کو دن سمجھ رکھا ہے۔

نمالہ بی نے دیکھا ضرور، مگر ٹال گئیں۔ اگر لوہے پر اترا تیں تو
پھر لوہے ہی چلی جائیں اور پھر صبح عید کا دن تھا تو برس کے برس
یہ دن آتا ہے۔ اگر فضول میاں نہ سہلا کر بیٹھے رہے تو غصے میں
ساری خوشی بلبا میٹ ہو جائے گی۔ سمجھانے سمجھانے کے اور بھی تو

کئی دن ہوتے ہیں۔ ابس اتنا ہی بولی کر رہ گئیں۔ "اے میاں یہ کوئی آنے کا وقت بھی ہوا۔؟ دیکھ لو دوڑ معائنہ سے کم کیا بچ رہے ہوں گے۔؟ اور پھر اپنے کھانے والے سا بھی کوئی خیال ہے کہ نہیں۔؟ روزہ کہاں اذکار کیا تھا۔؟"

چھوٹے میاں کے دم میں دم آگیا۔ سانس لے کر بولے۔ "ایسے ہی ایک دوست نے روک لیا۔"

"اتنی رات گئے تک۔؟" خالہ بی حیرت سے بولیں۔

"اور کیا۔ اتنا کہتا رہا جانے دو، جانے دو، مانا ہی نہیں میں توتبا ہی چلا آتا تھا۔"

"اچھا دوست ہے موا۔" خالہ بی اتنا کہہ کر کھوپر دھکنے لگیں۔ کھرپے ہوئے بن سمیٹ کر انہوں نے سہال میں رکھ دیئے اور خود جا کر سادار سے ٹونٹی کھول وضو بنانے لگیں۔ خالہ بی ہرجمعات کی رات کو سوتے وقت یسین شریف پڑھتی تھیں کہ گھر میں رزق کی برکت ہوتی ہے۔ بچپن کی عادت بڑھاپے تک ساتھ دے گئی۔ وضو بنا کے اٹھیں تو دیکھا کہ ان کا اپنا قرآن شریف طاق سے غائب ہے۔ چڑکے بولیں۔

"تو بہ ہے۔۔۔ ان بچوں نے کسی چیز کا ٹھکانہ نہ رکھا۔ میرا کلام مجید کس نے اٹھایا۔؟"

منجلی دہن کے بچے سارے گھر میں اپنی شرارت کی وجہ سے بدنام تھے، یہ طعنہ تو صاف ان ہی پر جانا تھا۔ الجھ کر بولیں۔ "ابا بیاں لگے تھے، بھلا بچے کیوں اٹھاتے۔؟"

”اور ابامیاں کہوں لے گئے تھے۔“

”یہ وہ خود جانیں، کوئی کیا کہے۔“

بلقیس دلہن بولیں۔ ”انہوں نے اپنا والا کلام مجید ایک مانگنے والے کو دیدیا۔ بے چارے کی ماں مر گئی تھی تو وہ کچھ پڑھ کر بخشا چاہتا تھا۔ اور گھر میں کلام مجید نہ تھا، سوا ابامیاں نے کلام مجید دے ہی دیا؟“

”اچھا کیا، مگر اب میں کاپے میں تلاوت کروں۔“ گردن اونچی کر کے دیکھا تو لٹا فٹے تک ان کا ہاتھ نہ جاتا تھا۔ آواز دیکر بولیں۔

”ارے چھوٹے، خدایہ لیسین شریف تو اتنا بڑے۔“

چھوٹے میاں آواز سن کر آؤ گئے تھے۔ مگر یہ بات سن کر وہیں رہ گئے۔ کہنا کر بولے۔ ”میں باد صوم نہیں ہوں۔“

اے میاں تو سامنے ہی تو سماوار دھرا ہے، وضو کو ایسے کون گھنٹے لگتے ہیں۔“

منٹ بھر تو یوں ہی اوڑوں کی طرح کھڑے رہے، پھر بولے۔

”میں باہر سے ابھی منٹ بھر میں آتا ہوں۔“

اللہ جانے وہ منٹ کتنے گھنٹے کا تھا کہ خالہ بی کی ٹنگریاں دکھ دکھ گئیں۔ ادب کر اپنی بہوؤں سے بولیں۔

”دوٹی دیکھاری لڑکیو! میں میاں کھڑی کی کھڑی ہوں اور

وہ موالیا غائب ہو کہ پلٹا ہی نہیں۔“

بلقیس نے والوں والے کمرے میں جا کر کھڑکی سے مردانے

میں جھانک کر دیکھا تو چھوٹے میاں خرخر کرتے پڑے سو رہے تھے۔

آج خالہ بی کا مٹھا پہلی بار ٹھنکا۔ انہیں یاد آیا ابھی کچھ ہی

دن پہلے حضرت کے نام کی فاتحہ دلوائی تھی۔ خالہ بی لاکھ بلاتی رہیں مگر چھوٹے میاں یوں ہی مکر گناٹھے پڑے رہے۔ ذرا شش سے مس نہ ہوئے۔ لیترے میں لمبے لمبے پڑے ہی رہے۔ لاکھ لاکھواں نے خود خوشامد کی۔

”ارے موئے فاتحہ میں تو شامل ہو جا، برکت اترتی ہے۔“
کس کی فاتحہ؟ کہاں کی برکت؟ وہ تو پہلے بھی نہیں۔ بڑی دیر بعد اٹھے بھی تو پہلے غسل خانے کی خبر لی۔ نہادھو کر سفید براق کپڑے پہنے اور ماں سے آکر بولے۔

”کھلائیے کیا پکایا ہے۔؟“ خالہ بی نے غور کیا تو یاد آیا کہ صاحبزادہ رات کو پھر دیر سے لوٹے تھے۔

سجا بیوں میں بات جاسینچی اور طرح طرح کی قیاس آرائیاں ہونے لگیں۔ خالہ بی بھی جاسینچیں۔

”اماں تو مانتی ہی نہیں، میں کہتی ہوں حضرت بری باتوں میں پڑ گئے۔“

خالہ بی کو بھرپک کر غصہ آگیا۔ ”اے میں کہوں جو ان بچہ ہے گھر میں جو رو نہیں بچہ نہیں، ایسے میں اگر کا نا دانا سننے کہیں چلا گیا تو کیا برائی ہوگی۔؟“

”گانے دانے کا نام نہ لیجئے اماں بی۔“ منجلی دلہن بولیں۔
”صاف سیدھی طرح کہئے ناکہ کوٹھے پر گئے تھے۔ فاتحہ تک میں تو شامل نہیں ہوئے۔ اور پھر یہ سب کیا ہے؟ راتوں کو گیارہ بارہ ایک سے پہلے تو لوٹتے نہیں۔ چپ نام کر رکھا ہے کہ ٹرنینگ لے رہے۔ ٹرنینگ ہے نہ درنینگ، دوسری ہی ٹرنینگ لے رہے ہیں۔“

”ہاں، میں بھی آنکھیں رکھتی ہوں۔ اور کیا بہنا ہم نے بھی ڈھیر سارے بچے کچھ یوں ہی نہیں جن لئے۔ ہزار بار دیکھا ہے کہ جب تک نہاد دھو نہ لیں نماز کے کمرے میں جھکتے تک نہیں ہیں۔ اسے تو کوئی اندھا بھی جان جائے کہ پانی کدھر کو بہ رہا ہے۔ اب یوں کوئی آنکھوں پر پردہ ہی ڈالنا چاہئے تو کیا کہہ سکتے ہیں۔؟“ عزیز میاں کی بیوی نے صفا ساس پر چوٹ کی۔

عید کا دن نکلا، گھر بھر میں چیل پہل مچ گئی۔ رنگین ریشمی سرسراتے پڑے بچوں کی سیم چاخ؛ خالہ بی کا نوکروں پر گر جبار سنا۔ بی بی کے سنگھار تیار۔ بس سارے گھر میں دھمک دھمکا ہونے لگی۔ میاں وہاں، اودھ اودھ بس دھما یں دھما یں مچ گئی۔

دستر خوان بچھا، پورا گھر آکر بیٹھا۔ خالہ بی نے طرح دے دی۔ اتنی اتنی باتوں پر روک کر لینے سے بچھا اور بگڑا ہوا جاتے ہیں۔ بیار دلا سے ہر ایک کو کھلا پٹار ہی تھیں۔ چھوٹے میاں کھا تو کیا رہے تھے، بس کو اٹے ٹھونگتے بیٹھے تھے۔ خالہ بی نے بوڑھی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا اور سمجھا کہ ٹال ٹال گئیں۔

چھوٹے میاں یوں کھا رہے تھے جیسے نوالے حلق میں اٹکتے ہوں۔ ماں نہ سہیر کرنا شروع کیا تو یوں ہی اٹھ کھڑے ہو گئے۔ ”بھوک محسوس نہیں ہو رہی ہے۔ اماں۔“

خالہ بی کے دل کو مستقل دھک دھکی لگ گئی۔

ذاکر میاں کی بی بی کو بس آ جا کر مہی چین سٹھا کہ گھر بھرے کی صفائی کرتی پھر مہی مہینے پندرہ دن میں جھاڑو لے کر اٹھتیں اور پھر پورے گھر کو کھود ڈالتیں۔ صفائی کرتے کرتے چھوٹے میاں کے کمرے کی باری آئی۔ کرسی ہٹائی، میز اٹھایا۔ پلنگ اٹھایا، الماری جگے سے کھسائی

اور پھر جھڑا جھکی کر کے، ایک ایک چیز سنیت کر رکھنے لگیں۔ اتفاق سے الماری
کے قفل رہ گیا تھا۔ پت کھولا۔ ۶ جالے گچھے گچھے بھرے ہوئے بیچے اوپر دھول
ہی دھول۔

”توبہ ہے اللہ! اتنی لنگرگی میں رہا کیسے جانا ہے ان سے؟“
الماری کے خانوں سے سامان اٹھا اٹھا کر بیچے رکھنے لگیں کہ خانوں
کی صفائی ہو جائے تو چیزیں پھر اپنے ٹھکانوں پر پہنچ جائیں۔ دیکھتی ہیں تو
سامنے ہی شہد کی شیشی اور ارند کے نیل کی چھوٹی ڈسی بوتلی، پھر ادھر ادھر
ہاتھ مارا تو چھوٹے چھوٹے موزے اور نہی منی دو تین نیکیریں اور کپڑے آگئیں۔
”ہائے اللہ! سارا سامان ایسا جیلے کسی کی زچگی کی تیاری ہو۔“
ان کی اپنی زچگی ہوئی تھی تو پہلے ہی دن اماں جان نے شہد سنگوایا تھا۔
اور پھر یہ ارند کا نیل، ۶ چھوٹے چھوٹے کپڑے اور یوں الماری میں چھپائے
ہوئے۔!

ایک ہی جھپکے میں وہ دیوانیوں جھپائیوں کے جھپے میں بیٹھی ساری
روداد سنا رہی تھیں۔

”اور کیا ہم نے کچھ نہیں جنے؟“
”وہی تو ہیں کہوں کہ شادی کے نام سے نئے گھوڑے ایسا بد کرتے
کیوں ہیں۔“

”ڈال لیا ہے کسی لڑی پری کو اپنے گھر۔“
بات اتنی بڑی تھی کہ ہلکے پیٹوں والی بہوؤں کے پیٹوں میں نہ
رہ سکتی تھی۔ خالہ بی کو پھر بھی اپنا بیٹیا ہی معصوم دکھائی دیا۔
”اے لو، حد ہو گئی! گھر میں بچے کچے ہیں ہی، خیال سے لے آیا کہ

وقت پر کسی چیز کی ضرورت پڑے تو جلد ہی مل جائے۔ ایک تم ہو کہ طومار باندھے لیتی ہو۔“

”وہ تو آنے والا وقت آپ ہی بتا دیگا۔ ہاں۔“

دوسرے دن محض ساس کی چوٹ چوٹ پہ ڈاکریاں کی بی بی نے امدادی کا پٹ کھولا تو سب چیزیں غائب تھیں۔ مطلب یہ کہ حق حقدار تک پہنچ گیا تھا۔

اس دن کے بعد تو یہ ہونے لگا کہ آئے دن بیویں ساس کو قائل کرنے دیور کی چوری پکڑتیں۔ کبھی جیب سے پیسے نکل رہی ہے تو کبھی کوٹ میں سے ربڑ کی چڑیا کبھی مٹھائی تو کبھی نیل، خالہ بی جان بوجھ کر انجان بنی رہیں۔

خالہ بی کا ایک خیال تو اپنی جگہ یہ تھا کہ جان جوان جی ہے۔ اگر ادھر ادھر جھانکنا تک کر لے تو برائی نہیں بلکہ قابل معافی ہے۔ مگر چھوٹے میاں تو اتنے دیوانے بن گئے تھے کہ سچ بچ کے دیوانے بھی ان کے سامنے سیلے تھے۔ اللہ جانے دل میں کیا سمائی، بانو کی معصوم جوانی پہ رحم آیا یا خود اپنا ہی راستہ عاف کرنا تھا کہ پھوپھی کے، ہاں جا پہنچے اور بولے۔

”بانو بہن کے لئے میں نے ایک بہت اچھی جگہ بات لگائی ہے۔“

”بانو بہن۔؟“ پھوپھی بی جبرست سے چیخیں۔ ”اے میاں بولے والی بی بی ہے۔ بہن سبھا نچی کارشتہ باندھو گے تو نکاح کہاں قبول ہوگا۔؟“

”نکاح کرتا ہی کون کم بخت ہے؟ میں نے تو شروع ہی سے اسے

اپنی بہن مانا ہے، کیونکہ اللہ نے مجھے خود کوئی بہن نہیں دی۔ وہی تو کہتا ہوں کہ بہن کا کچھ حق سبھائی پر لگتا ہے۔ ایسی جگہ بات لگائی ہے کہ بہن بھی ساری عمر سبھائی کو دعائیں دیتی رہے۔“

پھوپھی بی چھالیہ کی جگہ اپنی انگلی کتر گئیں۔ یہ گل بھی کھلنا ہی تھا۔ سو کھل کے رہا۔ بات چیت کا انداز ایسا سنجیدہ تھا کہ پھوپھی بی کو سننے مذاق کا کوئی پہلو نظر نہ آیا۔

چھوٹے میاں کے اپنے دوست تھے شمیم میاں، شہر میں تین تین دکانوں کے مالک۔ عمر بھی بس ان کے لگ بھگ۔ چاہتے تھے کسی شراعت خاندان کی کوئی بیٹی اسٹھائیں، چاہے غیر ہی کیوں نہ ہو۔ باپ مدت ہوں مر چکے تھے۔ لے دے کے ایک ماں تھیں یا یہ خود۔ جو بھی بیٹی بیاہی جاتی لعلوں کی لعل رہتی۔ صورت شکل بھی ایسی کوئی بری نہ تھی۔ انہوں نے سپھوپھی بی کو ایسی ٹپھے دار بانیں سنائیں کہ وہ بھی راضی جیسی ہو گئیں۔ اسے اب جس کو بھرے دل سے بھر منہ سے، بہن کہہ کر پکار لیا، لاکھ وہ خوں کے رشتے بہن نہ ہوں تو گھر پھر بھی بہن کا ماں ہی ادنیٰ ہوتا ہے۔ یہ تو سرام کہنا ہو گیا اور سپھوپھی بی چھوڑ کوئی بھی اس بات پر کیا راضی ہو سکتا تھا کہ لے کر بہن کو سبھائی سے بیاہ دیں۔ یہ تو دین دنیا دونوں میں رویاہ کر دینے والی بات ہوئی۔ صاف صاف لفظوں میں چھوٹے میاں نے اونچی نیچ بھی سمجھا دی کہ برائے خدا آپ بات کو بڑے مشہور نہ کریں۔ ورنہ لوگ تو ہوتے ہی ہیں ایسے کہ کسی کا بفتا کام بگاڑ دیں۔ اور اس پر بھی یوں خوش ہوں جیسے کمال کر دیا ہے کسی کا گھر جلے، بجائے بجھانے کے تاپنا شروع کر دیں۔

ایسے گیتا گیتی شادی کی نیاری شروع ہوئی کہ کسی کو تپہ بھی نہ چل سکا۔ سال چھ مہینے کو بڑی مہو میکے جاتی تھیں، اب کے سے خواہیں۔ تو کیا دیکھتی ہیں کہ سمہرے گھر میں ہلو رچی ہوئی ہے۔ پکڑے گوٹھے ٹھپے کا جیسے بازار کھلا ہوا ہے۔ بیٹھک میں سناں مٹھیا ٹھک ٹھک کئے جا رہا ہے۔ ادھر گودام میں اناج کی اٹھان بچ ہو رہی ہے تو دیواروں پر رنگدار قلعی پھر رہی ہے۔ بات کا تپہ چلا تو بک چک ہو رہی ہیں۔ نگر عقل سے سوچا تو پھر خوش ہو گئیں کہ چلو ٹھیک ہی ہوا۔

چھوٹے میاں کا کیا تھا۔ رات ڈھلے رات آنا۔ باؤلوں کی سی شکلیں بنائے پھرنا۔ نہ کھانے کی سہ نہ پینے کا دھیان۔ اور ٹرننگ کے بعد بھی بڑے ملنے تو وہی تین چار سو روپی۔ یہاں تو بارش ہوتی تھی اور بڑی بات یہ کہ لڑکا اتنی چاہت سے کر رہا تھا۔ ڈاکر میاں کے بڑے بیٹے کے ختنے ہوئے تھے، پورے دوست احباب جمع ہوئے تھے، سچو سچی بی بی بھی مدعو تھیں۔ چھوٹے میاں نے غالباً آگے ہی سب ملے کر رکھا تھا۔ پکا جھپکی میں بانو کا دیدار شمیم میاں کو بھی کر دیا اور وہ تھے کہ صحراؤں کی خاک چھپانے بنا ہی محنوں ہو گئے۔

ادھر چھوٹے میاں کی ٹرننگ ختم ہونے میں دو ماہ رہ گئے تھے۔ اور خالہ بی خوش پہ خوش تھیں کہ چلو خدا نے وہ دن بھی لایا کہ اب چھوٹے بیٹے کے سچوں کھلتے دیکھیں۔ اب شادی ہوگی تو آپ ہی سنبھل جائینگے۔ اس دن بچوں کے گھیرے میں مٹھی منس بول رہی تھیں کہ باہر سے ڈاک اندر بھجوائی گئی۔ نیلے نیلے رقعے نظر آئے تو خالہ بی نے مہوؤں کو آواز دیا۔

بقیس بی نے ایک رقعہ اٹھا لیا اور مچپک ہو کر پوچھیں۔

”ہائیں! یہ تو بڑے چھو سچا کی طرف سے ہیں۔“
 ”کس سلسلے میں مگر۔؟“ خالہ بی چونک کر پولیں۔
 ”سلسلہ؟ سلسلہ یہی شادی کا۔“
 ”ہائیں۔؟“ خالہ بی اور اچنبھ میں پڑ گئیں۔ ”وئی بی کس کی شادی؟ کچھ آگے پڑھو گئی تھی۔؟“
 ”صاف تو لکھا ہے۔“ سخی دلہن نے ایک کنگورے دار گلابی رقعہ سامنے نچا دیا اور زور سے بڑھنے لگی ہیں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تقریب

عقد سعید نور چشمی سلمہا

شرکت محفل عقد و تبادل طعام کا متمنی۔

حاجی عنایت علی خاں زبیدار

مقام ۱۔ لال جوبلی

تاریخ ۲۵ رزی الحجہ ۱۴۰۶

حیدر آباد، دکن

روز پنجشنبہ، بعد مغرب

خالہ بی الحجہ کر لو لیں۔ ”اے بی ڈھنگ سے پڑھو ذرا۔ کیا

سنا رہی ہو یہ۔؟“

بلقیس دلہن کو غصہ آگیا۔ ”لو سبلا میں ایسی نہ پڑے جی اہل ہو گئی
 کہ شادی کا رقعہ بھی پڑھنا نہ آئے۔ سچو سچا میاں کی دہی تو بھیلیاں

ہیں نا اماں بی، ایک بڑی بھابی اور ایک بانو۔ اب بھلا وہ اور کس کی شاہی کار قہ چھپوا سکتے تھے۔ اور پھر لال حویلی میں کون رہتا ہے۔؟“

”مگر لڑکا کون ہے۔ کیا نہ ہمارا چھوٹے میاں ہی ہو۔“

”اے دادا! منجلی دلہن کو ایسے بے موقع منہسی آئی کہ خال کی تبوری چڑھ گئی۔ مگر وہ ہنستے ہنستے ہی بولیں۔

”ہمارے دیورجی کی بات ہوتی تو کھلا کھلا نام ہی نہ چھپوا دیتے، یہاں تو جان بوجھ کر دونوں کے نام چھپائے گئے ہیں کہ کوئی بیچ میں ہاتھ نہ مار دے۔“

سومانی جان غصے میں بولیں۔ ”لو اور سنو، بھلا کہیں شریف لڑکیوں کے نام یوں رقعوں میں چھپا کر تے ہیں؟ ہزاروں عزیز مرد کی نگاہ نام پر پڑے تو کیا شرافت رہ گئی!“

منجلی دلہن تکیے پر سے بولیں۔ ”بھلا نہ سہی دلہن کا نام، دو لے گا نام تو لکھوا سکتے تھے نا۔؟“

ادھر سے چھوٹے میاں کوٹ نپلون ڈالے، ہاتھوں سے بال برابر کرتے برآمد ہوئے تو دیکھا پوری نیچائیت موجود ہے اور معاملہ خاصہ اہم معلوم ہوتا ہے۔ سارا معاملہ سمجھ میں آ گیا۔ دھڑائی سے بولے۔ ”ہاں ہاں بانو ہمیں کی نسبت ہمیں لگا ئی ہے۔“

سسرال میں بانو کی لاج کھلوائی بھی ہوئی، ساس مرد سے بول چال بھی شروع ہو گئی۔ مگر ادھر اتنے دن گزرنے پر بھی خالہ بی کے رویے میں کوئی فرق نہ پڑا۔ ان کا جی تو ہر لمحہ یہی چاہا کرتا کہ بس چلے لو اپنے ہاتھوں اس کلمو ہے کا گلا گھونٹ دیں۔ مگر پھر سوچتیں کہ

کیسے دروں سے پیٹ پھاڑ کر جانتا تو ہاتھ مل کر رہ جاتیں۔ بھابیاں تو خالہ بی سے صاف کہتی تھیں۔

”کسی ایسی ویسی کو گلے باندھ لیا ہے۔“

اب خالہ بی کا یہ حال کہ جو، جو بھی کہے سن لیں اور منہ نہ ہلائیں۔ مگر غصے کے اظہار کا یہ طریقہ انہیں خود ہی نہ بھایا اور اب یہ چلن اٹھایا کہ آتے جاتے چھوٹے میاں کو تیز تیز نظروں سے دیکھ کر تین اور دوسروں کو اڑے لے لے کر طعنے دیا کرتیں۔ بہوؤں کی منہ ٹلی میں بیٹھ کر ایک دن کہا بھی۔

”میرے جیتے جی کون حرامزادی ہے، ذرا اس گھر میں قدم دھر کر تو دیکھے!“

کہاں تو چھوٹے میاں شہزادے باجپتے تھے کہ شہزادی بدر کمال کو بیاہنا پڑا تھا یا اب یہ حال کہ اللہ جلے کس سٹری ماری کو گلے کا تعویذ بنا رکھا تھا۔ کہ نکالتے نہ بنتا۔

بات اب تک بھی ڈھکی چھپی ہی تھی، کسی کو معلوم نہ تھا کہ اصل بھید کیا ہے۔ خالہ بی کے دل کو یہی اس تھی کہ بات کچھ بھی نہیں، کوئی رکھی رکھیلی ہے نہ رافڈر نڈی، بس چپ ہی بچھڑا بنا گھوم رہا ہے۔ چار دن گھومے گا پھر بگاڑو آپ ہی آپ رستوں پر آ جائیگا۔ اودا یکا آدھ دن کسی بھادج کا پلو پکڑ کر کھے گا۔

”بھابی ماں اب ہماری بھی کروا دونا۔“

میٹی غریب کی ماں کا تو یہ حشر ہوتا ہی ہے کہ ہر آباگیا بوجھ بوجھ کر ناک میں دم کر دیتا ہے۔ ”کیوں بیٹھی ہے، کیوں بیٹھی ہے؟“ مگر

کھانا کھانا جان جوان بیٹا بھی اگر لیں ہی ڈھکلیاں کھانا دکھائی دے
 تو ماں کی جان ضیق ہو جاتی ہے۔ خاندان میں لڑکیوں کی ماںیں بھی تو
 تھیں ہی۔ اپنی اپنی بیٹیوں کی سب ہی ماؤں کو فکد ہوتی ہے۔ توہ کیسے
 نہ لیں۔ کبھی تبھار خالہ بی کا جی چاہتا اکٹا کر بول ہی دیا۔ "شادی
 کے قابل ہی نہیں تو مو اکٹا کرے شادی۔!"

اتنے پر بھی خالہ بی تنہی کئے بیٹھی تھیں کہ ڈھنگ کی لڑکی دکھائی
 دی تو بس حضرت کو کس ہی دو ٹنگی۔ مگر حضرت تو ایسے ترسپڑے تھے کہ ٹپے
 پر ہاتھ نہ دھرنے دیتے۔

گرمیوں کی چاندنی راتوں میں جب شام ڈھلنتی اور رات اٹھتی
 تو سارا آنگن مہندی کی کچی کلیوں اور موگرے، موتیا کی کھلی، ادھ کھلی
 کلیوں اور کھجوروں سے مہک مہک اٹھتا۔ سارے بچے جمع ہوتے
 اور کھیل کود مچتا۔ چھوٹے میاں تھے تو چوبیس پچیس کے، مگر بھتیجیوں
 بھتیجیوں سے مل جل کر بس بچہ ہی رہ جاتے اس رات خالہ بی سفید
 چاندنی بچے تخت پر چھالیا کرتی بیٹھی تھیں۔ بہوئیں ادھر ادھر بیٹنگوں
 پر تنہی دل لگی کی باتیں کرتی پڑی تھیں۔ بچے سارے میں شور مچا رہے
 تھے کہ ادھر سے چھوٹے میاں نکل آئے۔

ساروں نے چھوٹے میاں کو جالیا۔

"چچا میاں کہانی، چچا میاں کہانی۔"

"اور رے۔" وہ کوٹے کا دامن چھڑاتے ہوئے بولے، "یہ کوئی

وقت ہے کہانی سننے اور سنانے کا۔" پھر کبھی۔

"اے لو! اور کون وقت ہوتا ہے کہانی کا۔" منجلی بھابی تنک

کر لوں، ”پھر کیا صبح سویرے کہانی سنایا کرتے ہیں؟ چھوہا تھکے چھپانے ہو۔ کبھی تو بچوں کی بات مان جایا کرو۔“

”اچھا، اچھا۔“ وہ ہنستے ہوئے وہیں جم گئے، ”یوں خفا کیوں ہو رہی ہیں آپ۔ تو سبھی بچو! ایک تھا بڑا خوبصورت شہزادہ اور ایک وزیر زادہ۔ دونوں کا دل ہی نہ لگتا تھا۔ بس جناب شہزادے نے پالا ایک طوطا اور وزیر زادے نے پالی ایک مینا۔ بڑی خوبصورت سی کہیں دیکھے ہی جاؤ۔“

”میرے جیسی چچا میاں۔؟“ صالحہ نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔ سارے بچے کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ چھوٹے میاں بھی ہنستے ہنستے سارے چہروں پر نظرب دوڑانے لگے، گویا دیکھتے ہوں مینا کس جیسی تھی۔

”بڑی پیاری سی تھی سبھی وہ۔ منی سی۔ گڑیا سی۔ بس بیسے انبی کا کل۔۔۔۔۔“

جانے کون سی رو میں چھوٹے میاں کیا کہہ گئے کہ ایک دم سے سٹپٹا گئے۔ اور ادھر پوری فضا میں ہم گرجانے کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ سبھی بیاں ایک دوسرے کا منہ تکیے لگیں اور خالہ بی کے ہاتھ کا سر دتے یوں ہنسا کاٹنگا رہ گیا۔ اتنے سارے بچوں میں ایک کا بھی نام کا کل نہ تھا۔ اور کیسا انوکھا سا نام تھا۔؟ سبھی نام ہوا کرتے ہیں راجہ، کلثوم، صالحہ، مریم، شاکرہ، زہرہ، سلیمہ۔ یہ کون تک ہے کا کل؟ خالہ بی کو انپاں ہونا یا آیا اور دوسرے ہی لمحے وہ ایک تنہا لکے کے ساتھ اٹھیں اور عین چہرے بٹیاں کے سر پہ پہنچ کر ان کے بال ہاتھوں

میں کھسٹ ڈالے۔

”بول یہ ساکل کون ہے تیری ہوتی سوتی۔؟“
چھوٹے میاں کے منہ پر رنگ ساچھا گیا، بڑی مضبوط آواز
میں بولے۔

”میں نے دو سال ہوئے شادی کر لی ہے اماں۔ اور ساکل آپ
کی پوتی ہے اور میری بیٹی۔“
چھوٹے میاں اگر جھوٹ بولتے یا مہیا نہ تیرا شتے تو خالہ بی کے غصہ
کو راہ مل جاتی، مگر انہوں نے اتنا بڑا، بے باک سچ کہہ دیا کہ خالہ بی کے
ہاتھ ہی ڈھیلے پڑ گئے۔

”شادی کر لی۔؟“ وہ مرے مرے لہجہ میں بولیں، ”مگر کس سے؟“
”میرے ماتحت ایک کلرک ہیں، ان کی بیٹی ہے اماں۔ بہت
غریب لوگ ہیں۔ بڑی اچھی لڑکی ہے۔ آپ بھی“
خالہ بی کا رکا ہوا غصہ پھر پھر ٹھک اٹھا۔ ”ہاں ہاں غریب
مگر بہت اچھی ہے۔ سوچینا لوں گی ایک چھنل ہو گی۔ ورنہ بوں بغیر
کاجے باجے کے بچہ نہ جن لیتی۔“

چھوٹے میاں کا منہ تپ گیا۔ سامنے ہی جھپٹتے پھینچیاں کھڑی تھیں
آلٹوان کی آنکھوں میں ڈگڈگانے لگے۔ بڑا دل کر کے بولے۔

”قسم خدا کی اماں آپ نے مجھ جیسا ہے اور آپ کا اس سے بھی
بڑھ کر حق لگتا ہے کہ جو چاہیں کریں۔ جو چاہے کہیں۔“

گھر کی بہن گائی فضا میں ایک رکار کا پن آگیا۔ بچے قصور کرتے
ہیں تو ماں باپ معاف کر ہی دیتے ہیں۔ مگر قصور بھی قصور جیسا ہوا۔

یہ منہ ہی کہ زندگی جیسی زندگی کا ساتھ، اور ہاتھ پکڑ لیا ایک کلر کی ادھی کا، جس کے خاندان کا پتہ نہ برے۔ بھلے کی خبر۔ خالہ بی کا غصہ بجا تھا۔ بھابیوں منہ دیکر بات نہ کرتیں، بھائی کھینچے کھینچے رہتے۔ اتنے بڑے کہنے میں رہتے بہتے بھی چھوٹے میاں خود کو اکیلا اکیلا محسوس کرتے۔

برسات کے دن لگے، بدلیاں چھانتیں۔ برساتیں جاتیں کبھی چھانتیں اور ہوا کے زور سے کبھی کبھی جاتیں۔ موسم بدلا تو سب کی طبیعتیں بھی بگڑنے لگیں۔ بچوں پر زیادہ زور پڑا، ناکیں سر سرانے لگیں، شھوں شھوں کھانسنے لگے، آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔

خالہ بی کی اپنی ایک چھوٹی سی الماری تھی، اس میں ہاتھ کی بنائی ہوئی، گھر کی تیار کردہ دوائیں رہتیں۔ کھانسی زکام سے لے کر سیفے بخار اور سپورڈ اسپنسی تک سبھی بیماریوں کی دوائیں بڑے نایاب کر تے تھے اور ان کے نسخے خاندان بھر میں چلتے تھے۔ ہاسپٹل کی دوا سے تو خالہ بی کا پرانا بیر تھا۔

”واگھڑوں پانی ملا دیتے ہیں، کیا فائدہ کرے گی؟“ کوئی مار ترقی پسندی کے دوا خالے کی لال پیلی دوا لے بھی آتا تو مودی میں سے دوا دستی دیکھ کر جاں جاتے کہ خالہ بی نے بہا دی ہوگی۔

پچھلے چار پانچ دنوں سے چھوٹے میاں اپنے آپ میں نہ تھے۔ کھوئے کھوئے سے، بجھے بجھے سے۔ آنکھیں سرخ اور جاگی جاگی سی بالی الجھے بکھرے۔ عجب ہونقوں کی سی صورت بنائے پھرتے تھے کسی سے بول نہ چال، بس اپنے کمرے میں پڑے ہیں۔ صبح ہوئی باہر گئے، دوپہر

کا کھانا کھانے آئے، سپر شام کو پانچ بجے کی بجائے رات کے گیارہ بارہ اور کبھی تو دو بجے کی خبر لاتے۔ زندگی کا معمول عجب بد لا بد لا سا ہو گیا۔
 صالحہ کی کھانسی نے زور پکڑا تو دادی کو ہول ہو گئی چپکی ٹپریا تو جاری ہی تھی، بوا کر یمن نے ڈراوا دیا۔ ”اے بی کالی کھانسی ہے۔ بھلے کو شردع میں علاج کر دالو ورنہ جوڑ جیب گر گئی تو بٹیا عمر بھر کو گنگانی ہو جائیں گی۔“

رات کے گیارہ بارہ کا وقت تھا، خالہ بی نیند بھری آنکھوں سے اٹھ کر الماری والے کمرے کو چلیں۔ ابھی دروازے میں ہی تھیں کہ مل گئے اجالے میں دیکھتی ہیں کہ ان کے اپنے کمرے سے چھوٹے میاں شیشی پکڑے نکل رہے ہیں۔ ماں کو آنا دیکھا تو بوکھلا سے گئے اور شیشی ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ ماں نے بیٹے کو گھور کر دیکھا۔ آنکھوں کی سرخی کا تعلق دل کے درد سے ہوتا ہے۔ چھوٹے میاں کی آنکھ سرخ تھی۔ دل نے درد فرو کھایا ہوگا۔ اماں نے بچن پھنا کر فرش کو دیکھا۔ سارے میں کالی کھانسی کی گولیاں بکھری ہوئی تھیں۔ کلپ کر کو سا دیا۔
 ”جیہ گھورے پہ پیدا ہوئی ہے ایسے ہی مر بھی جائے۔ ہونہ !
 علاج ہو رہے ہیں لاڈلی کے۔ ہمارے خاندان میں ٹیکہ لگا دی کھنچو
 نے۔“

سورج اور چاند کسی کی راہ نہیں دیکھتے، چڑھتے اترتے رہتے ہیں۔ دن تو گزرتے ہی ہیں اور گزرتے ہی رہے۔ ماں بیٹے کے بیچ خفگی اور غصے کی جو دیوار کھڑی تھی وہ جوں کی توں ہی رہی۔
 سرامکے دنوں میں پھلوں کا خوب موسم ہوتا ہے۔ خالہ بی نے

دھیرسی سرخ سرخ گاجر میں خریدیں، ان کے ہنکشت کئے، ساس بہوؤں نے مل جل کر دیگی چڑھایا۔ گھر کی چھینسیں تنہیں، کھویا خوب تھا۔ سیر دو سیر کھویا بھی اس میں لندھا دیا۔ وہ مزے کا حلوا بنا کہ چار گھر درنگ خوشبو اڑاؤ گئی۔ رستہ خوان بچھا، سبھی بیٹھے۔ نوکر چھوٹے میاں کو بھی بلانے گیا۔ مگر وہ اپنے کام میں اچھے ہوئے تھے، بولے۔

”میرا کھانا یہیں پہنچا جا۔“

جب سے انہوں نے خالہ بی کی چھاتی پرسل رکھ دی تھی۔ یہ ان کے برے بھلے میں نہ بولتی تھیں۔ جیسا کہتے، کہ دینیں۔ ”مرد کہ جیو، میں کہہ لیتا ہے۔“ اور ادھر چھوٹے میاں تھے کہ مچھلی کا کاٹا شاہوکر رہ گئے تھے۔ کہ مچھلی کا ہی انگ ہوتا ہے مگر کوئی منہ نہیں لگاتا۔

نوکر نے کھالے کا طشت ان کے کمرے میں پہنچا دیا۔ ابھی سر پوش اٹھایا بھی نہ تھا کہ الائجی اور گھئی کی خوشبو سارے میں پھیل گئی اور ناک سے ہوتی دل میں اتر گئی۔ سر پوش اٹھا کر دیکھا۔ گہرے سرخ رنگ کا حلوا، چاندی کے درق لگے ہوئے۔ ابھی چھوٹے میاں نے ایک چمچ اٹھا کر منہ میں رکھا ہی تھا کہ کوئی حلق میں آکر ٹپک گیا۔ ہاتھ یوں ہی چھوڑ دیا۔ ادھر ادھر دیکھا، باہر سب کھانے میں نکلے تھے۔ برتنوں چمچوں اور دکانیوں کی کھرڑ دھرڑ ہو رہی تھی۔ جلدی سے اٹھے، اخبار میں سے ایک بڑا سا کاغذ نکالا اور پلیٹ اٹھا کر اس میں لپیٹ لی۔ جیب سے دستی بمال کر پوٹلی سی بنالی اور امارا میں رکھ خود طشت کے پاس کھرڑے کھرڑے اٹے سیدھے لوائے ٹھونسے لگے۔

خالد بی عشاء کی نماز پڑھ کر لیٹی تھیں۔ ابھی ابھی گھر بھر کے چراغوں کی لونیچ کر کے گئی تھیں اور سارے میں مل گیا مل گیا سا اجالا پھیلا ہوا تھا۔ سب اپنے اپنے بستروں پر پہنچ گئے تھے۔ چھوٹے میاں نے ادھر دروازے میں سے جھانکا، سامنے دیوار پر ان کے سر کا سایہ ابھرا اور پھر اندر ہو گیا۔ خالد بی کی بند ہوئی آنکھیں کھل گئیں۔ پھر دھیرے سے چھوٹے میاں نے پوٹلی اٹھائی اور کمرے سے باہر ہو کر پٹ اندر بھیڑ دیئے۔ چپکے چپکے قدم اٹھا رہے تھے کہ پیچھے سے کسی نے ایسا ڈرا دیا کہ پوٹلی دھپ سے نیچے جا گری اور اسی دم نین چارنگروں میں ٹوٹ ٹوٹ گئی۔ انہوں نے پیٹھ موڑ کر پیچھے دیکھا۔ خالد بی کا بپتی کمرٹی تھیں۔ گرجدار آواز سے بولیں۔

”اے ہے! پیاروں پیٹے حلق میں اٹک جاتے ہیں نا۔ خبردار! جو دانہ بھی باہر نکالا۔ حضرت کے نام سے فاتحہ دوائی تھی تو ایسے حرام خوردوں کے لئے نہیں۔“

چھوٹے میاں کے جی کو جیسے روگ لگ گیا۔ ہونٹوں کی سنسی جیسے کسی نے چرائی۔ کہاں تو وہ ہونٹ کہ سدا سچوں کی طرح کھلے رہتے یا اب یہ حال کہ آنکھوں میں شبنم سی گھلی رہنے لگی۔

بڑے سبائی جان تھے، پھر اختر سبائی، اچھے سبیا، عزیز سبائی، ذکر سبائی، پھر چھوٹے سبیا کہ گھر بھر میں ان کے اور ان کی بیویوں بچوں کے پیچھے اچھلتے رہتے۔ اماں کو ہر بات کا چاؤ چوچلا۔ کوئی دن نہ گزرتا کہ کسی کی سالگرہ نہ ہوتی ہو کسی کا عقیقہ ہے تو کسی کی چھٹی کسی کا بوٹن ہے تو کسی کی دودھ بڑھائی۔ سبایاں ایک سے ایک

زنگارنگی کپڑا پہنتیں۔ زیور سے سبھی نبی، سنہتی بولتی گھومتی ہیں۔ اور سبھی ہیں کہ کھلے خزانے دھڑ سے دروازے بند کرتے ہیں۔ دلہنوں کے ساتھ راتیں گزارتے ہیں اور علی الاعلان حمام تیار کر داتے ہیں۔ ایک چھوٹے میاں تھے کہ چوٹوں کی طرح راتیں سجاتے۔

ساکل سال بھر کی ہونے کو آئی تو باپ کو چونچلا سوچھا۔ سال پورا ہونے میں تین دن رہ گئے تھے۔ پاس میں کیا رکھا تھا۔ ڈرننگ وریننگ سب گئی چولہے بھاڑ میں، دل پر ایسا پیچھا پڑا تھا کہ کسی بات میں نہ رہے، کوئی بات ڈھنگ سے نہ کر پاتے۔ باپ تھے کہ ماں کے کہے میں، اور جب ماں نے ہی ہر طرح سے پابندی دکا دی تو کیا سچوٹا دھیلا بھی ہاتھ پڑتا۔ ہاں بس انگلی میں زمانے سے سونے کی نوماٹھے کی انگوٹھی پہنے رہتے ہیں۔ سونے کر لیا ہے کہ رانی بیٹا کی سالگرہ اسی سے رچائیں گے۔ دل امیروں کا بھی ہوتا ہے۔ اور غریبوں کا بھی۔ ارمان تو سبھی کو لگے ہوئے ہیں۔

دکانوں دکان گھومتے رہے۔ موتیوں کا مار، سستی قیمت کا ریشم کا سلاسلہ ایک، ننھے منے سرخ جرتے اور چاکلیٹ کا آئب ڈبہ، بطور تحفہ کا فور کی گڑیا۔ سارا سامان الماری میں ڈرپ کر کے کام سے باہر گئے ہوئے تھے کہ بچوں میں سے کسی کی فطر ٹپ گئی کہ چچا میاں کی الماری میں کورنگ ہرنجی دکان سجی ہے۔ تمام گھر دائے میں بوم ہو گئی کہ کوصحی اب تو ایسے ڈھیٹ ہو گئے ہیں کہ دن کی روشنی میں اپنی رکھیلی کے لاڈلوں کو سچانے کے جنن کرتے پھرتے ہیں۔

ایک منہ سے نکلی اور دوسرے منہ تک پہنچی۔ گھر تھا کیا ہوا

اچھا خاصا چھلنی تھا کہ اوہ ربات پٹری نہیں کہ اوہ ٹریک پٹری۔ خالی دراتی ہوئی کمرے میں پہنچیں۔ بڑے سیٹے سے خرید گیا تھا۔ سارا سامان نہانا ساسرخ فراک، چھوٹے چھوٹے لال لال جوتے، مالا، چاکلیٹ کاچم چماتا ڈبہ۔ ایک پٹھے کے ڈبے پر ایک چھٹی لگی ہوئی تھی۔
 ”یہ کیا لکھا ہوا ہے رے؟“ انہوں نے ڈپٹ کر نیم میاں سے پوچھا۔

”جی..... جی داوی اماں ابھی پڑھتا ہوں۔“ وہ الٹک الٹک کر شانے لگے۔ ”نہی گڑیا کی سالگرہ پر۔ ارمان بھری پہلی سالگرہ پر اس کے باپ کی طرف سے۔“
 خالہ بی نے سارے سامان پر نظر کی اور جلتے گھسی میں ٹھنڈے پانی کے پھینچے ایسے پڑ گئے۔

”لو اور سنو۔ اچھی نہ چلے موئے حرامی پلے۔ ہماری نقل بی سالگرہ میں پڑتی ہیں۔“ اور خالہ بی نے ایک لات جوتوں کو ماری، ایک ہاتھ سے فراک کھسوتا، مالا اور چاکلیٹ کا ڈبہ زمین پر رلنے لگے اور رہی سہی ہاتھ کی صفائی ڈبے پر ہو گئی۔ ڈبہ دور جا کر اور اس میں سے ٹری سہی کا نور کی گڑیا کھل کر دو گڑیاؤں میں بٹ گئی۔

آلسون بردلی کی نشانی ہیں۔ اور غصہ بغاوت کی۔ مگر اس دن تو چھوٹے میاں کی آنکھ بھی نم ہوئی اور غصہ بھی بے سجاؤ آیا۔ یوں دکھانے کو تو ہاتھ بڑی ناک دکھا دیتے مگر گھر دار الگ ماندے کی سوچتے تو اتنا کس بل کہاں تھا؟ ابھی نہ کمائی کا کوئی ٹھوڑا ٹھکان تھا نہ اور کوئی دوسری آمدنی۔ ورنہ جی تو یہی چاہا کہ اکدم سے گھر چھوڑ

کہ چل ہی دین۔ سالگرہ کی کیسی مٹی پلید ہوئی۔؟ خود پُہ ہی غصہ آیا کہ جلدی میں سب سامان کھلا چھوڑ چلتا بنا، ورنہ کسی کے فرشتوں کو بھی نہ لگتا۔ گھڑیا کے ٹکڑے و بچہ کہ رات بھر دل میں رہ رہ کر میسب اٹھتی رہیں۔ "اب اس گھر میں نہ رہوں گا۔" انہوں نے دل ہی دل میں طے کر لیا۔

جس دن کا کل بیٹا کی سالگرہ پڑتی تھی باپ اپنے کمرے میں منہ لیٹے چپکے چپکے روئے جاتے تھے۔

مردوں کا ادھر ادھر ننگا ہیں جھکانا عام سی بات ہے۔ اور کنواں نہ کیا ذکر ہے۔ اچھے گھر بھر کے بچے ہیں، بیوی ہے، ایسوں کو بھی کبھی باہر کی چاٹ لگی۔ تو کوٹھا جا لیا۔ اس میں حیرت کی بات ہے نہ غصہ کی۔ مرد کی ذات ہوتی ہی ایسی ہے۔ خود خالوں میاں کا حال کیا ڈھکا چھپا تھا۔ ٹونکی کے بہانے سال چھ مہینے میں دو چار دفعہ باہر کی ہوا کھاتے ہی تھے اور دوسری ہی ٹونکی دیکھ کر ٹوٹے تھے۔ مگر ایسا سہلا کہاں ہوتا ہے کہ ایسی ویسی عورتوں کو سر ہی چڑھا لیا جائے؟ دل آجانا بھی بری بات نہیں، اللہ نے آنکھ دیکھنے کو دی ہے اور اگر چلتے پھرتے کوئی چاند سی صورت آنکھ میں بھر گئی تو کیا ہوا۔؟ مگر یہ تو بری بات ہوئی کہ اس کو گھر کی رانی بنی بنا ڈالیں۔

سچلے سبھاؤ میں ایک دن منجلی بہو نے ساس کو راتے دی تھی یہی کہ جھپٹے جھپٹے کو معافی دے دیا۔ مگر خالہ بی کا بھی وہ حال تھا کہ جو کہا تو مدت ہوئی بچہ چکا تھا، مگر تپش ابھی تک باقی ہی تھی۔ نا کہ میاں کی بی بی کا کہنا تھا کہ ضرور چھوٹے میاں کی بی بی اچھے گھر اور اچھے

عادتوں کی ہے، تب ہی تو وہ اب تک اس سے لگے ہوئے ہیں۔ ورنہ مرد لوگ تو جہاں کوئی کمبوٹ خرابی دیکھتے ہیں بس جی چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ اور لگتا ہے دل کی بھی برسی نہیں۔ انہوں نے پچھلے دنوں کا واقعہ یاد دلایا کہ سردی کا زور ہوا تو چھوٹے میاں ٹبرے سہائی جان، اچھے بھیا اور عزیز سہائی کے گود کے بچوں کے لئے ہلکے نیلے رنگ کے ادن کے بنے ہوئے چھوٹے موزے اور ویسی ہی لوپیاں لائے تھے۔ بھابیوں نے پوچھا بھی۔

”کہاں سے لائے میاں۔ کیا قیمت ہے۔؟“
 تو ذرا مسکرا کر بولے۔ ”میرے دوست کی دوکان ہے اُہاں سے لے آیا۔“ بھلا کون دوست الیا جی والا تھا کہ گھر بیٹھے پھکٹ میں اپنا نقیان کر داتا؟ اور منجلی سہابی نے جو بوٹ دیکھی تو صاف پہچان لی کہ گھر کی ہی بنائی ہے۔ اب نیا ہر ہے یہ اسی کا کام ہو سکتا ہے۔
 ورنہ اور کس کا پیپ پیچڑا اچھلے گا۔؟

مگر وہ تو خالہ بی بی تھیں، بچے نام کی۔ مرتی مرحا تیں مگر کبھی یہ رسوائی نہ کنیں کہ بی بیوں کی بیٹی ان کی بہو کہلائے۔ اور عزیز بھی کیسی کہ جس کے خاندان ۱۲ نہ پتہ نہ ذات پات کی خبر۔ کیا بی بیوں کی بیٹیاں نہیں اٹھایا کرتے؟ مگر وہ بھی ذرا تمیز سے، دھچھ سہال کے۔ ایسے نہیں کہ بس راہ چلنی کو دکھیا اور آنکھوں کا کا جل بنا لیا۔

اس دن تو خالہ بی بی کے نن پد ن میں آگ لگ گئی۔ گھر بھر میں بچے ادھم مچا رہے تھے اور تمام مائیں بیٹھی خوش ہو رہی تھیں۔ بیٹے اپنے اپنے کمروں میں تھے۔ باہر بھی نکل آتے کام سے، پھر اندر چلے جاتے۔ کیسی

چپل پہل پہلی۔ ہلکی ہلکی بوندیں برس رہی تھیں، بڑا سہانا سہانا سماں تھا۔
اور تو سب تھے، بس چھوٹے میاں ہی وہاں نہ تھے۔

خالو میاں نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر رک رک کر بولے۔

”اجی میں کہتا ہوں بچے غلطیاں کرتے ہی ہیں۔“

خالہ بی سمجھیں ان کھیلنے بچوں میں سے کسی نے مزارت کی ہوگی۔

اس پر کہہ رہے ہوں گے۔ بولیں۔

”ہاں اور بچے کرتے بھی کیا ہیں۔؟“

باپ خوش ہو گئے۔ سمجھے بات بن گئی۔ بولے۔ ”وہی تو میں بھی کہہ

رہا ہوں کہ اب ہوا سپر۔ ا۔ جو ان بچہ ہے۔ جان پر کیمل گیا تو کیا کر لینگا۔

آلے دو گھر میں چھوٹی بہو کو بھی۔؟“

خالہ بی نے ترنک کر ان کی طرف دیکھا۔

”اے لویہ بیٹے کی پشت پناہی ہو رہی ہے۔ ہوتا ہوگا۔ تمہارے

بڑوں میں کہ راد چلنیوں کو گھر ڈال لیں، میرے ہاں اکیلا ہوا سنا نہ ہوگا۔

میں بھی سمجھی کیا کہنے جا رہے ہیں۔ اچھا ہوا جو میرے سامنے کہتے تو۔

سامنے قبلہ ہے۔ ہاں سچ کہتی ہوں باؤلی میں چھلانگ لگا دیتی غضب

خدا کا ذرا دیکھو تو کیا دن آیلے کہ دیدوں کے سامنے ایسی داسیات

حرکتیں ہوں اور ہم مان بھی جا لیں۔ بیج سناتی ہوں کہ کتے کو ساتھ

بٹھا کر کھلاؤں پر اس حراخہ کو اپنے در پر نہ پھٹکنے دوں کہ میری کوکھ کی

بردعاسمیت رہی ہے۔“

خالو میاں چپ رہ گئے۔ جیل جوت زیادہ کرتے بھی نہ تھے۔ وہ

خود بڑے سخت قسم کے آدمی تھے پر روایتی بادشاہوں کی طرح انہیں

سبھی ساتواں شہزادہ بے حد غمزدہ تھا۔ بچپن میں بڑے بچوں کو مارا ہوتا مارا ہو، چھوٹے میاں کو تو کبھی دھکا بھی نہ دیا۔ کیسی ہی ضد کیوں نہ کرنے پوری کر دیتے۔ ادھر ماں بگڑتی ہی تھیں کہ چھو کر نہ کو دو کوڑی کا کر دو گے۔ مگر ان سے سہارا کہاں ہوتی کہ چیز سامنے دھری رہے اور بیٹا بلکتا رہے۔

اب بھی ان سے کہاں سہارا ہو رہی تھی۔ بیوی تھی کہ چار گھر پر ہی تھی اور بیٹا تھا کہ خالی پہلو سوتا تھا اور مرد ہونے بھی عورتوں کی طرح بلکتا تھا۔ مگر زیادہ زور دیا بھی نہیں۔ جانتے تھے خالہ بی سدا کی سیکڑی ہیں، بات غصے کی ہو یا مذاق کی، جو کہتیں پورا ہی کر دکھاتیں۔ رمضان کی عید آئی اور اسی زور شور سے آئی جیسے کہ سدا آتی تھی۔ گھر بھر میں دہی چیل پیل بچ گئی۔ بچے اپنے کپڑے لے لے کر سھاگ رہے ہیں۔ مائیں ڈانٹ رہی ہیں۔ ادھر خالہ بی کی نوکروں پر پڑتال پڑ رہی ہے کہ نمازی عید گاہ جانے کو تیار بھی ہو گئے تو کسی کام کا ٹھکانا ہی نہیں۔ ادھر لڑکیاں ہاتھوں کی مہندی چھڑا رہی تھیں تو بیٹے نہا نہا کر نکل رہے تھے اور رول مچا رہے تھے۔ کوئی کمر بند نہ ہونے کی شکایت کر رہا تھا تو کسی کو اپنا جوتا ہی نہ ملتا تھا۔ کسی نے اپنی اچکن کے مین نیچے اوپر اکالے تو کسی کا ازار بند ٹخنوں تک لٹک رہا ہے اور اسے کھونٹے تک کی بھی سدھ نہیں۔ اتنے ہنگاموں میں ایک چھوٹے میاں بھی تھے کہ خاموش سے تھے۔ اچھے، چپ چاپ غسل کیا۔ صاف کپڑے بدلے اور نماز گاہ کو چل دیے۔ ماں بیٹے کا مدت سے ابولا بند تھا۔ نہ یہ ان سے بات

کرتی تھیں نہ وہ خود ہی رخ دیتے تھے۔ جلد کے دن تو ہڑے دشمن بھی
گلے مل لیتے ہیں۔ یہ تو اپنے پیٹ کی اولاد تھا۔ مگر چھوٹے میاں نے آکر سلام
کیا تو خالہ بی نے منہ پھیر لیا۔ گلے دگائیں تو دعا دینی ہی پڑتی۔
”خدا بڑی عمر کر لے۔ سہرے کے پھول کھلیں۔“

مگر سہرے کے پھول تو آگے ہی کھل چکے تھے اور کس کے نام سے
غصہ کی ایک لہر اٹھی اور ان کے پورے جسم میں دوڑ گئی۔ چونکا ہوا۔
بیٹے نے ماں کو دیکھا۔ غصے میں دھان پھول، دھان پھول کمر رہی تھیں
چپکے سے اپنے کمرے میں جا رہے۔

خالہ بی کھلانے پلانے کے انتظام میں لگ گئیں۔ سب ہی لوگ عید کا
سے واپس آچکے تھے۔ سات بیٹیوں کی ماں، چھ بہوؤں کی ساس، دامبر
سارے پوتوں پوتیوں کی دادی کہ سلام دعا لیتے دیتے ہی گیارہ بج گئے۔
مردوں کی عید کا سہرے والپسی پر عورتیں کی عید چلتی ہے۔ زمانے میں دھوم
بج گئی۔ ساس پیرھی پر بیٹھ ننگا دل کو ٹھنڈک پہنچانے لگیں۔

بڑی دلہن نکلیں۔ ہری بنارسی ساڑی، جید کا جھول زربور،
سنگھار پیار کئے مسکراتی منہتی، کنا انکھیوں سے میاں کو دیکھتی ہوئیں۔
ادھر سے منجلی دلہن آئیں۔ کھڑا محراب کا پاجامہ، بنارسی چولی کرتی۔
تاش کا دوپٹہ، گہنے پانے سے سجی بنی۔ عزیز میاں، ڈاکر میاں۔ اکرم
میاں کی دلہنیں ایک دوسرے سے چھڑکرتی۔ منہتی مسکراتی صورتیں۔
پھر بلقیس آئیں۔ چھیوں بہوؤں میں یہ سب سے زیادہ پیاری تھیں۔
سرخ کا مدار نولواں ساڑی پہنے، چھ ہینے کا پیٹ اونچا ابھرا ہوا
مسی کی دھڑی اور مانگ میں افشاں۔ ایسے بھاری زربور کپڑے

اور پہننے والی ایسی نازک پھول پاں؛ چلنا دوسرے پور ہاتھ۔ بچے
 رنگین کپڑوں میں ملبوس، منہ میں پاں سٹھونے سٹھونے پھر رہے تھے۔
 کبھی باہر تو کبھی اندر، ابھی یہاں کہ ابھی وہاں۔ مردانے میں ملنے
 والے آئے اور بادل خواستہ مرے مرے قدموں سے چھوٹے میاں
 بھی عید ملنے، مصافحہ کرنے گئے۔

اک دم اندر سے بچوں کا شور اٹھا اور ہاتھوں میں ایک بند
 سا کپڑا لے کے آئے۔ آٹھ بارہ آنے گز میں ملنے والے سرخ ریشم
 کی ساڑی اور ایسی ہلکی قسم کی کہ پہننے والی ذرا سجھاری کو لپے کی ہوئی
 تو ایک ہی دھوپ میں بکس بکس جائے، اور ایک سرخ ہی رنگ کا بھار
 سا فراک، جس پر جگر نگر سارے نلکے ہوئے تھے جھوٹے جھوٹے۔ یہ
 یہ ایک مجبور شوہر اور ارمان بھرے باپ کا آئینہ تھا۔ صبح
 یوں ہی خالہ بی ساروں کے کمروں میں اگر بنیاں سلگاتی پھر رہی تھیں
 کہ انہیں سرخ پلو جھانکتا ہوا دکھائی دے گیا تو انہوں نے کہاں
 سوچا تھا کہ یہ عید کی سجاوٹ بناوٹ ہے۔ وہ بڑے خود سے ساڑی
 کو دیکھنے لگیں۔ ان کی نظر کے سامنے سے بڑی دلہن گزریں۔ جن کی بنا
 ساڑی چم چم چمک رہی تھی۔ سو دوسو سے کم کی کیا ہوگی۔ پھر منجلی
 دلہن کہ کھوا ب کا پا جامہ ہی سو ڈیڑھ سو کا ہو گا۔ کمری، چولی، دوپٹہ
 تو الگ رہا۔ پھر جھوٹی بہوئیں، جن کے کپڑے ایسے سجھاری، کا مدار
 تو لوں کہ چلتے ہیں لپک لپک جاتی تھیں۔ اور یہ ساتویں شہزادی
 کیا پہن رہی ہے آج۔ خالہ بی کا جی اندر سے پھل اٹھا۔ تیز تیز
 قدموں سے چلتی وہ چھوٹے میاں کے کمرے میں آئیں اور نہٹلی کر سی

پر پٹخ، ایلے پیروں واپس نکل گئیں۔

چھوٹے میاں کرے میں داخل ہوئے، گھڑی پر ایک نظر کی، ساڑ بارہ ہو رہے تھے۔ کمر سی پر سے بندل اٹھایا، ابھی ایک قدم باہر اور ایک اندر ہی تھا کہ خالہ بی لیلی ہوئی آگئیں۔ ہاتھوں میں بڑا ساطت سنبھالے، جس پر جھالریں لٹکا ہوا سرخ کپڑا لٹک رہا تھا۔

طشت میز پر پٹکا کر انہوں نے چھوٹے میاں کا کندھا جا پکڑ لیا۔ ان کی آنکھیں یوں گیلی گیلی تھیں کہ ماں کا جی کٹ گیا۔

”کہاں جا رہا ہے۔؟“ انہوں نے تن تنہا کر پوچھا۔

چھوٹے میاں نے کچھ جواب نہ دیا، سر جھٹک لیا۔

خالہ بی نے بندل ہاتھ سے جھپٹ لیا۔ تلخی سے بولیں۔ ”اور یہ

کیا ہے۔؟“

”چھوٹے میاں نے کوئی جواب نہ دیا تو ترشی سے بولیں۔

”عید کا جزا ہے نا۔؟“

چھوٹے میاں پھر بھی سر جھٹکائے کھڑے ہی رہے۔

”کلمو ہے عید پر کوئی ایسا ہلکا جوڑا بنایا کرتا ہے۔؟“

چھوٹے میاں نے چونک کر ماں کی طرف دیکھا تو غصے غصے

بول رہی ہیں۔

”مقبول میاں کی بہو اور یہ بارہ آنے لگا والا ریشم! مشرم تو

نہیں آئی تھی اپنی دلہن کو ایسا کپڑا پہناتے ہوئے۔؟“

چھوٹے میاں کو کوئی جواب ہی نہ سوجھا۔

”یہ جوڑے لے جا اور اپنی دلہن کو مینا کر لے آ۔ اکیلے میں اس کا

جی گھبراتا ہوگا، یہاں چار میں جی پہلے گا۔ ” انہوں نے سرخ بندل کی طرف نفرت سے دیکھا۔

” تب مجھ سے تو اتنا بھی نہ ہو سکا کہ ہلکی پھلکی کرن باکڑی ہی خرید لیتا کہ ساڑی سا جری تو ہو جاتی۔ ” اور انہوں نے ہشت پر سے ہشت پوش ہٹا دیا۔ چھوٹے میاں نے ایک ہی نظر میں دیکھ لیا۔ یہ وہ پانچ کا مدار جوڑے تھے جو اماں نے بڑے چاؤ سے اپنی بہو کے لئے خوراپے ہاتھوں تیار کئے تھے۔

شجر ممنوعہ

صفدر میاں غسل خانے سے باہر نکلے تو دیکھا سامنے ہی منیر میاں بیٹھے ہیں۔ سامنے رالہ بیگم لیٹی ہیں اور یہ ہیں کہ انہماک سے انہیں دیکھتے جا رہے ہیں۔ تنھوڑی دیر تک تو بولیں ہی محو بیتا سے دیکھتے رہے، پھر ایک دم ان کا فراک گھٹنوں تک سرکا دیا۔ چکنی چکنی اور صندلی پنڈلی عریاں ہو گئی۔ منیر میاں آگے جھکے اور اپنی انگلیاں پنڈلی پر چلائے لگے۔ رالہ بیگم نے ایک بار اپنی ٹری ٹری آنکھیں کھول کر پاس بیٹھے ہوئے منیر میاں کو دیکھا اور پھر آنکھیں موند لیں۔ مگر انگلیوں کے لمس سے جو گدگدی محسوس ہو رہی تھی اس کی وجہ سے ان کے تپلے تپلے اور گلابی ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

صفدر میاں ایک لمحے کو یہ سب کچھ دیکھتے رہے پھر چلا کر بولے "کیا کر رہے نامعلوم؟ اور یہ چونچ بھی لال کر رہ گئی ہے۔ کیوں میاں صاحبزادے۔؟"

"جی۔؟" منیر میاں بوکھلا گئے۔
 "اسکول نہیں گئے آج۔؟" وہ پھر گرے۔
 "جی پیٹ میں دلدادہ ہے۔" منیر میاں تو تھکا کر پوسے۔

”جیسے چھپا گو۔ نکلو میاں سے ابھی دو کا پہاڑ استنا ہوں۔!“
 مینر میاں نے ایک بار تو اپنے باپ کی طرف دیکھا، پھر تین برس
 کی اس ننھی منی گڑیا۔ راجہ کی طرف — اور باہر شک گئے۔ صفد
 میاں پھر چلائے۔ ”سات برس کا گھوٹا ہو گیا اور اب تک پہلی جماعت
 میں ٹیڑھا پڑا ہے نامعقول کہیں کا۔“

راجہ ن کی گرجدار آواز پر چونک کر اٹھ بیٹھی۔ ادم اس کی
 نگاہ اپنی پنڈ، پر پڑی۔ اسی لمحے صفد میاں کی نگاہیں بھی اسی دھبے
 سے جا کر ٹکرائیں۔

یہ مینر میاں کے ننھے منے ہونٹوں کا سرخ سرخ نشان تھا۔ گویا کہتا
 ہوا انگارہ۔!
 غالباً گھنٹائی میں انہوں نے راجہ کی پنڈلی کا بوسہ لیا تھا۔

مینر میاں

چھوٹی بیگم نے کیا کیا پاؤں نہ بیلے، مگر مینر میاں کے سہرے کی نکلیاں
 کھلنی نہ کھلیں۔ بات کچھ بھی ہوئی، مگر یہ نوبت ہی نہ آئی کہ مینر میاں
 کبھی زرتار صاحبہ کو باندھتے، یہ جسم جیسا تا سہرا سجاتے اور گھوڑے پر بٹھ
 چاند سی دہن پیاہ لاتے چھوٹی بیگم منتیں مانگتے تھک گئیں مگر کچھ بھی
 تو نہ ہو سکا خاندان بھریں ایک سے ایک لڑکیاں بھری پڑی تھیں۔
 گوری، خوبصورت، نک سب سے درست، کام کاج میں بھی تیز، مگر
 بات پھر بھی دیتی۔ اور سید صاحب کی بیٹی تو ایسی تھی کہ ہاتھوں لگائے میلی
 ہوتی، اسرا۔ ہ سے بھی آراستہ اور خانہ داری میں تو لیس بیگم تھی۔

سیون پروں، کھانا پکانا، آئے گئے کی ہر بات برابری، مگر منیر میاں کے نصیب میں یہ سب کہاں تھا۔! چھوٹی بیگم اپنے سہائی کے لئے کیسی کیسی جان کڑھاتیں۔ سہائی سے بغیر بڑے چھے کچھ کئی بار نسبت بھی پکی کر لی گئی اور چھپن بار تو الائجیاں تک بٹ گئیں، مگر وہ کلیاں پھر بھی نہ چپکیں۔ پھر آجاکے چھوٹی بیگم کو یہی سوچنا کہ ہاتھ اٹھا اٹھا کر اور پلو پلا کر اس کو کونسنے دیں جو منیر میاں کو ایسا بہکا گیا کہ شادی اور عورت کے نام سے بدکنے لگے۔

اور اب یہ بات بھی آج کل نہ تھی۔ منیر میاں کی عمر کے بڑے تو کئی بچوں کے باپ ہو گئے تھے۔ بلکہ حویلی والے اشرف میاں تو گئے سال اپنی بیٹی کی شادی بھی کر ڈالی اور اب اللہ رکھے ان کی گود میں نواسا بھی کھیلنے کو تھا۔ اللہ جھوٹ نہ بلوائے تو منیر میاں کا یہ بیا لیسواں سال تھا۔ مونچھوں کے دودو، چار چار ہال بھی سفید ہو گئے تھے اور اب ڈھلتی کا زمانہ تھا۔ مگر بہن اسی آس میں مری جاتی تھیں کہ سہائی کے سر سہرا دیکھ لیں۔ چھوٹی بیگم کہتیں تھیں "اے آدمی کی عمر تو دراصل چالیس کے بعد شروع ہوتی ہے" جی تو دن آئے ہیں۔ مگر دن آکر بھی نہ آئے، ہاں باپ تو کیا کیا منتیں نہ کر مرے، مگر وہ منیر میاں تھے کہ بس بس سے مس نہ ہوئے۔ اب بہن بہنوئی کی تمام تر کوشش یہ تھی کہ کسی بھی نکستی چپٹی، کالی پیلی کو بیاہ لا لیں۔ مگر منیر میاں توجہ دیتے تب نا۔!

خاندان بھر میں ایسا تو کوئی لڑکا نہ تھا۔ جس نے شروع جوانی میں ہی عورت سے منہ پھیر لیا ہو۔ بس بھی تو بخشنے ہوئے تھے۔ مگر ان حضرات

کا تو شروع سے ہی ڈھنگ نہ لاسکا۔ عمر یہی کوئی بیس بائیس کی ہوگی۔ دیکھنے میں ایسے ادبچے پورے، ایسے خوبصورت کہ لڑکیاں آپ ہی مری جاتی تھیں، مگر انہوں نے خود کسی کو آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ چھوٹی بیگم تو کھتی تھیں یہ سب اس موئے پادری کا قصور تھا جو انہیں پکارا رہا بنا گیا۔ لمبے دے کے اچڑے گھر کا بھی تو ایک دیا تھا۔ شادی ہوتی، گھر بار بستا تو اولاد کی آس بھی ہوتی۔ اب تو کوئی نام لینے والا، نہ مرے نومنت میں پالی ڈالنے والا۔ کیسی تنہا ہی تھی خدا یا کہ بیٹا ہوتے بھی نسل ختم ہوتی جا رہی تھی۔ مینرمیاں کا پیغام سب سے پہلے تو انہی شیخ حسین کی بیٹی کو گیا جو انگریزی بھی پڑھی ہوئی تھی۔ اور جو دیکھنے، دیکھانے میں بھی ہزاروں میں نہیں تو دس بیس میں ایک ضرور تھی۔

اور سچ جو پوچھو تو مینرمیاں کی ماں کا اس پر لٹو ہو جانا یوں بھی تھا کہ جہیز کے علاوہ ایک معقول رقم ملنے کی آس بھی تھی۔ ادھر سے ماں بھی ہو گئی۔ اور بچی پوڑھی ہو گئی تو جان پہچان والوں کے میاں پاں سپاری بھی بٹ گئی کہ یکا یک بیٹھے بیٹھائے مینرمیاں لے اٹکا کر دیا۔ "بیں شادی منہیں کر دنگا۔" سننے والے تو سبھو بچکے ہی رہ گئے۔ کوئی وجہ ہی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ ماں کو اتنا تو معلوم تھا کہ کسی انگریز سے راہ درسم ہے مگر یہ نہ معلوم تھا کہ یہ راہ درسم اس بات کی نوبت لے آئے گی۔

"اے ایسا ہی مولوی بٹنا ہے تو بن لو مگر شادی کیوں نہیں کرتے۔ شادی تو کسی بھی مذہب میں منع نہیں ہے۔" وہ چلا کر بولتیں۔
 "ارے اماں اس بیچارے کو کیوں بدنام کرو — میں خود

بات۔ مگر ادھر جب سے ماں باپ مرے تو میریاں بہن بہنوئی کے گھر
 ہی آ پڑے تھے۔ اور اس وقت ان کی عمر ہوئی یہی کوئی تیس بیس کی۔
 اور چھوٹی بیگم کو اکثر یہ منظر دکھائی دیتا کہ بیٹے دو بیٹے میں ایک آدمہ
 بار میریاں صبح ہی صبح بستر سے گڑ بڑائے گڑ بڑائے سے اٹھتے۔
 اٹھتے ہی چادر لٹہ منڈ کر کے دور کونے میں پھینکتے اور بہنوئی کی نظر
 بجا کر آدم غسل خالی کی راہ لیتے۔ چھوٹی بیگم گھر بھر کے بستر وں کی
 غلاف چادر میں بدلو اتیں تو دل ہی دل میں ہلکتیں۔ ”ہے ہے کسی بھری
 پری جوانیوں ہی برباد ہو رہی ہے مولیٰ۔“ میریاں اپنے بہنوئی سے
 ایسے نظر میں بجا کر جاتے کہ پاؤں کی آہٹ بھی نہ سنائی دے۔ رفیع الدین
 تو یوں ہی کچی منبد کے تھے۔ میریاں مارے ڈر کے کھڑاؤں بھی نہ
 پہننے کہ کھٹ کھٹ کی آواز پر اگر بھائی صاحب اٹھ گئے تو آدھ گھنٹے
 تو چیخ چھاڑ کر رہ گئے ہی۔ اور وہ دن سے غسل خانے میں غائب ہو جاتا۔
 ”ارے میاں، کیوں خواہ مخواہ ہٹ کئے جاتے ہو۔؟ ابھی بھی
 کچھ نہیں گیا، کہو تو کرا دیں تمہاری شادی کسی اچھی جگہ۔“ ایک دن صبح
 ہی صبح انہیں چادر پھینکنا دیکھ کر بہنوئی نے اپنے رشتہ سے فائدہ
 اٹھایا۔ مگر میریاں نے کچھ جواب ہی نہ دیا انہیں بس ان کی طرف دیکھا
 اور سٹ پٹلے ہوئے باہر دوڑ گئے۔

رفیع الدین کا مطلب کسی ”اچھی جگہ“ سے ہمیشہ ان کی اپنی بہن
 سے ہوتا۔ رابعہ بیگم تین برس کی بیاہی ہوئی رائڈ ہو کر بھائی بھادج کے
 گھر آ پڑی تھیں۔ شادی کو تین ہی برس تو ہوئے تھے۔ جب گاؤں میں
 سیفہ پھوٹا اور ایسا پھوٹا کہ ساری آبادی لے کر ہی لوٹا۔ نصیبوں جلی

رابعہ بیگم بھی انہی بد نصیبوں میں تھیں جو پیچھے کی دباہیں مر گئے۔ یوں کہنے کو رابعہ بیگم نہ مر رہی ان کے میاں مرے، مگر سچ جو پوچھو تو ہندوستانی گھرانے کی پروردہ دار عورت کے لئے اس کے مرد کی زندگی ہی تو اس کی اپنی زندگی ہے۔ رابعہ بیگم سے یوں بھی ایک ہارنیر میاں کی بات چلی تھی جب چھوٹی بیگم کی شادی رفیع الدین سے ہونے لگی تو اماں نے سوچا کہ بیٹی دے کر بیٹی لے لیں گے اور آپس میں ساٹا آٹا کر لیں گے۔ مگر میاں تو بردگ لئے بیٹھے تھے۔

بیچاری تین برس سہاگن رہیں اور اب سترہ اٹھارہ برس سے زندگی اپنے کی زندگی کاٹ رہی تھیں۔ کیسی لہکتی لہکتی جوانی تھی کہ اپنا وزن آپ نہ سنبھلتا۔ یہ ٹہری ٹہری آنکھیں۔ کالے کالے لمبے بال بوٹا سا قد، گورا گورا رنگ اور جسم کی بناوٹ تو ایسی گدرائی گدرائی کہ سپہو لوں سے لدی ڈالی کا گمان ہوتا۔ اور کام کاج میں بھی ایسی کہ جب سے سہائی کے گھر آٹھری تھیں بھانج کو کبھی ہاتھ نہ ہلانے دیا۔ سبھی کا کام ان کے ذمہ۔ چوڑی دار پاجامہ، آڑا دوپٹہ، چولی، کرتی، مہی لباس ہوتا، مگر اس میں بھی بدن جیسے پکار پکار اٹھتا۔ دوڑ دوڑ کر کام کرتیں۔ سبھی کی ڈانٹ گھر کی تو نصیب میں تھیں، مگر مسکرا مسکرا کر ہر کام نبیتر لیتی۔ اور بیوگی کی وہ حسرت جو سہاڈ نے چہرے سے چھٹ کر نہ گئی تھی۔ اس سبولی سہالی مسکراہٹ سے دھلی سی جاتی۔ مسکرا کر ہر کام پر ٹوٹی پڑتی۔ منیر میاں نے ستر ہزار بار تو انہیں دیکھا ہوگا۔ چھوٹی بیگم نے بھی کیا کیا چاہا کہ وہ منیر میاں کی نگاہوں میں بھر جائیں، مگر ان کی آنکھیں تو کھلی ہوئے ہوئے بھی بندھی تھیں۔ رفیع الدین منہ سے تو سبھلا

کچھ کہتے، ذلی زلف سے ہزاروں مرتبہ کہا ہو گا۔ ”کہو تو کہ ادیں تمہاری شادی کسی اچھی جگہ۔“ مگر وہ کب مانتے تھے کہ ابھی مان جائے۔ جانے کس شخص کی مٹی سے خمیر اٹھا سنا ان کا کہ آنکھیں سبر سبر دیکھتے۔ کام بگاڑ دیتیں تو آنکھوں میں آنکھیں ڈال ڈال کر ڈالیں، مگر کیا حال کوئی بجلی بھرا جائے، کوئی کوندا ہی لپک جائے۔ چھوٹی بیگم تو نند پر لٹو تھیں۔ کیسا پیارا پیارا لکھڑا، جھومتا ہوا بدن، اود اس پر دل موہ لینے والی ادا ہیں۔ رات کو اپنے پلنگ پر جاتیں تو چار چار بار اٹھ اٹھ کر پوچھتیں۔

”سجالی ماں، پاؤں دبا دوں۔ سجالی ماں، یہ کر دوں۔ سجالی ماں، وہ کر دوں۔“ ایسی اداؤں پر کون لوٹ پوٹ نہ ہو جائے بھلا؟ اور رات گئے جب بیچاری کا پلنگ چرچرانا تو چھوٹی بیگم کا دل غم اور ہمدردی سے بھر جاتا، اود مینرمیاں کے لئے دل میں نفرت پھوٹ پڑتی۔

”اللہ ماہ آج ہاں کر دے تو یہ چار پائی کیوں چرچر کرے۔“ ایک سے ایک چھو کر سی نظر سے گزری، مگر اس خدا کے بندے نے آنکھ نہ لٹائی۔ چھوٹی بیگم بھی جتن کر گزریں۔ بس ایک سنجے کی طرح گھیر گھا کر لانا ہی تو باقی رہ گیا تنہا وہ بھی نہ چھوٹا۔

چھوٹی بیگم کے مانگے میں ایک چھو کر سی ملازم تھی۔ خالہ بی اس سے کیسی پریشان تھیں کہ توبہ۔ رنگ دیکھو تو کالا کٹم۔ یہ موٹی موٹی ٹہسی مگر موٹا پن بھی ایسا گویا پتھر سے کاٹا ہوا بدن۔ سجدہ سجدہ اپنا نام کو نہیں۔ یہ جمبو نچر کے جمبو نچر بال۔ سر پہ کچھرے ہوئے۔ مگر آنکھیں

خوب بڑی بڑی اور کالی کالی سالی چھپل جب کاجل کی دھار مار لیتی تھی تو اچھے اچھوں کے دیدے ہوائی ہو جاتے تھے۔ حرا ذالیسی کہ اندھیرے احوالے اچھے خالصے چلتے ہوؤں کو چھیڑا کرتی۔ گرمیوں کے دنوں میں نہانے کو بیٹھتی تو غسل خانے میں سے چلاتی۔ ”ہے ہے۔ کیا ٹھنڈا ٹھنڈا پانی ہے۔ میرے انگ پر سے کیسا پھٹ رہا ہے۔“ پھر اکدم چلاتی۔

”ہائے ہائے کیسی گرمی ہو رہی ہے میرے۔“
 باہر بیٹھے ہوئے لوگ ایک دوسرے کو مٹ مٹ دیکھتے۔ اور یہ تو سبھی کو معلوم تھا کہ غسل خانے میں دو ہاتھ لمبی اور دو ہاتھ چوڑی چوکی کونے میں رکھی ہوئی تھی۔ وہ اس لئے تھی کہ غسل خالہ اتنا چھوٹا تھا کہ کپڑے پہننے کو جگہ نہ تھی چوکی کا مہرہ چھٹی تھا کہ لوگ اس پر بیٹھ کر اطمینان سے کپڑے پہنیں۔ مگر وہ اپنی ساڑھی گیلے گیلے بدن پر لپیٹے، کولہ اور شانے ٹسکانی دیے ہی نکل آتی۔

”ادنیٰ۔ ساڑھی کیسے ہانڈھوں جی۔ گس کھانے میں جگہ ہی کتنی

ہے۔“

خالہ بی اس سے پناہ مانگتیں۔ سالی میں دو پیٹ تو گراتی ہی تھی۔ ہزار بار اسے ملازمت سے درخواست کیا گیا مگر آگے سے پھچھوڑے سے، جہاں موقع ملا وہ گھسی اور پھر وہی مستیاں۔
 چھوٹی بیگم نے اس چڑیل کو بھی بلا کر کچھ دن رکھا کہ شاید اس کی یہ بے نکان ادائیگی ہی ان کا دل لوٹ لیں اور یہ کھر ٹوٹ جائے، مگر منیر میاں نے دوسرے ہی کنویں کا پانی پی رکھا تھا۔ گرمیوں کی ایک شام کو جب وہ نہانے کے لئے گھسی تو اکدم چھینے چلانے اور مٹے والے

مچانے لگی۔ ”کیا ٹھنڈا پانی ہے موا۔ ہائے ہائے میری باندھی پر کیسی گدگد ہو رہا ہے۔“ چھوٹی بیگم نے بڑی اثر مان بھری نظروں سے دیکھا کہ شاید پانی میں پتھر جا پڑے اور کچھ ہلچل مچے، مگر وہ تو منبر میاں تھے، بڑی سادگی سے، مگر جھلکا کہ بولے ”یکجوت کو پانی ٹھنڈا الگ رہا ہے تو گرم پانی سے کیوں نہیں نہاتی۔“

چھوٹی بیگم نے کپکپ کپکپ کر دعائیں نہ مانگیں۔
 ”یا مولیٰ! میرے بھائی کے سہرے کے پھول کھلا دے، مسکین شاہ میاں کی درگاہ پر چڑھا دے جاؤنجی، دوسری چادر چڑھاؤنجی پھولونجی الگ، ریشم سی الگ۔“ مگر ان کی یہ آرزو پوری کہاں ہوئی بیچاری کیا کیا نہ کر گزریں۔ کوئی جینیا بھائی ہونا تو ساری تعلیم پر، پارسی پر لٹ مار اپنے ترپتے دل کی التجا پر کھیل ہی اٹھتا، مگر وہ پتھر پھیلنے والا نہ تھا۔ چھوٹی بیگم نے کہیں سن رکھا تھا کہ دین دو لہائے سائیں ہار گجرے کنوارے لڑکے روکیاں مہین بین تو سہرے کے پھول جلدی کھلتے ہیں۔ بس پھر کیا تھا تھا، جہاں محلے ٹوٹے ہیں شادی کی دھومک دھبیاں مچیں نہنے میلاں، ماں کی تحریک پر، باسی پھولوں کے گجرے لئے دوڑے چلے آ رہے ہیں سائیں کی شہ پاکر ماموں کی چھاتی پر دوڑتے۔

”ماموں جان! یہ ہار مہین لونا۔ تم جلدی دو لہے بنو گے۔ اور ماموں جان پہلے پہل نوحہ چڑھایا کرتے۔ جو تا اسٹاکر پیچھے بھاگتے۔ مگر یہ ان دنوں کی بات ہے جب بھرپور رجوانی کا زور تھا۔ اب جو ادھر دھڑھلتی کے دن آئے تو وہ گرمی بھی گئی۔ اب کبھی مٹنے میاں باسی گجرے لا کر دھائی دیتے تو یہ پیرے چینی سے مسکراتے۔“

”ہاں ہاں، تو مجھے دو لہا نہ بلے گا تو کون تنہا ہے گا۔؟ اب بیٹہ۔“
 میری شادی کے دن ہیں سہ۔؟“ وہ اپنی مونچھ کا ایک آدھ سفید
 ہال اٹھا کر اسے دکھاتے۔ ”اب تو میری شادی کے دن ہیں، تو ہی بہن لے
 گجرا۔“ اور وہ مرجھاتے ہوئے پھولوں کا مارنے میاں کی گردن میں ڈال
 دیتے۔

باسی گجر

منے میاں پھر دوپڑے ڈھکے چلے آ رہے تھے۔ ہاتھوں میں
 سفید سفید، مگر چھائے پھولوں کے گجرے، جو رات بھر بیچ پر پڑے
 پڑے اپنی تازگی کو جیسے نہ تھے۔ جانے محلے میں کتنی شادیاں ہوتی
 تھیں کہ منبر میاں کی جان پر یوں آفتیں ٹوٹا کرتیں۔ منبر میاں لوٹے
 سے وضو بناتے بیٹھے تھے، منے میاں نے چاہا کہ ماموں کو دو لہا نہا دیں
 کہ ایک دم یہ پھٹ پڑے۔

”کیوں بے سر کھارہا ہے کیا۔؟“ وہ چڑکھ کر بولے۔ اب آج
 یکم ایک ان کا پارہ چڑھ گیا۔ یوں رکھائی سے تو کبھی نہ بولتے تھے۔
 میاں کا منہ اتر گیا۔ جھوٹی بیگم پلنگ پر پڑی یہ تماشا دیکھ رہی تھیں۔ ان
 کی طرف پھر کر بولے۔

”قسم اللہ کی آپابی، اگر تمہارا لالا اب سے یہ باسی گجرے میرے
 پاس لایا تو میں یہ گھر ہی چھوڑ دوں گا۔“ بات اتنی سنجیدگی سے کہی گئی تھی کہ
 جھوٹی بیگم کانپ گئیں۔ ”اے اللہ نہ کرے تم گھر چھوڑ دو۔ نہیں کرتے، نہ
 کرو شادی، مگر ایسے حسن چلے تو منہ سے نہ نکالو۔ اللہ رکھے میرے سیکے کا

تمہیں تو ایک چرائے ہو، اللہ نہ کرے میں تمہیں جاتا دیکھوں۔
اب کسی نے میاں پھول گجرے لاتے بھی تو خود ہی پہن لیا کرتے۔

رابعہ بیگم

رفیع الدین کا دور آیا تو مہبت ساری بائوں کی پابندی اٹھ گئی۔
گھرانہ تو ایسا تھا کہ یہاں کی بیبیاں ہارہ بارہ برس کے لڑکوں تک سے پردہ
کرتیں۔ مگر رفیع الدین کے دور میں یہ پابندی اٹھتے اٹھتے ختم ہو کر رہ گئی۔ ان
کے بچپن میں جو باتیں محبوب کبھی جانتیں وہی اب کھلے بندوں ہوئے لگیں۔
بھی لگتیں دور ہوئیں تو لباس بھی اس دست برد سے نہ بچا۔ وہ چوڑی دار
پاجامے، آٹے دوپٹے اور چولیاں کرتیاں بھی غائب ہو گئیں اور ان کی
جگہ محض صاف جاموں، زرد لٹے لی۔ اماں کے زمانے میں تو سر سے پلو
بھی کھسکے، آٹے دوپٹے، جامے، گدی کے مارے دم کیوں نہ نکل
جاتا ہو، لیکن اب والی چولیاں پہننے کی فیشن کی ماری نے
ایک طرف سے لے لی کہ سرے سے آستین ہی نہ رہا، اماں نے کیا
پرنگو کر کے لے لی۔ "دیدولی کا پانی تو دھل گیا ہے سجالی
بند گھر سے لے کر دھواؤں لگا گیا کہ بس سارا تماشا دکھ
لو۔" مگر یہ سب نہ تھی۔ چھوٹی بیگم تو پہنتی ہی تھیں، رفیع الدین
نے کسی خاص وجہ سے ان کی پرورش کی تھی۔

"رابعہ تو یہاں سے چلا رہی ہے اب تک۔" مگر وہ جابو
اسی رہ جاتیں۔ رفیع الدین بھی زیادہ کچھ نہ کہتے۔ رابعہ بیگم تو سجالی کی آنکھوں

ساتارہ تھیں، امد ہوتیں بھی کیوں نا۔ اکھوتی بہن ہی تو تھی، ادا اب تو
رند اپنے کے سوگ سے ایسی غم نصیب ہو کر رہ گئی تھی کہ کچھ کہنے سننے کو دل
نہ چاہتا۔ کبھی وہ آدھی بات بھی نہ کہتے کہ جلے دل کی تو ہے، کیا سہی
گھر والے کچھ ہی کہہ لیں، یہ کچھ نہ کہتے۔ ہر بات کی آسانی ان کے لئے ہیا
تھی، ادا اب وہ رہتے سہتے اس گھر کی ہی ہو کر رہ گئیں تھیں۔ جینے کے ان
جوڑے، کرتیاں، چولیاں، پاجامے، کھڑے آڑے دوپٹے۔ ٹھہر گواہی
اکلیاں ساری کی ساری صندوقوں میں بڑی لور ہی تھیں مگر بھولے
بسرے بھی پہننے کے بارے میں نہ سوچا گیا۔ لاکھ لوگوں نے کہا بھی۔

”اے ایسی عمر ہی کیا ہے۔ پہن ڈالو۔ بیوہ ہوئی تو کیا غضب ہو گیا۔
مگر دیکھنے والی آنکھ ہی نہ تھی تو کسے دکھاتی بیچارہ سی پہن کر۔ کئی دنوں
تک تو صندوق کھولی کر بیٹھ جاتی اور ایسی حسرت بھری نظروں سے مگر مگر
”کتنی کہ آنکھیں جھلک اٹھتیں۔ اب تو وقت کے ساتھ ساتھ دل پر
کا بوجھ بھی ہلکا ہو گیا تھا۔ مگر وہ کپڑے جوں کے توں رکھے تھے۔ سہائی نے
چھین مرتبہ تو کہا ہوگا۔ ”بالہ کپڑے پہن کیوں نہیں لیتی۔ رکھے رکھے خراب
ہی تو ہو رہے ہیں۔“ مگر وہ بڑی بڑی آنکھیں جھلک جاتیں اور پھر تو
رفیع الدین کو بھی باراد رہتا کہ مزید کچھ کہہ سکیں۔ اور اب تو ایک زمانہ
گزرا گیا تھا۔ اپنی وہ پھر پور جوانی، جسے وہ لوگوں کی نظروں سے حرام کے پیش
کی طرح چھپاتی پھرتی تھی، آہستہ آہستہ سلام۔ رخصت کہہ رہی تھی۔
سخت سخت مضبوط بدن اب ڈھلک رہا تھا، اعضا میں وہ گٹھا ہوا
پن کہاں باقی رہ گیا تھا۔؟

گیہوں کے گوندھے ہوئے آٹے میں گھٹنے دو گھٹنے بند رکھے رکھے کیا

لوچ پیدا ہو جاتا ہے، وہی لوچ اب راجہ بیگم کے گوشت میں پیدا ہو گیا تھا۔ اپنی جگہ پر نرمی بری نہیں لگتی مگر جوانی کے رنگ روپ کی بات سمجھا کہاں سے کہئے۔ ہ گول گول بازو اب ٹنک سے گئے تھے اور گالوں اور آنکھوں کے کونوں پر لکیر سی پڑتی جا رہی تھیں، جیسے مکڑی جال بننے لگی ہو کالے بدننگ پا جاے اور سفید مٹل کے آڑے دوڑے اور کوتیاں پھٹنے لگی پھٹنے ان کی عمر جیسی اب جب کہ کوئی لاریاں باقی تھانہ آرزو، سبائی لے بری محبت سے کہا۔ راجہ اپنی سبائی کی طرح تو بھی ساڑی کیوں نہیں باندھتی تو راجہ بیگم کے دل کو بھی یہ بات لگ گئی۔ اب کون دیکھنے اور گھورنے والا بیٹھا تھا کہ جانی جرنے کی نوبت آتی۔ اور پھر کام کرتے میں وہ دوپٹہ بھی بار بار اگر تا تھا۔ اور گرمی کے دنوں میں ان تنگ پانچوں میں تو وہ گرمی ہوتی کہ نوب اور مہربان تنگ اتنی ہوتی تھیں کہ اگر کوئی چوٹی گھس ہاتی تو انگلی تنگ گھس نہ گھسی۔ اور یہی اوپر سے کھجائے کھجائے جان مونی آدھ مونی ہو جاتی، مگر کیا مجال جو پا حاتمہ تھنوں سے ندا ہی اور پرہٹ جائے۔

ادریوں زندگی میں پہلی بار جارجٹ کی سفید ساڑی اور جارجٹ ہی کا بلاؤز پہنا تو ایک بار تو خود جھوٹی بیگم بھی انہیں دیکھتی رہ گئیں پہلے بلاؤز میں سے بازوؤں کی سفیدی ایسے چھین رہی تھی کہ محسوس ہوتا تھا اندر بدن میں حرارت اٹھانے ہو رہا ہے جیوں اجالا سٹیا پڑا ہے۔ اس عمر میں بھی کیا صورت تھی۔ گلیا بھولین تھا۔ اور وہ معصومیت اور بھولین قائم بھی کیوں نہ رہتا۔ نہ بال ہوا نہ بچہ۔ ڈالے پھیل لگیں تو لپو دیکھنے میں تو وہ لدی پھندی بڑی پر سہا لگتی ہے مگر جہاں پھیل اترے ایسی شہو منہ اور کھا بڑی ہو جاتی ہے کہ بس۔ تو اس ڈال میں پھیل ہی کب لگے۔

جو یہ نوبت آتی ؛ سفید سفید ساڑی میں پاکیزہ حور سی لگ رہی تھی کہ دیکھنے سے ذہن نہ بھرتی تھی۔ منبر میاں نے بھی انہیں دیکھا، نگریوں، جیسے دیکھا ہی نہ ہو۔ قمیض اچھالتے ہوئے بولے۔

”پچھلی بار دھوبی سارے ٹن توڑ لایا تھا، اب کی بار ذرا احتیاط کیا۔“

منبر میاں کے اپنے دل کی طرح ان کے کپڑے، ان کا سامان، ان کا کرہ بھی کچھ عجیب پھیکا پھیکا اور بے رونق سا تھا۔ عودت کے ہاتھ کی جو گھرداری اور اس کی جو خوبصورتی ہوتی ہے وہ تو جو کر بھی نہ گئی تھی۔ کپڑے دیکھو تو پڑے ہیں ایک دوسرے سے کشتی لڑتے ہوئے تباہیں اوندھی سیدھی، کوئی یوں ایک دوسرے سے لپٹی ہوئی جیسے عید کا معاملہ ہو رہا ہو، کاغذ آڑھے ٹیڑھے پڑھے ہوئے۔ ہر چیز بھری بھرائی۔ رفیع الدین کہتے۔ ”ارے بھائی ان کاموں کے لئے ہونا ہی چاہیے کوئی چاندی، سکھڑی دھن۔ کہو تو کرا دیں تمہاری شادی کسی اچھی جگہ۔“

اور منبر میاں ہنس کر بولتے۔ ”بھائی صاحب! آپ بھی بس خوب ہیں۔ ساری دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے آپ اپنا وظیفہ نہیں چھوڑیں گے۔“ اور حقیقت بھی یہی تھی۔ چھوٹی بیگم تو تھک ہار کر پیپ بیچ گئی تھیں بھولے بڑے بھی نہ بولتیں کہ ”میاں شادی کرو تو گھر جنت بن جائے۔“ مگر منہ بولی تھے کہ انہی ہی الالپے جاتے۔ اور چھوٹی بیگم کے چپ رہ جانے کی بڑی وجہ تو یہ بھی تھی کہ بھائی کی طرف دیکھ ہی رہی تھیں۔ رابعہ بیگم بھی سامنے ہی تھیں۔ عورت کے متعلق تو مشہور ہے کہ ”بسی تو گھسی۔“ ایسی بیس برس کی عسکر ڈھلی، سمجھو گھس گئی عورت۔ اور میاں تو تیس کے بھی اوپر بات چاہتی تھی۔ مگر رفیع الدین اپنے رشتے سے آخر دم تک فائدہ اٹھانا چاہتے تھے جابجا

بھٹ کرتے رہتے، تیر چلاتے رہتے، کون جلنے کب تیر کہاں جا لگے۔
 خالی خول کرے میں دو چار اُچلے سچلے کپڑے دیکھ کر بول اٹھتے۔
 ”ارے میاں مینیر، ان سفید کپڑوں میں جب تک دو ایک رنگ
 بچھڑکی کپڑے نہ دکھائی دیں زندگی کا مزد نہیں آتا۔“ مگر مینیر میاں زندگی
 کے اس سرے کے بارے میں سوچتے ہی کب تھے۔ ”انہیں تو وہی راہوں
 کی زندگی پسند تھی۔ جہاں وہ کتابوں کا کیر ملنے رہتے لے مسے سارا
 کام غفور اہی نمٹا دیتا۔ بہت ہی اہم بات ہوتی تو راہدہ بیگم تک بات
 کی پہنچ ہوتی، ورنہ اس کی بھی حاجت نہ تھی۔“

قصہ ایک رات کا

اگر اس رات غفور، مینیر میاں کے سر ملنے پانی رکھنا نہ بھول جاتا
 تو اس کہانی کا انجام ہی کچھ اور ہوتا۔
 ایک نوگرہی کے دن۔ اس پر سے غصہ کی اس۔ پیاس کے
 مارے دم بھکا پڑتا۔ دن بھر پانی پی کر پیٹ پر بھٹکا را آجاتا مگر پیاس نہ
 بجھتی۔ اور پان کھا کر تو یوں ہی پیاس نہ زیادہ لگتی ہے۔ اس رات مینیر
 میاں دو چار پان کھا گئے تھے اور نیند سے جو ایک دم چونکے تو حلق تھکا
 سوکھا چلا آ رہا تھا۔ نیند سے جاگ کر سر ملنے کی مینیر کی طرف ہاتھ بڑھایا
 کہ حسب معمول مہراچی اور گلاس رکھا ہوگا۔ مگر وہاں تو کچھ بھی نہ تھا پیاس
 سے جزبز تو بھری رہے تھے، دو چار مایہن کی ساکر بولے۔
 ”غفور سے۔ اور غفور سے۔“

نہیں داتا غفور اتنی جلدی کیا جواب دیتا :-
 "اے کجبت سرانے پانی رکھنا بھول گیا۔ اب پیاس لگی ہے تو
 کیا پیوں۔؟ تیری ماں کا دودھ۔ و"
 رفیع الدین اپنی نیند کے ٹوٹنے ہی، ان کی ہائے دل سے پراٹھ بیٹے
 گم مذاق کا موقع کیسے کھوئے۔؟ وہیں اچھے پلنگ پر سے پڑے پڑے
 بولے :- "اے یہاں اس لی ماں کا دودھ کا ہے کو بیو، پانی ہی پیو،
 مگر اس کا بھی ڈھنگ سیکھو۔ شادی کر کے دیکھو بیوی کس طرح ذمہ داری
 سے کام انجام دیتی ہے۔"

منبر میاں جو ملائے بکتے جھکتے اٹھے :- "سہائی صاحب آپ کو
 تو بس مذاق ہی سوچتا ہے۔" اور وہ پیٹھ پر مرنے سے زمانے
 کو چلے۔ کجبت غفور ایسا سو رہا تھا کہ ہلانا تک نہیں۔ رفیع الدین
 نے کرڈٹی اور خیر کرنے لگے۔ چلتے چلتے منبر میاں نے غفور سے کی پیٹی
 میں ایک بھر لڑ لات جمائی، مگر وہ پھر بھی نہ ہلا۔

مگر میوں کے دن۔ ہلکی ہلکی چاندنی، مہنتی ہوئی چپ چاپ سی ہوا۔
 صحن میں پلنگ پڑے ہوئے تھے اور چھوٹی بیگ سوئی ہوئی تھیں۔ ان کے
 ہاتھ والے پلنگ پر منے میاں، اس سے ذرا ہٹ کر ابھ بیگ۔ مگر کسا
 انداز سے :-

منہ سے دانت ہیں درد ستا۔ سہاوج نے کہا :- "اے ذرا سہا
 بھرو، سہا درد غائب ہو جائے گا۔" ۱۔ "راہو بیگ جھجکیں۔
 متی تو نہ تھا ہے ایک طرح سے، مگر منہ سے کچھ نہ بول سکا چھوٹی
 بیگ سہانہ گئیں۔" اسی سہاگہ دان یہ کون کہے گا کہ نگہار کی خاطر

رگائی ہے۔ دوا سمجھ کر نہ لگا لو۔" دانتوں پرستی کی انگلی پھیری تو وہ دانتوں سے موتے ہونے ہونٹوں پر بھی پھیل گئی۔ گورا گورا دھتکے چہرہ، اس میں اودے اودے ہونٹ، بڑی بڑی آنکھیں اور وہ نرم نرم سے مومیا پوٹے جیسے موم سے بنائے گئے ہوں۔ بالوں کی ایک لٹ چاندیسی پیشانی پر آئی ہوئی، جس میں نین چار سفید بال بھی جم چارے تھے۔ ایک ہاتھ سر کے پیچھے سے لاکھنا تھے پڑکا لیا تھا، جیسے نور کے دائرے میں چاند چمک رہا ہو؛ یہ سب کچھ تو تھا ہی۔ سارسی مینے کا اتفاق کہاں ہوا ہوگا رالوہ بیگم کو۔ ایسے اڑ بھنگ پن سے سوئی تھیں کہ سارسی ہنسنے سمیت گھٹنوں کی خبر لے رہی تھی۔

صحن کے ایک طرف کونے میں، نیائی پر میرا حلی اور گلاس رکھا ہوا تھا۔ مینبر میاں کی نگاہ تو یوں ہی پلنگوں کی طرف اٹھ گئی تھی مینبر بھری آدھ کھلی آنکھیں تھیں مگر وہ جیسے جھجکا کر رہ گئے؛ اور جٹ سے ان کی آنکھیں کھل گئیں، جیسے ہری مینبر سے اچانک گھبرا کر اٹھ بیٹھے ہوں۔ ہلکی ہلکی چاندنی میں انہوں نے آنکھیں بھاڑ سپھاڑ کر دیکھا۔ پلنگ کی ٹہنی پر ایک طرف بڑی آہستگی سے رکھی ہوئی پیڈل میچلی کی بیچھ ایسی مچتی ہوئی، جس پر دھلتی عمر کے سائے لرز رہے تھے۔ بالکل آہستگی سے سر اٹھانے وہ پائنتی پہنچ گئے۔ اب کے بہت غور سے دیکھا۔ پیڈل پر بہت ہی ننہنے نرم نرم سے بال تھے، ہوا کا ایک خفیف سا جھونکا آیا اور یہ دوئیں لرز لرز اٹھے۔ مینبر میاں کا دل چاہا ان دوؤں کو ہاتھ سے سہلانا شروع کر دیں۔ ان کی کنٹیاں سن سن کرنے لگیں۔ ایک دم انہیں شدید پیاس کا احساس ہوا۔ بڑھ کر ایک ہی دم سے ساری صراحی گٹ گٹ کوکے

خالی کر ڈالی، مگر ایسا لگ رہا تھا کنواں بھر پانی بسی پالیں تو پیاسے ہی بیٹھا گئے۔

اب کے جھپکتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا۔ مردانے سے خرخر آواز آرہی تھی۔ ادھر مٹے میاں مزے سے سو رہے تھے اور جھوٹی بیگم توسدا کی مسٹر تھیں نیند کی۔ اور پھر راجہ بیگم تھیں جو اپنی اونڈھی سیپی جیسی آنکھیں بند کئے یوں سوئی پڑی تھیں کہ لوگوں کی نیند اڑا کر بھاگ رہی تھی۔

مینر میاں سہمے سہمے آگے بڑھے۔ اب وہ صند لی اور چکنی چکنی پنڈلیاں بالکل ان کی نظروں کے سامنے تھیں۔ پھر وہ وہیں بوڑھے گئے۔ اور بہت دھیرے دھیرے اس صند لی پنڈلی پر اپنی انگلیاں بھرنے لگے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے اپنا چہرہ جھکایا اور چوٹ سے پنڈلی کا بوسہ لے لیا۔

یہیں سی پنڈلی پر ایک سرخ سرخ سادھیا بھرا آیا۔ جیسے دھکتا ہوا انگارہ۔ !

شجر ممنوعہ

پہر دس میں جانے کس کی شادی تھی۔ مسلسل باجے بج رہے تھے۔ کان پری آواز سنا لی نہ دیتی تھی۔ وہ دھوک دھکیا تھی کہ خدا کی پناہ! دو روز سے یہی ہنگامے تھے۔ آج چوتھی تھی۔ شادی کا دوسرا دن۔

مٹے میاں جھومتے جھومتے چلے آ رہے تھے۔ منہ میں پانی اور گلے میں

باسی پھولوں کا یہ اتنا بڑا سا گجرا جوان کے گھنٹوں کو چھوئے لیتا تھا۔
میز میاں سلنے ہی کھڑے تھے۔ منے کو آتا دیکھ کر اسے گود میں اٹھایا
اور مسکرا کر بولے۔

”کیوں بے شادی کا بڑا ارمان ہے! ابھی سوچو تک تو نہیں نکلی
اور شادی کی تمنا میں باسی گجرے گلے میں ڈالے پھرتے ہیں۔ یہ عمر ہے
تیری شادی کرنے کی۔“
اور منے میاں کے گلے سے باسی پھولوں کا گجرا اتار کر میز میاں نے
اپنے گلے میں ڈال لیا۔

تین جنازے

بڑے چچا میاں دیوان خانے سے لٹی کوٹھری سے نکلے تو چچے
چچے گنبدِ اخالہ بھی ان کے کرتے کا دامن کھینچتی نکلیں، بدحواس
اور گھبراہٹ ہوئیں۔

”میں کیا کروں گی حضور، یہ راز چھپا تو نہیں رہیگا۔!“
چچا میاں نے خشمگین آنکھوں سے انہیں دیکھا۔ ”تو ایسی کونسی
عزت والی بی بی ہو تم۔ کون بیٹہ لگ جائے گا۔ تمہارے نام کو۔“ کھٹ
گنبدِ اخالہ کے ہاتھ سے ان کا دامن چھوٹ گیا۔ وہ دہیں چور
پر بیٹھ گئیں۔ ”مجھے کوئی بیٹہ نہیں لگے گا۔“

چچا میاں مسکرائے۔ ”گھر کی لونڈی باندوں کی عزت ہی کیا ہوتی
ہے گنبدِ ابیکم۔ تم خواہ مخواہ انے کو اہمیت دے رہی ہو۔“
گنبدِ اخالہ بھرپور انہیں چار لوگوں میں بوم ہوئی تو میں کھڑے کھڑے
منہ پر تھوک دوڑی۔ کہہ دلائی نواب حیدر کا ہے۔“

”اچھا، یہ بات ہے۔ چچا میاں سلف اٹھے۔“ مگر بوم ہونے ہی
کیوں لگی۔ کیا دیوڑھی والوں کے لئے یہ نئی بات ہے۔ مگر تمہارا یقین
بھی کون کرے گا۔ سینکڑوں حرامی حلالی گھر میں بھرے پڑے ہیں۔ انہیں

چھوڑ کون میرا نام لے گا۔؟“
 ”آئے والے کا تمہارا نام۔ تمہاری شکل پر پرہنگا، تب تو نہ جھٹلا
 سکو گے دینا کو۔“

”تمہارا نہیں بگڑے گا تو تمہاری اولاد کے آگے آئے گا۔ بھری
 جہرات کو، جب چاروں شاہیں ملتی ہیں کھلے آسمان کے نیچے کھڑے ہو کر
 ہاتھ اٹھا اٹھا کر کوسنے دوں گی کہ خدا یا جیسا مجھے بتایا ہے وہی ہی
 بھرے۔“

چچا میاں ایک منٹ تک کھڑے گھورتے رہے، پھر سر ہنچتے ہوئے
 چلے گئے۔

دوپہر کے کھانے پر چچا میاں ایسے چپ چاپ تھے جیسے کسی بہت
 ہی قریبی عزیز کو دفنا کر آئے ہوں۔
 ”بڑی ممانی نے چھیڑا۔“ آج یہ تمہو بڑا کیوں چھو لایا ہے جنابکا !
 ”میرا۔؟ نہیں تو۔“ نواب جید ربو کھلات گئے۔ ”کہاں :-
 ہنس تو رہا ہوں۔“

”ہنس رہے ہو یا رو رہے ہو۔؟ آخر بات کیا ہوئی۔؟ پتہ تو
 چلے کچھ۔“

چچا میاں نے ہاتھ روک لیا۔ ”تم لوگ یقین کیوں نہیں کرتے؟
 کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ ایسے ہی سرد کھڑا ہے۔“ اور انہوں نے ہاتھ دھو
 لئے۔ ان کی پسند کے شامی کباب پڑے سوکتے رہے۔

سب نے ایک دوسرے کو جبر سے دیکھا۔ ڈیڑھ می والوں کے لئے
 اس سے زیادہ عجیب و غریب بات امد کیا ہو سکتی تھی کہ چچا میاں بعیر

کسی وجہ کے یوں اُداس اور چپ ہو جائیں۔
 چچا میاں ڈیوڑھی کی جان تھے۔ گھر کے مالک تھے مگر سب سے
 یوں بے تکلف کہ تپہ نہ چلتا کہ یہی اس ڈیوڑھی کے نواب ہیں ہمیشہ
 ہنسنے ہنسانے سے کام۔ لڑکے، لڑکیاں، شادی شدہ، بغیر شادی شدہ
 نوکر، باندہاں، کوئی بھی توان کے مذاق سے نہ بچتا۔ عورتوں پچاس پچپن یا
 اس سے بھی سوا ہوگی مگر انسی دل لگی کی باتیں ایسی کہ لڑکے بھی شرابا ہیں۔
 ڈیوڑھ میں بڑے۔ ہاں سے لگا ہوا ایک چھوٹا سا کرد تھا جو غار
 کے لئے دھن دھناتا۔ منہ، کے وقت جب پورا گھر ناز پڑھنے جمع ہوتا
 چچا میاں وہاں پہنچ جاتے۔ ایسا موقع تو ہاتھ آتا ہی تھا کہ دو چار
 لڑکیاں غائب رہیں۔ بس ناک کی ڈنڈی میں دم آجاتا۔
 ”زہرہ کد سرگئی؟“ یہ لوربی بی کو کیا ہو گیا، سلیم بی بی کا مزاج
 کیوں بگڑ گیا۔؟“ اور نوا اور انہی میٹھیوں تک کو نہ چھوڑتے۔ نادرہ بیگم
 نے آج نماز کیوں نہیں پڑھی سمجھی؟“ عا برہ تو مجھے کہیں دکھائی نہیں
 دی۔“

نوجوان لڑکیاں شرم سے منہ چھپا لیتیں۔ دوپٹوں کی اوٹ میں
 ہو ہو جاتیں اور چچا میاں مکرانے ہوئے چلے جاتے۔ چلتے چلتے
 مزید ثبوت کے لئے ایک آدو فقرہ ادا کس دیتے۔
 ”زہرہ بیگم چلی جاتیں؟“ تو بے چچا میاں تو بالکل سنبھلائے ہیں۔
 صبح کی نماز میں اگر رفیق میاں، سلیم میاں یا چھوٹے طباطبائی نہ
 نظر آتے تو بس ان کی بیوی کی شادی آجاتی۔ ”یہ لڑکے تپہ نہیں مٹنے کی
 نماز میں کیوں شامل نہیں ہوتے۔؟ زہرہ بیگم ہنہارے میاں کی نماز

قضا ہوئے کا سارا عذاب ہمیں پرٹ پڑے گا۔ شاکرہ بیگم تم اپنے ساتھ سلیم میاں کو بھی گناہگار کرتی ہو۔" انہی دو پہلی ٹوٹی سر پہ جاتے ہوئے کہتے: "اے میاں خدا کے خوف کا بھی کچھ خیال کیا کرو۔"

شاکرہ بیگم سر سے پیر تک چادر تان لیتیں۔ زہرہ بیگم شرم سے لال ہو جاتیں، ادھر چچا میاں چلے جانے تو سر نکال کر شاکرہ بیگم کہنیں "نوب ہے اللہ، کتنے خراب ہیں بھائی جان کسی کا تو خیال کرتے ہوں گے۔ میں تو کٹ کر رہ گئی کسی کی موجودگی کا بھی لحاظ نہیں کرتے۔"

لوندیاں، باندیاں، چھوکریاں، دور دور کر کے کام کرتی تو یہ سب سہ نہ رہتی کہ ازاد بندہ فحشوں کی خبر لے رہا ہے۔ چچا میاں بچکے کے انداز میں بڑی صاف دلی سے کہتے: "رمضان بوا اگر دھچنے کھلاؤ، نہیں تو ابھی ابھی...." کانپ کر وہ کہہ اٹھتیں۔ "میاں بھنارے پیروں پڑتی ہوں، یہ لو ابھی لے لو پیسے۔" اور وہ انہی میلی کھیری تھیلی میں سے پیسے نکال کر دور پھینک دیتی چچا میاں مسکراتے ہوئے پیسے اٹھا لیتے اور انہیں لوٹا دیتے۔

بادرچی خلعے میں چلے جاتے تو گھنٹوں نہ اٹھتے اور نوکر مالک کا فرق نہ سمجھتا۔ مذاق دہاں بھی ختم نہ ہونے۔ کچھ دنوں پہلے یہ خبر پڑے زور شور سے سنی گئی تھی کہ چچا میاں گنبد اخلا کے گورے گورے گھٹنے اور جھکتی ہوئی بند لیاں دیکھ کر وہ گر چنے مانگنا بھی بھول گئے تھے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ انہیں گر چنے مانگنے کی بھی کساں رہ گئی تھی۔ گنبد اخلا جن کے بارے میں مشہور تھا کہ ان کا رنگ انسا سنہری سنہری اور چمکنا برا ہے کہ جس پانی سے وہ منہ دسوتی ہیں

وہ سنہری ہو کر نیچے گرتا ہے۔ اُن کا نام گنبد اسی لئے تو

رکھا گیا تھا کہ وہ گنبد کے کاحرے نہری تھیں۔ نل سے پانی بھرتے وقت جب وہ اپنی شلوار اور پٹی کرتی تھی کہ بھیگ نہ جائے تو ان کی سڈول پٹریاں جن پر نہنے نہنے نہری بال تھے، اتنی خوبصورت نظر آئیں کہ چاہنے والوں کا دل کہہ اٹھا۔ "گنبد عمر بھر پانی بھرتی رہے۔"

اور پھر دی دی زبانوں سے کچھ ایسی باتیں بھی سننے میں آئی تھیں کہ باورچی خانے کے بازو والی کوٹھری میں چچا میاں اکثر گنبد اخالہ سے گرٹ چنے مانگنے جاتے ہیں۔

"آنے والے کا منہارا نام۔"

"منہارا نہیں بگڑے گا تو منہاری اولاد کے سامنے آئے گا۔"
نواب حیدر نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ یہ کسی کی آواز تھی۔
ہشت، کوئی بھی نہ تھا۔

یہ ان کا اپنا وہم تھا جو گنبد کی باتیں دہرا رہا تھا۔ "لا حول لا قوۃ یہ ذرا ذرا سی چھو کر پاں ناحق اتنی بڑی بڑی باتیں کرتی ہیں۔ کل کی چھو کری۔ ابھی ابھی کی تو بات لگتی ہے چاند بی گود میں اٹھائے اٹھائے پھرتی تھی۔ گھر بھر کے بچوں نے اگر گنبد اخالہ کہنا شروع کر دیا تو کیا پس وہ عزت والی ہو گئی ہے تو وہی اٹھارہ برس کی چھو کری۔" انہوں نے اپنے دل کو مطمئن کرنا چاہا، مگر دل کے خوف کو وہ دبا نہ سکے۔

بڑے حضرت کے زمانے میں ساری ڈیلورٹی ماما، لونڈیوں اور باندیوں سے بھری پڑی تھی۔ بہتی گنگا تھی، جو چاہتا مہانا اور سپر پاک کا پاک رہتا کسی کاحال کسی سے چھپا نہ تھا اور۔ بابا اپنی اپنی جگہ پر سمجھتے تھے کہ کسی کو ہاری خبر نہیں۔

سال دو سال میں دو تین واقعے فروا لیے ہو جاتے کہ بی اماں کو۔
 "تو کہ خلتے" میں جانا پڑتا۔ دائی آتی، چھپیں بلنہ موتیں، سپر خے منے سے
 بچے کے رونے کی آواز اور بی اماں مطمئن ہو کر اپنے تخت پر آ بیٹھتیں اپنے
 مخصوص لیج میں لیکچر شروع کر دیتیں۔

"حرام زادے، مافی طے اپنا کام کر کے چلتے نہیں، ذاکا دکھیں
 نہ چھپا۔ کوئی پوچھے ان سے تمہاری بیویاں مر گئی ہیں جو لونڈیوں کے بستر
 گرم کرتے ہیں جاجکے۔" پھر ان کا لہجہ بدل جاتا۔ "مگر سارا قصور ان
 چھٹا لوں کا ہے۔ جان بوجھ کر اپنے پیچھے دھکڑے لگا لینی ہیں، اور وقت
 آپڑنے پر چلا چلا کر آفتیں مچاتی ہیں۔"

اور یہ ہمیشہ کا معمول تھا۔ یونہی تھوڑی بہت ہائے ولے ہوتی
 اور سکون چھا جاتا پانی میں تھیر ٹپ۔ جی تو ایسی کتنی دیر لمبلی چمے گی؟
 ڈبک کے آواز کھلے گی، سبلے آھیں گے، اور جب تک کہ تھیر تہہ میں جا
 بیٹھے اور پر کی سلج ایسی پرسکون، جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

مگر یہ تھیں بی اماں اور بڑے حضرت کے زمانے کی باتیں۔ اب تو
 کمین ماما میں اور لونڈیاں بھی ایسی شیر ہو گئی تھیں کہ بات بے بات
 عزت پکار لے لگتیں، گیند لانے جس حوصلے اور عزم سے انہیں بدنام
 کر دینے اور بدعائدہ دینے کی تھکان لی تھی اس سے لڑا اب حیدر خوف آہ
 سے ہو گئے تھے۔ انہی بدنامی کے خیال سے زیادہ انہیں یہ بات پریشان
 کر رہی تھی کہ ان کی اپنی بیٹیوں کے کان پر یہ بات گئی تو وہ کیا اثر لیں
 گی۔ وہ بھی اس صورت میں جب کہ چلتے اڑتے کوئی پیام ہی نہ تھے
 ان کے نصیبوں کے۔ اور یہ بات تو کبھی نہ کبھی سچوٹنی ہی تھی۔

انہی ٹہری بھری دنیا میں کوئی تو ایسا نہ تھا جس کی نظر انتخابِ نادرہ بیگم پر پڑ جاتی اور ماں باپ کا بوجھ ہلکا ہو جاتا۔ تین تین سیانی بیٹیاں اور لڑکوں کا یہ کال! چھوٹے ماموں ہاتھ چہ چلا کر لیکچر جھاڑتے۔ "اجی جناب لڑکیوں کو بھارت مت رکھیے۔ شرافت قائم رہے گی جب تک رہیں گی، اور سچرا لیا دھوکا ہو گا آپ لوگوں کو کر لیں ٹاپتے رہ جائیں گے۔ مگر میں تو کہتا ہوں اچھا ہے۔ آپ لوگوں کو ایسا سبقت ملنا چاہیے۔ کوئی لڑکی سہاگ جائے کسی کے ساتھ، سچرا نکمیں کھلیں گی آپ کی، اور لڑکیوں کو بٹھائے رکھنے کا پورا مزہ آئیگا۔ ارے میاں ان کی زبان چپ ہے۔ آنکھیں تو بولتی ہیں۔ نادرہ بیگم، صابرہ بیگم کے قدم بیکے بیکے پر لگے ہیں۔ ہاں، آج آپ جانیں۔ آپ کا ہاتھ ٹوٹے گا۔ آپ کے گلے میں بندھے گا۔ ہمارا آیا ہے۔"

شاہجہاں بیگم چپ چاپ سنبھلتی اور سچند سی سالیں بھر نیا۔

"تم سمجھتے ہو ہم لڑکیوں کا مرہ بنانے والے ہیں۔ دھیر، چار

کوئی بھی پلٹے نہ بنا۔ میں تو آج ان کے منڈ کے ہلا دوں۔"

چھوٹے ماموں غصے سے جھج پڑنے۔ "پتیاموں کو منٹ روڈ آ پا

جان۔ تم تو شکر میں کے کنکر چنے لگتی ہو۔ ہزار لو آئے ہوں گے محل سیرا

والی بیگم اپنے بیٹے کا پیام لے کر آئیں تو تم نے یہ نہیں کہہ دیا تھا کہ لڑکا

ناک میں سے بولتا ہے۔ ارے ناک سے بولنے والے کو داماد بنا لیا جائے

مگر بٹھاؤ، میں کیوں جان کر ہاؤں۔ بدنامی ہو گی پورے خاندان کی

نہارے نواب جید کو منہسی مذاق سے مارتوں سے اور گر چنے کھانے سے

تو فرصت ملے۔"

انداز پا جان ہے دقوں کی طرح ان کا منہ تاکتیں۔
 "میں کہتی ہوں کچھ فکر بھی ہے تمہیں، دو دو بیٹیاں سیلی ہو گئی ہیں۔
 ہزاروں پیام آتے ہیں مگر تم کسی زوجہ ہی نہیں دیتے۔ کیا اسی عمر میں
 رکھنے کا ارادہ ہے۔ و سفید بال جہاں کر بیٹیاں بیاہنا۔ میری تو جان
 عذاب میں ہے مولیٰ۔ ہائے اللہ، کیا ہو گا۔ میری بیٹیوں کا؟" شاہجہاں
 بیگم چھالیہ کاٹتے کاٹتے بڑبڑا رہی تھیں۔
 "ارے بیگم، تمہیں تو سارا دن شادیوں کی ہی بڑی رہتی ہے۔
 ایسی کو سنسی بڑی ہو گئی ہیں، ہماری بیٹیاں۔ صابرہ تو بالکل گرو یا سی لگتی
 ہے ابھی۔"

"ارے تمہیں کیوں نہ لگیں گی چھوٹی چھوٹی گڑیاں۔ ہمارے ماں
 باپ نے ہمیں تو تیرہویں سال ہی بیاہ دیا تھا، یہاں تو بیسی بھی ڈھلی
 جا رہی ہے۔"
 "بیگم وہ زمانہ اور تھا، یہ زمانہ اور ہے۔ اس زمانے میں لڑکیوں
 کی شادی اتنی جلد نہیں کرتا تھا، ان کے نازک کندھے اس بوجھ
 کے متحمل نہیں ہو سکتے۔"

"تمہاری امہنی باتوں سے تو میرے آگ لگ جاتی ہے۔ ہماری
 بھی تو شادی ہوئی کتنی کبھی۔ ہمارے کندھوں میں ایسا کہاں کا درد آگیا
 تھا۔ ہمارے بھی کندھے نازک تھے۔ اس گھر میں آئے تیس بیس سال
 ہوئے ہیں، بتاؤ کبھی ساس سسر کو یا تم کو شکایت کا موقع دیا۔؟"
 "لا حول ولا قوۃ۔ جی یہ کب کہہ رہی ہوں کہ تم مافرا تیر وار ہو یا
 بیوی ثابت ہوئی ہو، میرا کتنا صرف اتنا ہے کہ ابھی سے کیا جلد کا ہے۔"

شاہجہاں بیگم جبر کی اسٹیں ۔

”پھر وہی جلدی۔ اے یہ جلدی ہے؟ عمر میں تو دیکھو اور پھر
جائداد کا وہ حال ہے کہ آمدنی گھٹتے گھٹتے پاؤں رہ گئی ہے۔ لڑکیاں ہیں کہ
ٹاٹ کے جھاڑ کی طرح بڑھتی ہی چلی جاتی ہیں۔ بل ہی تو صمد کی ماں آئی تو
کہہ رہی تھی۔ اے بی، کب تک لڑکیوں کو گھر بھرا کھوگی۔؟ یہی دن تو شادی
بیاہ کے ہوتے ہیں۔ بچی عمر میں شادی کر لے سے چپروں پر سخنا وا آجاتا ہے۔
کیا کہوں، میں تو بس کٹ کر رہ گئی۔ بڑے صاحب زادے کے ڈھنگ تو دیکھ
ہی رہے ہو۔ آنکھیں بند ہو جائیں گی۔ تو گھر میں جھانکیں گے سچی منہیں۔ آگے
تم جانو نہہرا کام۔ میں عورت ذات کیا کر سکتی ہوں تمہاری مرضی کے آگے؟“
اور شاہجہاں بیگم نے زور سے پانڈاں بند کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد
پھر بڑبڑانا شروع کر دیا۔

”پیغام بھی اجاڑ لیے کون سے ہزاروں ہزاروں کے ہیں تین
ہی تو پیام سامنے ہیں۔ نواب جعفر مرزا کا چھوٹا بیٹا، جو دسویں بیٹا پاپاس
ہو گیا ہے۔ اس کی نسبت نادرہ کو آئی ہے۔ اور چھوٹی آپا کے بڑے بیٹے
کو صاحبہ کو مانگتے ہیں۔ میں تو کہتی ہوں ہاں کر دو سہلا کیا برائی ہے۔؟
سامنے کے لڑکے ایسے ہی برے دھتے ہیں۔ ہاتھ سے چلے جائیں گے تو آنکھیں
کھلیں گی۔ اور وہ مورا لہو کا بیٹا تو یونہی سا ہے، مجھے نہیں سہانا۔ تم تو
کبھی پوچھنا چھو کرنا سہانے ہی نہیں۔“

نواب صاحبہ نے ناس کی ڈبیہ اچکن کی جیب میں رکھی، اٹھتے
ہوئے بولے۔ ”کبھی تو ٹھیک ہو، میں غور کرونگا۔“
نواب جیدر پوٹو لڑکے رئیس تھے۔ جھوٹ سچ کا حال تو خدا ہی

کو بہتر معلوم ہے، مگر سنتے ہیں کہ ان کے گوشت اٹھانے والے ٹھیکرے بھی
 سونے چاندی کے تھے۔ انہی بڑی بڑی جاگیر بہا نصیب کے ان کی آمدنی لاکھوں
 کروڑوں تک جاتی تھی۔ وہی دولت سننے کو آباد اجداد سے لیکر اب تک چلی
 آرہی تھی۔ مگر جب ایک برسے دن سد انہیں رہنے والے اچھے دن بھی ہمیشہ
 نہیں رہتے۔ بہار کا دور ختم ہوا، خزاں آئی۔ اور خزاں بھی آئی تو ایسی
 کہ سوکھے پتے بھی باقی نہ رہے۔ اب تو اب حیدر کی صرف دکھاوے کی شا
 باقی تھی۔ دسہ بوں تو ان کی حیثیت بالکل تنہا ہو چکی تھی۔ مگر ٹپ ٹپ
 اور نوابی ٹھکانے وہی تھے۔ رسی تو کبھی کی جل چکی تھی۔ مگر بل جوں کا توں
 باقی تھا۔ اگر تن تنہا ہونے تو شاید گزر بھی جاتی مگر ماشاء اللہ تین لڑکیوں اور
 دو لڑکوں کے باپ تھے ایک بیوی کے شوہر اور پھر دنیا داری رہی وہ الگ
 دو بیٹیاں شادی کے قابل ہو چکی تھیں۔ چھوٹی بیٹی ہمیشہ بھی ایسی
 چھوٹی تو نہ تھی۔ مگر نادرہ بیگم اور صاحبہ بیگم کے سامنے اس کی اہمیت کو
 نظر انداز کر دینا ہی پڑتا ہے۔ بڑا بیٹا بالکل آوارہ تھا۔ لوگ کہتے کہ اپنے
 دادا کے نقش قدم پر چل رہا ہے۔ چھوٹا نوچھ سات سال کا کھانا
 شاہجہاں بیگم اس ڈیوڑھی میں نواب کی بیگم اور نواب کی بیوی بن کر
 آئی تھیں۔ شادی کے بعد پندرہ بیس سال تو بڑے اچھے گزرے مگر اور
 کچھ سالوں سے سسرال کی حالت بالکل تنہا دیکھ رہی تھیں۔ اور اب سب
 سے بڑی بات یہ کہ وہ بیوی نہیں رہی تھیں۔ بلکہ اس ڈیوڑھی کی بیگم تھیں۔
 اور برسے سچلے ان ہی کو سارے انتظامات انجام دینے پڑتے۔ شاہجہاں
 بیگم انہی جاگہ سمجھتی کہ نواب حیدر لڑکیوں کی طرف سے بالکل لاپرواہ
 ہیں۔ لیکن حقیقت کچھ اور تھی۔ نواب حیدر ان رات اسی فکر میں تھے

جاتے۔ اپنی فکروں اور پریشانیوں پر انہوں نے بناوٹی خوشی کا پردہ ڈال رکھا تھا۔ وہ اپنے غموں اور فکروں سے نجات پانے کے لئے سدا بہتے رہتے۔ نوکروں، اماؤں۔ بھائی بندوں سے بیہودہ مذاق کرتے رہتے۔ کوئی بات نہ تھی کہ سچین سال کے بوڑھے نواب، جوانی میں بھی ہنسوڑ نہ رہے تھے۔ بیکابی کیلئے کھلنے ڈرے بن کر رہ گئے ہیں۔ نواب حیدر اپنی پریشانیاں بیگم کے سامنے ظاہر نہ کر سکتے اور انہوں نے مسکراہٹ اور خوشی کی جودبیز چادر اوڑھ لی تھی وہ اتنی موٹی تھی کہ اس میں سے کبھی پریشانی نہ جھلک سکی۔

مگر آج کی باتوں نے نواب حیدر کی فکر میں کئی گنا اضافہ کر دیا۔ وہ سوچ رہے تھے: "بیگم کتنی ہیں میں پوچھ لگے نہیں کرتا۔ مگر جعفر کے چھوٹے بیٹے کو کون نہیں جانتا؟ زمانے بھر کے عیب اس میں موجود ہیں۔ پھر بھی بیگم کا یہ کہنا ہے کہ ہاں کر دو۔ اور وہ بیگم کی چھوٹی آپا کا بڑا بیٹا۔ آج تھو۔ نواب حیدر نے ٹپاخ سے دیوار پر تھوک دیا۔ ایسی منہوس صورت ہے کہ صبح دیکھ کر تو وہ بھر کھانا نہ ملے۔ روکوں کا کال، جائداد کا وہ حال۔ اور روکیوں کا آکاس سبیل کی طرح چڑھتے ہی چلے جانا، نواب حیدر سرخا کر رہ گئے۔ اور انہیں اپنے دادا ابا دادا گئے جو اپنی بار سالہ بیٹی کلثوم بیگم یعنی نواب حیدر کی بیوی کے ہارے ہیں کہا کرتے تھے: "جوان بیٹی اور مردے کو بھانا آپ ہی مات ہے۔" مطلب یہ ہے کہ میرے گھر بھی دو جنازے پڑے ہوئے ہیں اور پھر تم میرا جنازہ بھی۔ میرے خدا! میں انہیں کیوں کر دھناؤں؟ اور نواب حیدر نے گہرا کر آنکھیں بند کر لیں اور تکیہ پر سر رکھ دیا۔

"کیوں جی۔ رشکوں کو بلایا ملا۔؟ پسند آئے۔؟" شاہجہاں بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

مگر جواب میں تو اب جلد نہیں مسکرائے جھاؤ نگہ سے ٹھکے ہوئے مسافر کی طرح ٹیک دکھا کر بیٹھ گئے۔ "تمہارا ہی قصہ پر ہلانا پڑا سنا۔ دور دورہ بیوقوفانہ لوندوں کو اچھی طرح سمجھنا سنا۔"

"ہائے تو کیا نہیں دونوں میں سے ایک بھی پسند نہ آیا۔ کم از کم جھل کے بیٹے کو ہی پسند کر لیتے۔ نادرہ تو اسٹے جاتی۔ اب تو وہ بھی تمہیں کی ہوتی ہے۔"

"نادرہ تو اسٹے جاتی۔! تو اب جلد وچر کر بسے۔" تو کیا نادرہ کوئی دوجہ ہے کہ اسٹا جینیٹکوں۔ اسٹا نالائق کو دیکھا بھی ہے نہ کہ میں اسٹا زبانا اور تالوسے لگا دی۔ اور وہ تمہاری چھوٹی آپا کا بیٹا جس کی تعریف میں تم زمین آسمان کے قلابے ملائی ہو۔ ہزار بار یہاں آپکے۔ اسے کیا دیکھتا۔ بے بودہ کہیں کا۔ جگہ جگہ معاشقے لڑاتا پھرتا ہے۔ غنایت بیگم نے کن اسے نہیں جاننے کے کوئی سے اترنے دیکھا۔ پتہ نہیں تمہارا عقل کہ حیرت ہو کر رہ گئی ہے۔"

شاہجہاں بیگم اس انکشاف پر سر پکڑ کر رہ گئیں۔

کہتے ہیں بیٹی پہلے پڑوس میں جو ان ہوتی ہے۔ لڑکی ذرا بیانی ہوتی کہ پاس پڑوس والوں نے تو گنا شروع کیا۔

"اے بی لڑکی بیانی ہو گئی ہے۔ کہا تمک ٹھاؤ گی۔"

لڑکی کو کہاں دیا مہین۔؟ اب تو خاصے ہاتھ سے رکھ لے ہیں اس نے۔

"اپنی رکھیاں چاہے آپ پہاڑ ہو رہی ہوں مگر دوسروں کی چھوٹی چھوٹی بیٹیاں بھی اپنی رشکیوں سے بڑی نظر آتی ہیں۔ تو بسے، کوئی دبی

زبان سے کہتے ہوئے بھی ڈرے اور کوئی ڈنکے کی چوٹ کہہ کر بھی یوں اکڑا دکھائے
گویا لڑکی کی شادی کر دینے کا فرض یا دولا کر بڑا احسان کر دیا ہے غریب
لڑکی کی ماں پر۔

ڈیوڑھی میں حیدر آباد کی ایک ماما تھی۔ منہ چڑھی اور بات بے بات

بیچ میں دخل دینے والی۔

”ابو پاشا۔ اسمٰعیلی صاحبزادی کو اٹھا دیو نا اب تو۔ کل ماشٹر صاحب
کے سنگات مہنس بول لے رہا تھے انوں۔ عورت بچیاں کو کھائے کو تو بھی سمجھا
کو رکھے گے ماں۔ اس دخت تک تو باتھاں پیلے کر چ دینا۔“

شا بچیاں بیگم کا منہ لٹک گیا۔ سارا خون جتنا ہوا محسوس ہوا
دوسرے دن ہی سے تار سکھانے والا ماسٹر درخواست کر دیا گیا اور تار
کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے گئے۔ اور شا بچیاں بیگم کو اپنے بھائی کی بات
یاد آئی۔ ”لڑکیاں تمہارا کھنے کا مزاج آئیگا۔ جب صباگ جائے ایک
آدمہ لڑکی منہ پر کالک تنوہا کر آپ کے۔!“

ناورد بیگم جو مبکیں تو سب کے ہاتھ پر ہی ٹھنڈے پڑ گئے۔ کہاں
وہ جمکی جمکی شرمیلی آنکھیں اور کہاں پہلے ہوئے بین بیٹھے بیٹھے اچانک
ہی صابرہ بیگم سے بول اٹھیں۔

”تو اپنے دلہا بھائی سے مہندی لگائی کیا لے گی۔ ہر گز دیکھ، تو بھی
ستا نہ چھوڑنا انہیں گھڑی یا فوشین پین لینا، ورنہ وہ تو بس اپنے
رشتے سے فائدہ اٹھا کر تجھے مرغی پکڑاتے بھی نہ چوکیں۔“

صابرہ بیگم کو چھینیں مارا کہ اپنے اماں ابا کو جمع کر لینے کے سوا
کچھ نہ سوچا۔

نواب حیدر اور شاہجہاں بیگم دم سادھ کر رہ گئے۔ نادر دہلیم کھلے آسمان کو یوں ٹکڑ ٹکڑ تاکتی پڑی تھیں جیسے وہاں سے کسی بلاؤے کی منتظر ہوں۔ مگر یہ بات سخی چند دن پہلے کی اب جب سے اس نے پرانا سنا کہ دونوں پیام ناپسند کر دیئے گئے ہیں۔ وہ ڈبھڑھکی سخی۔ بھیجی بھی سی رہتی۔ پیاری صورت پر کیسی ہر لڑکی ادا اسی چھا کر رہ گئی کہ ماں کا دل کٹا جانا۔

اور ایک دن تو اس نے بڑے انتہام سے سر پر پلو اڑھا، ہاتھوں سے بال برابر کئے اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی دیوان خلتے میں آ گئی، جہاں حیدر نواب انہی بیگم سے پیاسوں کے بارے میں بات چیت کر رہے تھے۔ نادرہ کو آنا دیکھ کر انہوں نے زبان بند کر لی۔

”ابا حضور!“ اس نے ستر ستراتی آواز سے کہا۔

”کیا ہے بیٹی۔“ نواب صاحب نے اس کے سر پر بڑے پیار

سے ہاتھ رکھ دیا۔

”جی، میں یہ کہنے کو آئی ہوں۔“ وہ تنھوڑی دیر چپا رہی۔ پھر صاف صاف بولنے لگی۔ ”میں کہتی ہوں کہ آپ لوگ میری شادی کی فکر نہ کر کے اگر صابرہ کی فکر کریں تو بہتر ہے۔ کیونکہ میری عمر.....“ اس نے سر سے پلو ہٹایا، کان کے پیچھے سے ایک لٹ کھینچی اور نواب صاحب کو دکھا کر بولی۔ ”یہ دیکھیے اس لٹ میں کتنے سفید بال ہیں۔“

نواب حیدر، جو بڑے چامیاں کے نام سے ڈیوڑھی بھر بیٹھا مشہور تھے۔ بڑے سنسور، بڑے دل لگی باز، ادھر کچھ دلوں سے ایسے سفید رہے تھے، ایسے بدل کر رہ گئے تھے کہ سو چٹا پٹ ناٹھا کہ یہ وہی نواب ہیں یا ان

بگڑی ہوئی دوسری شکل ہے۔ "نوکر خانے" میں جانا تو چھوٹ ہی گیا تھا۔ مگر وہ یہ فرد رشتے تھے کہ گنبد ہاتھ اٹھا اٹھا کر کوستی ہے۔

"حبیب میرا برا کیل ہے دلیا اللہ تیری جوان بیٹیوں کو بھی نہیں چھوڑے گا۔" گنبد دیکھنے میں جتنی چھیل اور شریر نظر آتی۔ حقیقتاً ویسی سخی نہیں۔ وہ تو جمیل میاں کی دلہن بننے کے خواب دیکھا کرتی تھی۔ جو بابے تاشے لے کر آئے اور اسے اپنے گھر کی رانی بنالے جاتے۔ جمیل میاں بڑی بیگم کے دور کے رشتوں سے مستحیج لگتے تھے۔ انہوں نے ایک بار گنبد اخالہ کو پانی بدھرتے دیکھ لیا تھا جب کہ وہ بالٹی اٹھائے چمکتی۔ شمعکتی دوڑ دوڑ کر مشکوں میں پانی ڈال رہی تھیں۔ شلوار گھٹنوں تک چڑھی ہوئی تھی۔ بالٹے سے پانی چھلکتا اور ان کی سنہری پنڈلیوں پر جم جاتا۔ سنہرے اور نیچے اور موتی! قدم اٹھاتے ہی وہ موتی پیروں میں گر کر ٹوٹ جاتے پھر بانٹی کا پانی چھلکتا اور پھر سنہرے سنہرے موتی رلنے لگتے۔

جمیل میاں کو یہ سب کچھ اتنا اچھا لگا تھا کہ ان کا دل ہمیشہ کے لئے ان کی پنڈلیاں عریاں ہو جائیں۔ انہوں نے بڑی بیباکی سے گنبد اخالہ سے کہا تھا۔ "گنبد امیری دلہن بنو گی۔" گنبد اخلاذ شرمائی گئی تھیں۔ مگر انہیں کچھ دن بعد تہہ پہلا کہ جمیل میاں نوکر خانے کی ہر چیز گری کو یہی جملہ کہتے ہیں۔ توان کی آنکھیں سہیج گئی تھیں۔ سنہرے موتی ان کے گالوں پر بھیچنے لگے تھے۔ اور پھر وہ تو محض ایک اتفاق تھا کہ بڑے چچا میاں نے ہاتھوں جمبورا "گرڈھنے" دینے ہی پڑ گئے۔ مگر ان کے دل سے لال لال کپڑے پہن کر دلہن بن جانے کی خواہش فنا کب ہوئی تھی۔

نوکر خانے میں آج کل بڑی گہما گہمی رہتی۔ گھانا کھالے میں گیندا خالہ برابر منہ بنائیں تو کوئی نہ کوئی بے اڑتا، ڈبوڑھی میں تو یہ بات ہاتھ کی عام سختی بغیر دھول بجے کے، بغیر چڑھاوے کے راتوں کی تاریکیوں میں دلہنیں سجدتیں، شادیاں ہونٹیں اور بغیر کسی اہتمام کے بچے جنے جاتے مگر گیندا خالہ اپنے آپ میں کہنے جاتیں۔ مومن علی ہاتھ مٹکا مٹکا کر مکر لچکا لچکا کر گاتے۔

”سیاں نے دل بے گئے لال بٹوے میں“

منہسی کے فوارے چوٹ جاتے اور گیندا خالہ کالس نہ چلتا کر مومن علی کا منہ نوچ لیتیں۔

اگر لال بٹوے میں دل چلا جاتا تو کون سی ایسی آفت آجاتی۔ مگر دل تو سلامت تھا۔ لال لال بٹوے میں عزت اور وہ دلہنیں ہنسنے والی خواہش ضرور چلی گئی تھی۔ گیندا خالہ گھور کر مومن علی کو دیکھتیں وہ ناگ پرائنگلی وکھو کر بڑے نخرے سے چلاتے۔ ”اوئی ماں بہرے کو مت گھورہ، میں تو مر جاؤں گی مارے ڈر کے۔“

نوکر خانے کے روح رواں ننھے مومن علی کوئی انہیں برا نہ کہتا۔ ان کی ذات سے کسی کو خطرہ نہ تھا۔ گیندا خالہ کالیوں پر اتر آتیں تو وہ ڈر کر مہین آواز سے گاتے چلے جاتے۔

”آوئی کیا میرا ایرنگ چکنا وہ سبھی آدھی رات کو۔“

مومن علی کے ایرنگ آدھی رات کو چمکتے نہ چمکتے، مگر گیندا خالہ کے آنسو غور راتوں میں تاروں کی مانند چمکاتے۔

بڑے چچا میاں صبح کی نازوں سے غائب رہنے لگے تو سلیم میاں

با جھوٹے حافی کو یہ کہنے تک کی بہن نہ ٹہری کہ "چچا میاں گرمی کے ہی دن تو رہیں، پانی ایسا ٹھنڈا بھی نہیں ہے۔ آخر آپ نماز پڑھا کر لئے پر کیوں تل گئے ہیں۔"

رڈ کیوں کسی پوری پلٹن بھی اگر مغرب کی نماز کے وقت غائب رہتی تو چچا میاں نہ پوچھتے کہ "نہرہ کہہ چلی گئی، خود بی بی نے آج نماز کیوں نہیں پڑھی؟" میرا قرآن شریف میرا ہی ہے۔ نادرہ بی بی اسٹا تو لاؤ ذرا۔"

شاگرد بیگم بغیر کسی ڈر کے نو بیجہ تک دروازہ بند کر کے سوئی ٹہری رہیں۔ نہرہ بیگم تو خود ہی زچہ خانہ میں پڑی ہوئی تھیں ان کے چالیس دن پورے ہوئے ہیں ابھی بڑا وقفہ تھا۔ زچہ خانے میں نہ ہر نہیں تبا بھی برے چچا میاں ان سے کچھ نہ پوچھتے۔

نادرہ بیگم نے تو سفید مالوں کی لٹ دکھا کر ماں باپ کو بے فکر کر دیا تھا۔ مگر صاحبہ اور سمیرہ دن بھر کہہ کر دے لگائیں اور شا جھان بیگم کا دل دھلایا کرتیں۔ نادرہ میں تو اب ایسا سنجیدہ بن آگیا تھا کہ بوڑھوں کی طرح صاحبہ اور سمیرہ کے لئے لیتی۔

ایک دن سمیرہ اسکول سے لوٹی تو نواب صاحبہ دلوان خانے میں بیٹھیں تھیں۔ قدموں کی چاپ سن کر سر اٹھا کر سمیرہ کو دیکھا اور دیکھتے ہی رہ گئے وہ گھبرا اٹھے۔

اب تک وہ سمیرہ کو ایک منی گویا سمجھتے آتے تھے۔ مگر آج انہیں اچانک یہ خیال اک دم بدل دیا تھا۔ کتابیں منہ ہاتھ لیتی۔ جھومتی گنگنائی وہ اندر چلی گئی تو نواب حیدر اپنی بیگم سے بول اٹھے۔ "بیگم یہ سمیرہ اتنی

ڈری کب سے ہو گئی۔“

شا بیجاں بیگم چڑ گئیں۔ دہانے ہوئے ہو۔ چڑھتی بیل ہے۔

کھانے کھیلنے کے دن ہیں۔ نظر کیوں لگاتے ہو۔“

”بیگم۔“ نواب حیدر بے بسی سے بولے۔ ”دادا ابا کہتے تھے کہ

جوان بٹی کو بٹھا رکھنا اور مردے کو زندہ قفل کرنا ایک ہی بات ہے۔“

بیگم نواب حیدر کا منہ نکلتی رہیں۔

”میں سمجھتا تھا کہ میرے گھر میں دو جنازے ہیں۔ مگر آج معلوم ہوا

کہ مجھے تین مردے کاٹنے ہیں۔“ بیگم۔ تین جنازے! اب تک تو دو ہی

تھے۔ مگر یہ نفیسرا.....“

”کیا ہو گیا ہے متنبیں۔“ کیسے جنازے۔ کس کی میتیں۔ کیا

بک رہے ہو۔“

”نہیں سمجھتیں۔“ ارے بیگم سمیرہ ہے نفیسرا جنازہ۔ بیگم ماٹھ

صابرہ۔ سمیرہ۔ بیٹیاں نہیں ہیں اپنی، یہ لاشیں ہیں تین! یہ تین

جنازے ہیں۔“ اور وہ زور زور سے ہنسنے لگے۔ ”دیکھو یہ نفیسرا

جنازہ چلا آ رہا ہے۔“ بیگم نے گھبرا کر سر اٹھایا تو سمیرہ جھومتی جھاسکتی

چلی آ رہی تھی۔

وہ سر کپکپ کر رہ گئیں۔

معلوم نہیں کس وضع کا اسکول تھا صابرہ بیگم کا۔ آئے دن

جلے، پارٹیاں ہوتیں۔ رات بے رات ٹوٹا ان کا معمول تھا۔ ڈیوڑھی

کی حالت کسی سے چھپی ڈھکی توستی نہیں۔ مگر صابرہ بیگم کا یہ معمول تھا

کہ ایک سے ایک بڑھیا ساڑی پہن کر اسکول جاتیں۔ جھوٹے ناموں

تڑپ تڑپ کر آپا جان کو سمجھاتے۔
 ”دیکھو آپا جان اتنی دھیل نہ چھوڑو۔ کسی نے پیچ ڈال دیا تو
 سنا گا لپٹا بھی نہ سوچے گا جلدی میں۔“

گیندا خاں کا پیٹ چھ آنے میں ملنے والے ٹکے اتنا بڑا ہو گیا۔ مگر
 کسی نے بیک پوچھنے کی زحمت گوارا نہ کی کہ ”اسے بی ایہ کس کا تحفہ ہے؟“
 اتنی بڑی ڈیوڑھی، ہزاروں کپڑا ناچانا۔ مالی نہ بولی۔ حلالی حرامی۔ کس کو
 نور وک ٹوکی نہ تھی۔ پھر کس کا سر پھرا تھا جو پوچھتا چھ کرتا۔
 مگر بڑے چچا کی ساری بناوٹی ہڈی اور خوش مزاجی رخصت
 ہو گئی۔ گیندا خاں نے ہاتھ اٹھا اٹھا کر جو کسے ان کی بیٹیوں کو دیئے تھے۔
 وہ سہلانے کی چیز تھیں۔ ہمارے بیگ ڈیوڑھی ہو رہی تھیں۔ صابروہ بیگ
 پر ہرے نکال رہی تھیں۔ صابروہ کد کدے دکاتی اور بچے آم کی طرح شاخ
 سے چپکے کو ہور ہی تھی۔ اگر کوئی اونچ نیچ ہو گئی تو! انہیں بار بار خیال
 آتا کہ یہ ساری گیندا کی ہائے پڑی ہے ان پر۔ اس کی آپن جھماکے نہ رکھ
 دیں سارے گھرانے کو۔

گیندا خاں نے کوسنے دینے بند نہیں کئے تھے۔ ”نوکر خانے۔“
 بیاد ہی دھما چوڑی مچتی، وہی ہنگامے برپا رہتے۔ مومن علی ابابھی
 لپک لپک، ٹسک ٹسک کرتا۔

”موٹر کی پول پول برسی جی

زہرہ زچہ خلتے میں تھیں اور ان کے میاں کے کھانے پینے کی بڑی
 خرابی ہو رہی تھی۔ صابروہ بیگ نے بڑی فرمانبرداری کا ثبوت دیا۔ اور کہاں
 تو صابروہ بیگ نے باورچی خانے میں جھانک کر بھی نہ دیکھا ہوگا ادا اب تو انگو

سے بچا ہوا سارا وقت باورچی خانے میں گیندا خالہ کی صحبت میں ہی گزرتا۔ اگر بیگم کو تپہ چل جاتا کہ صاحبزادی گیندا خالہ سے گھانا پکھا یا سیکہ بری ہیں تو گھر سر پر اٹھا لیتیں۔ بی مغفاتی تو ابھی زندہ تھیں۔ ڈیوڑھی گئی اور ساری ڈراکیوں کو کھانا پکانا اور کس لے سکھا یا تھا۔ مگر چونکہ بھی ہو، لہذا خالہ تھیں بڑی صاف دل۔ "مہیں" کہنا تو انہوں نے لے سیکھا ہی نہ تھا۔ چلے وہ "گرچنے" مانگے جانے کی بات ہو یا پھر "چپی کر سہ" کی بات ہو۔ عیاری مکتادی سے کہو یا سھولین سے، ان کی عادت ہی نہ تھی کہ کسی کام کو "مہیں" کہیں۔

زہرہ بیگم زچہ خانہ میں تھیں۔ چھوٹے جانی گورزانہ مرہیا چپی کر دانی کی عادت تھی۔ صاحبہ بیگم موزانہ کٹوری بھرتیل لے کر جاتیں اور دروازہ بند کر کے گھنٹوں "مانش" ہوتی۔ چھوٹے جانی ان دنوں بڑے خوش تھے۔ زہرہ بیگم کے پاس دو چار منٹ بیٹھتے، اوپری دل سے ننھے بچے کو پیار کرتے پھر اچانک سر بکچہ کر لول اٹھتے۔ "اٹوہ! تمہاری زچگی کس وجہ سے میری مانشی کاں بڑاں خراباں ہوں رہاں ہے۔" (تمہاری زچگی کی وجہ سے میری مانشی کا بڑا خرابہ ہو رہا ہے، زہرہ بیگم اپنے ناک میں بولنے والے شلوہر کے لئے جی کر کھاتیں تو صاحبہ بیگم غصہ دکھاتیں۔) "زہرہ آپا! مجھے اتنا غیر نیوں سمجھتی ہو۔ کیا میں مانشی کرنے سے بھی گئی گزری ہو گئی؟" کہتے ہیں گیندا خالہ بڑی اچھی چپی کرتی تھیں۔ نواب حیدر کے سر میں ایک بار نہوں نے اتنی اچھی چپی کی تھی کہ انہوں نے خوش ہو کر سب کے سامنے ہی اک دم ان کا سنہری سنہری منہ چوم لیا تھا، جو شرم سے بالکل ہی تپ گیا تھا اور گیندا خالہ پر زری شعلہ بر لگی تھیں۔ مگر بڑے چچا میاں سے

اس حرکت کا سرزد ہو جانا کوئی قابل گرفت بات نہ تھی۔ وہ تو سٹھے ہی ہنسوڑا اور سٹھے باز۔ صابر بیگم کو چھپی کرنا بھی اسی نے تو سکھایا تھا، اور کھانا پکانا بھی۔ اصل بات یہ ہے کہ گنبدِ اخالہ نے "نہیں" کہنا تو جانا ہی نہ تھا۔ جس دن گنبدِ اخالہ کے بیٹے نے جنم لیا، اس دن چھوٹے ماموں اپنی اچکن کے بٹن کھولتے بند کرتے، بے چین بے چین سے شاہجہاں بیگم کے پاس آئے۔

"آپا جان، اب بولو۔ کہاں منہ چھپاؤ گی؟ ساری ڈیوڑھی میں بوم ہو گئی ہے اور ایسا پور۔" خاندان میں کبھی ہو بہا کئے گی۔ ہے، کیا نہ آگیا ہے نہ لڑائی۔ ایہ لڑکیاں پیدا ہوتے ہی مرجا میں لو کیا اچھا نہ تھا۔

"اوی، دیوانے ہوئے ہو! ماما لونڈیوں کی سبھی کوئی عزت ہوتی ہے۔ حرام کے بچے وہ جنیں، وہ کم؟ کسی دھمکے کے ساتھ مکمل بھاگیں۔ وہ کم؟ تم تم کیوں جان کر ٹھاکریں؟"

چھوٹے ماموں نے سر پیٹ لیا۔ "ارے آپا جان، ماما لونڈیوں کو میں نہیں کہہ رہا۔ ارے تمہاری صابرہ دے ناک بھٹ دی پورے خاندان کی۔ سات پشتوں کے منہ پر کلنک نچو پ دی نابکار نے۔"

شاہجہاں بیگم بیٹھے بیٹھے لڑھک پڑی۔ "کیا کیا صابرہ دے؟" "چھوٹے ماموں نے دھشت میں اچکن کے سارے بٹن کھول دیے۔ پھر جلدی جلدی بند کرتے ہوئے بولے۔

"آپا جان کیا بولوں؟ باؤلی میں ڈوب مرنے کی بات ہے۔"

سارے ہنگاموں سے دور، "لو کر نکلو" میں پڑی گنبدِ اخالہ کیسا ہنسے جا رہی تھی۔ زینگی کے دروازے بھی بند نہیں ہوئے تھے، مگر وہ کمار ہی تھیں۔

”سینا نے دل لے گئے لال بٹوے میں“

صابرہ بیگم کا دل بھی آج سیال لال لال بٹوے میں لے کر چلے گئے تھے۔
صابرہ بیگم لاکھ گئی گزری تھیں، تھیں نوشاہی جہاں بیگم کی اولاد
جب تک کہ پورے خاندان میں لوم ہوتی انہوں نے باؤلی میں گر کر اپنے
آپ کو دنیا والوں کے طعنوں نشنوں سے محفوظ کر لیا۔

کہتے ہیں کہ شاہجہاں بیگم نے صابرہ بیگم کی پیدائش پر بھی اتنی خوشی
نہ منائی تھی جتنی کہ ان کی موت پر منائی۔ ڈیوٹر صبی والے تو یوں ہی کپے
پر پٹ کے تھے۔ کوئی بات نہ سمجھتی، مگر سننے والوں نے یہ سنی تاکہ شاہجہاں
بیگم نے اندرونی طور پر مٹائی، بی بائی کہ ایسی اولاد کا مٹ جانا ہی اصل
خوشی ہے۔

چھوٹے حانی نے تنگی میں سر چھپا کر خوب آنسو بہائے، مگر سب سے
چھپ کر دلیبے اتنے بڑے۔ بھر۔ پرے گھر میں بے دے کے جیدر نو اب کہا
ایسے تھے جن کی آنکھیں اپنی بیٹی کی موت پر نہم ہوتی تھیں۔ وہ کیوں روتے
تھے۔ ان کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔ گنبد کا چھوٹا سا
بیٹا اس کی چھائی سے چھٹا رہتا۔ آنے والے، چھاتیاں چھوڑنے دیکھتے
مگر کسی نے بول کر بھی نہ کہا۔ ”اوکی گنبد خالہ! ہاتھ مارے چھو کرے کی
شکل تو بالکل بڑے چچا میاں جیسی ہے۔“ مگر چچا میاں کو گنبد اسکے بیٹے
کی آنکھوں میں اپنی ہی صورت نظر آتی۔ انہیں لگتا کہ گنبد لے اپنا بدلہ
لے لیا ہے۔ فرق ہی کیا پڑا۔ باپ بدنام نہ ہوا، بیٹی بدنام ہو گئی۔ اور
بدنام بھی کیسی ہوئی کہ جان ہی سے چلی گئی بے چارے۔

صابرہ بیگم تو اپنی حانی سے گئیں، مگر سمیرہ کے لئے کانٹے بوکر۔ ناؤ

بیگم نواب کسی شہر ہی میں نہ تھیں۔ بے دے کے ساری فکر بس ہمیرہ بیگم کے لئے تھی۔ مگر ہا برد بیگم نے جو کالک تقویٰ دہائی تھی وہ انہی گہری تھی کہ چھٹائے نہ چھٹی۔ نواب حیدر باؤ لے کتے جیسے ہوئے۔ شاہجہاں بیگم ہاشیہ اپنے سہاگ کی خیر منائیں۔ ایسے حالات میں ڈاکٹر طیب کا پیغام آیا تو کسی کو انکار کرنے نہ ہی۔ یوں بھی انکار کرنے کی وجہ کیا ہو سکتی تھی۔ بکھلا کتا آدمی تھا۔ دیکھتے میں بھی اچھا تھا۔ عمر بھی خاصی تھی۔ مگر لڑکی قبول کرنے کے بعد بھی نواب حیدر پاگلوں کی طرح کھوئے کھوئے رہتے ان کے ہونٹ کچھ اس انداز سے کانپتے جیسے کچھ کہنا چاہتے ہوں مگر کہنے کی ہمت نہیں پاتے۔ لڑکے والوں کے اتنا کچھ مانگا تھا کہ وہ نواب صاحب کی کر ٹورڈ نیس کے لئے بہت کافی تھا۔ شاہجہاں بیگم نے دلی زبان سے احتجاج بھی کیا۔ مگر زبان تو دی جا چکی تھی۔

ڈھول بجے، آتش بازیوں جھوٹیں اور نواب حیدر کی اولاد میں سے ہمیرہ پہلی لڑکی تھی جو دلہن بنی۔ برسات آئی بھی۔ گئی بھی۔ مہانوں میں بیٹھے ہیں، گپ شپ بھی ہوئی۔ مگر نواب حیدر ایسے جھجے جھجے ادا اس ادا اس تھے جیسے شادی کا انتظام کر رہے ہوں۔

دوسرے دن ہمیرہ، اپنی تو تمام لڑکیوں بالوں نے اسے گیر لیا۔ لہری لڑکیاں بھی پہنچ گئیں۔ گونہ بان کے کسی نے کچھ نہ کہا۔ مگر تارنے والی آنکھوں نے تار لیا کہ پڑا سہارا دھوکا ہوا ہے۔ ہمیرہ بیگم کے کالوں پر انشاں ابھی تک جوں کی توں چمکی ہوئی تھی۔ بیس کی دھڑکی ذرا بھی تو پچھکی نہ پھیسی تھی، اور پھول مر جھا فرو گئے تھے۔ مگر میلے ہوئے نہیں معلوم ہونے لگے۔

شاہجہاں بیگم نے سر پٹ لیا۔ نواب حیدر کے سامنے مدد و معاون

وہ بین کرنے لگیں۔ "ہائے میں نے انہی ایک بھی بیٹی کا سکھ نہ دیکھا۔ جیسی گئی تھی ویسی ہی آگئی میری بیٹی۔ افسانہ جوں کی توں حیدر ہوئی ہے۔ مسی کی دھڑکیاں کیسے ناز سے جیسا بھی لگائی ہے۔ ہائے تم نے پہلے ہی کہوں نہ پتہ چلا لیا؟ میرے مولا میری بیٹی۔ میں پوچھتی ہوں۔"

نواب حیدر نے بات کاٹ دی ان کی۔ "مجھے پہلے ہی سے پتہ تھا۔" تمہیں پہلے ہی معلوم تھا۔ "شاہجہاں بیگم روزنا دھونا بھول گئیں" حیدر نے کہا۔ "تمہیں پہلے ہی معلوم تھا۔ اور سچر بھی انہی بیٹی کو کنویں میں لوٹ دیا۔"

نواب حیدر بے بسی سے بولے۔ "بیگم لاش سرٹ جائے تو اس میں ہر بو پیدا ہو جاتی ہے۔ ہمیر دلاش تھی۔ وہ سرٹنے کو تھی۔ میں نے آج بڑے فرض سے سبکدوشی حاصل کی ہے۔ میں نے آج نمبر اجازت بھی اٹھا دیا۔ اب میں بڑا مطمئن ہوں۔" انہوں نے اپنا سر ہاتھوں سے جکڑ لیا۔

دوسرے کمرے میں تہیرہ گم عم بھیٹی تھی۔ لڑکیاں بالیاں حقیقت حال سے بے خبر سے چھیڑے جا رہی تھیں اور ان ہنگاموں سے دور "نوکر خلع" میں مومن علی ٹنڈل ٹنڈل کر رہے تھے نچا نچا کر رہے تھے۔ اور گنبدِ احمالہ منہسی سے دوپہری ہوئی جا رہی تھیں۔

"سیاں مورا بھولا، نہ جلنے موری بنیاں

بنیاں موری بند پر، جاگوں ساری رتیاں

آکے سورے گھونچوٹ کو کھولا ہی نہیں

گورے گورے کالوں کو چوما ہی نہیں

سیاں مورا بھولا....."

دل داغ داغ

رفیع باہر سے بھاگتی ہوئی آئی اور نمبر میاں کے کندھے کو ہٹا ہلا کر
بولنے لگی۔

”ابا۔ ابا۔ کو۔ کوک۔“ پھولی ہوئی سانس۔ گھراسٹ اور خوشی
الحفاظہ سے نکلتے زندگی تھی۔

نمبر میاں کتاب میں ایسے مشغول تھے کہ بیٹی کی بات پر کان ہی نہ
دیئے۔ رفیع ایسی بے قراری سے ان کے کندھے سے جھنجھوڑ رہی تھی۔

”اباجی۔ ابا۔ کوک۔ کوک۔“
نمبر میاں نے اب کے کتاب کو دھڑنچا اور تیز تیز پلٹنے لگے۔ ”کوک
لگا رکھی ہے، ہسکلی کدھر کی۔ بولتی کیوں نہیں بات کیا ہے۔؟“
”وہ باہر۔۔ باہر کوک۔“ رفیع کی زبان پھر سکاٹتی نمبر میاں
نے جھلا کر در سے جوتے گھسیٹے اور بیٹی کا ہاتھ پکڑ کر اسے باہر لے جاتے
ہوئے بولے۔

”بتا بھلا، باہر کون سی کوک کوک دھری ہوئی ہے۔“

باہر بیٹیک میں رسی سے بندھا چھوٹا سا کتے کا پلا تھا۔ سفید رنگ جس پر خاکستری دھبے، جسم بالوں سے بھرا ہوا۔ لمبے کان اور چھوٹی سیدھی دم، جسے وہ مورچہ کی طرح بار بار ہلائے مباتا تھا۔
اب رفیقہ نے بڑی خوشی سے ہکلائے بغیر ہاتھ سے اشارہ کیا اور سنسن کر بولی۔

”کتا۔“

”وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں کہ کتا ہے۔ پھر۔؟“
رفیقہ نے بھی بھی آکھوں سے باپ کو دیکھا۔ کیسے باپ ہیں۔؟
ذرا بھی خوش نہیں ہو رہے! جھل کر بولی۔

”تو میں بھی دیکھ رہی ہوں۔!“

”پھر اس میں اتنی بدحواسی کی کیا ضرورت ہے۔؟ سانس پھولی۔
جا رہی ہے۔ بالی بکھر گئے ہیں۔ زبان ہکلا رہی ہے۔ منہ پر پسینے کے تار۔
چمک اٹھے ہیں۔ اتنی ساری گڑبڑیں اسی لئے۔؟ ہونہہ!“ انہوں نے بے
مطلب نظروں سے کتے کے پلے کو دیکھنا شروع کر دیا۔

”میں اسے پالوں گی۔“

”ہائیں!“ عین نصیر میاں کے کانوں میں ہم گسا۔ ”کتا پالے گی؟“

ارے تو یہ پلہ پالے گی۔؟“

”پھر اور کیا کہہ رہی ہوں تو۔“ رفیقہ تنک کر بولی۔

نصیر میاں نے سگڑا بڑا کر بیٹی کو دیکھا۔ کیسی بیٹی ہے۔

”لا حول دلا۔ کتا۔ ہونہہ کتا۔ تو بہ۔ کتا۔“

رفیقہ نے سپر تنک کرائی کی اور دیکھا۔ پھر سکرانے لگا۔

”وافی کتا۔ ابا کتا۔ سچ مچ کتا۔ اتا پیا را کتا۔“
 خیر میاں نے جھجھلا کر دیکھا۔ یہ تو عین بین ان کے لہجے کی نقل کر رہی تھی۔
 ”دیکھو بی بی۔“ وہ انگلی تھیبہ کے طور پر اٹھا کر بولے۔
 ”کتا پالنا اچھا نہ ہو گا۔“
 ”مگر کیوں؟“ وہ اسی روکھے پن سے بولتا۔
 ”صحیح بات یہ ہے کہ گھر میں رحمت کے فرشتے نہیں اترتے۔“ وہ
 سمجھاتے ہوئے بولے۔

اس نے جھٹلا سے ایک شرط پیش کر دی۔ ”دیکھئے ابا میاں جب لا
 کے ذہنتے اترنے بند ہو جائیں گے تو میں کتنا پھنکوا دوں گی۔“
 ”لا حول ولا۔ یوں بات کہے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے منع کیا
 ہے کتا پالنے کو۔“
 ”اللہ تعالیٰ نے تو سینما دیکھنے کو بھی منع کیا ہے۔“ وہ ناک چڑھا کر بولتا۔
 ”اچھی اکیسی بیٹا تھی یہ؟“ صفا باپ کی عادتوں پر روک ٹوک
 کر نبوانی۔ جھلا کر بولے۔ ”وہ تو دوست لیکر چلے جاتے ہیں۔“
 ”بیٹا مسکینی سے بولی۔“ تو یہ تو بیٹی پال رہی ہے۔ جس کا گناہ اس
 کے ہی سر۔“

بیٹیوں کو اتنا لاڈ ہرگز نہیں کرنا چاہیئے۔ انہوں نے جھلا کر سوچا۔
 اب کے انہوں نے بہت پیار سے سمجھایا۔ بیٹا بات یہ ہے کہ
 کتا بے حد بخش جانور ہے۔ بہت ناپاک۔ جس چیز میں منہ ڈال دے
 وہ پھنکواؤں پر قری ہے۔ جس جگہ بیٹھ جائے وہ ہمارے متبارے سمجھنے کے لائق
 نہیں رہ جاتی، اور کبھی.....“

”نکڑا میاں ہم تو اسے انگ رکھیں گے کبھی۔“ وہ زچہ آچکی تھی۔
 ”قسم اللہ کی آپ کے برے بھلے میں ہرگز نہیں پڑیگا ہمارا کتا۔“
 سارے حربے آزمائے جاچکے تھے۔ ہر حال پٹ پٹ جاتی تھی۔ اکدم
 ان کے منہ پر چاند سا چمک گیا۔

”کبھی ر فو بیٹی تم انہی نانی اماں سے پوچھ لو، وہی گھر کی بڑی ہیں۔“
 ”نانی اماں سے پوچھ نہی تو وہ کہیں گی! بیٹی! گھر کی کرتا دھرتا
 تو تنہا ہی ماں ہیں۔ ان سے پوچھو، ان سے پوچھو گی تو کہیں گی“ اپنے ابا
 سے پوچھو، ابا سے۔۔۔۔۔ یوں تو مجھے گھر کی مرغیوں بلیوں تک سے اجازت
 لینی پڑتی تھی۔ جابجہ میں نہیں پالتی دالنتی کتا۔“
 بات تو اتنی آسانی سے، بڑے بڑے سے ختم ہو گئی منہ پر میاں کا دل
 مٹھیں ہو گیا۔

دو چار دن یونہی گزر گئے تو ایک دن قیصر میاں کو! چائیک احرا س
 ہوا کہ رقیعہ کا منہ سوکھا سوکھا سا ہے، چہرے پر دود شادابی نہیں، آنکھیں
 سکراتی نہیں، ہونٹا سنسنے نہیں اور گھر سے عجیب سا ساٹا ہے۔
 انہوں نے یانی سے پوچھا۔

”کیا بات ہے؟ رقیعہ ایسی چپ چاپ دکھائی پڑ رہی ہے۔“
 ”جائے نیک بخت کو کیلیمو گیا ہے۔ بس منہ میں مونگ پھیرے رہتی
 ہے۔ نہ کھائے نہ پیے۔ دسترخوان پر بیٹھ کر کبھی یونہی اٹھ جاتی ہے۔ پوچھو
 تو بس یہی کہتی ہے۔“ سہوک نہیں۔“

”ہوں۔“ قیصر میاں خاموش رہ گئے۔ بچے مند کرتے ہیں اور
 پہل بھی جانتے ہیں۔

مگر رفیعہ بی تو ایسی بچہ بچیاں کہ بہلائے نہ سبیلیں۔ نامراد کتے کے
پلے کے پیچھے کھانا پینا، ہنسا بولنا۔ سبھی لچر چھوٹ گیا۔ انسان کھائے
نودم رہے۔ اور دم رہے تو ہنسے بولے، چلے پھرے۔ کھانا پینا ہی چھوٹ
گیا تو کہاں کی طاقت، اپنے بس بڑی رہی رہی۔

اس دن کھانا ختم ہو گیا تو دسترخوان پر بیٹھے بیٹھے غمیریاں بولے۔

”اجی سنتی ہو بیٹیا کی یہ درگت کا ہے سے ہے۔“

”سا ہے سے۔“ انہوں نے جبرت سے پوچھا۔

”کبھی پس کتا پا لوں گی۔“

اماں سے زیادہ زور سے نا قی اماں چنچیں۔ ”اولی کتا۔!“ اور انہوں

نے لعنت بھیجی شروع کر دی۔

”تو بہ کہیں سلمانوں کے گھروں میں کتے پالے جاتے ہیں۔“

”مگر اب پانا پڑ گیا۔“ داماد غصہ سے بولے۔

”کیوں سبلا۔؟“ ساس چنچیں۔

”پھر وہی کیوں۔؟“ داماد چلنے لگے، ”آپ ان امراء کی حالت

تو دیکھیے۔ کتا نہ پالیں گے۔ بی جان سے جائے گی۔“

”تینوں خاموش رہ گئے۔ بیٹھے مال کی طرف دیکھا، ساس نے
داماد کی طرف، اور داماد نے بیوی اور ساس کی طرف دیکھ کر ہنسا لیا۔

جیسے۔

”اب کر بھی کیا سکتے ہیں۔“

”دو چار مہینے میں بیٹا رانی تبرہوں میں قدم دھر نہ دالی ہیں۔

جوان بیٹی کا یوں لاڈ کر نیجے۔ من مانی کرنے دینگے تو یہ بھی نہ سمجھیں کہ بچاؤ

بعد سسرال بھجوانا ہے۔ وہاں کون ایسے نازاٹھا ئیگا۔؟ اور مال نے غصے سے منہ پھیر دیا۔

”تو میرا نے کب بڑی ہنسی خوشی سے کم بخت کو مرجانے دو۔“
اب باپ کے تذکرہ پر بیٹی کے لئے پیار سوچٹ پڑا تھا۔
”جہاں دیکھو نہ تیرہ ہزار کے طعنے، جب ستوتب جوانی کا ذکر۔ ایسی کون دیواریں پھلانگ رہی ہے وہ۔؟“

ماس نے حیرت سے داماد کی طرف دیکھا۔ کیسے باپ ہیں۔؟ اپنے سامنے کسی کی چیلے ہی نہیں دیتے۔ ہو نہ۔!
رفیقہ کے بال ہوا میں اڑ رہے تھے اور منہ تھما رہا تھا۔

”ارے ارے، ایسے نہیں۔ یوں نہیں۔ ادھر۔ ہاں ادھر۔“
ڈیو مالک کے اشارے پر دوڑا اور دوڑ کر گنبد اٹھا لیا۔
”شباباش۔ اس نے بے ڈھائی میں اپنے ہاتھ سے اس کی پیچھے ٹھونک ڈالی اور پھر گھر آکر بیٹھک کی طرف دیکھا۔“ ایا تو نہیں دیکھ رہے ہیں۔“
وہ بے وقوفہ دوسرے چلن انداز گئی تو دیکھتے ہی تانی اماں نے پشیمار تباہی۔

”ہاں صف دھوئے رہی تو نے۔؟“

”ہاں تو۔؟“ وہ بیزاری سے بڑا۔ ”ہاتھوں کو کیا ہوا۔؟“
”نہ ایا تیرا۔؟ اس کتے کے لیے کے ساتھ کد کڑے لگے ہیں۔ گٹے چھاتی لگایا جاتا ہے اور پھر کینا ہی بن کر پوچھتی ہے ہاتھوں کو کیا ہوا۔؟“
رفیقہ نے منہ منہ سے تانی اماں کی طرف دیکھا اور پھر منہ منہ سے کہنے لگی۔
”تانی اماں آپ نے کبھی دوسرے دیکھا ہی نہیں۔ وہ نہ سچ مچ آپ بھی

اے ایک لمحہ کو نہ چھوڑتیں۔“

”اے فوج، جھاڑو پھرے مانی طے کی صورت پر۔ میں تو ادھر پہنچوں ہی ناں۔ تو ہی اس پر سے داری صاف قے جا۔“

”مجھے تو بچ نانی اماں بڑا لاڈ آتا ہے۔“

”ہاں ہاں نیری اولاد ہی تو ہے وہ۔“ وہ جبر کر بولیں۔

”اولاد؟“ رفیعہ تھوڑی دیر کے لئے کچھ سوچتی ہی رہ گئی، پھر نہ کر بولی۔

”ایک بات بولوں؟ مگر پھر آپ کہنے لگیں گے کہ زبان دراز چھوڑ دیں۔“

”ہاں ہاں بول دے نا۔ دل کی دل میں کیوں رہے۔؟“

رفیعہ ہنسنے لگی۔ ”ہاں دیکھ، اسی کی ڈانٹ بڑے گھر۔“

”اے بے الیا، ہر جیسے بڑا اسی کی ڈانٹ کا خیال نہ کر۔“ اس کو تو

انگلیوں پر نچاتی ہے، ہونہہ!“ اور انہوں نے پیاد کے ساتھ یاں بڑی ملی کو

اٹھا کر گود میں بھر لیا۔

”کیوں جی نانی اماں، میرے کہتے پر اتنی لعنت مارنا اور جو یہ بات

سہ آہ لوگوں کی گود میں چڑھی رہتی ہیں، پھر۔؟“

”اے کا فر زبان کو ذرا سنبھالو، ابھی کہ معلوم ہے آنحضرتؐ نے پاس ہی

بیاں تھیں اور حضورؐ بلیوں کو اٹھا پایا کرتے تھے۔ یہ تو سنت ہے۔“

”بس جس گھر آپ کو انبیاء سے پیار ہے ایسے ہی میں۔۔۔۔۔“

ابھی رفیعہ کی بات اس کے منہ میں ہی ختم کہ نانی اماں نے اس کے

کمرے کے در سے تجلیں۔ ابھی رفیعہ ان کے پرتخشا جیلانے کا مطالعہ کر رہی تھی۔

کو انہوں نے دروازے کے ٹکڑے کا پتھر اٹھایا اور ترے سے ڈنگڑیاں اچھال دیا۔

”کم بختا گھر میں گھس آنا۔ رفیعہ نے ہڑل کر قہقہے دیکھا۔ ڈو بوا شکن میں گھر رہا تھا کہ پھر

اس کی چھٹی مانگ میں جا بھاگا اور وہ دروازے سے بیادوں کے باہر کو بھاگ گیا۔

نیر کی سی نیر سی سے رفیعہ بھی اٹھ کر بھاگی۔ آنکھیں میں اس کے سچھے اس کے جہان قدوں کی دھب دھب اور ہلکا سنہرا آنچل ہرانا رہ گیا۔ نانی اماں نے بڑی تشویش سے باورچی خانے میں بیٹھی بیٹی کی طرف دیکھا۔

”جوانی گھر ڈھونڈ رہی ہے اور بیٹی کے لچھن دیکھو۔ اس عمر میں کوئی

یوں دھب دھب سمجھا گتا ہے۔“

بیٹی نے سر جھکا لیا۔ ”میں کرمی کیا سکتی ہوں؟ وہ تو بھلی خاصی

دیوانی بن کر رہ گئی ہے۔“

سخوڑی ہی دیر میں رفیعہ باہر سے لپکی ہوئی آئی۔ اس کے چہرے پر ناگوار اور غم کی چھاپ تھی۔ ابا قدم کچے پر رہے تھے اور وہ انگلی پر دوپٹہ مروڑاتی باورچی خانے کے دروازے پر جا کھڑی ہوئی۔

”امی! زخم لگ جائے تو کیا لگانے ہیں؟“ اس نے کن انکھیوں سے

نانی اماں کو گھورا۔

”کیوں کیا ہوا؟“ اماں نے تشویش سے پوچھا۔

”ڈلو کی ٹنگڑی پر زخم لگ گیا ہے۔“

”ہے ہے کا ہے سے۔“ ان کے لہجہ سے پریشانی جھلک رہی تھی۔

آخر بیٹی کا درد تو ہوتا ہے۔

نانی اماں نے تبصرہ نہیں کیا جو اسے لنگڑا کرتا ہوا دیوار سے ٹکرا گیا۔

جس پر

رفیعہ ہمدی نھو پ کر آئی تو اس کی آنکھیں نم نم سی تھیں۔
ادھر کتا، ادھر رفیعہ۔ وہ تو زخم کی تکلیف سے پیہا پہن کر تا اور
یہ پن زخموں کے درد سے چورستی۔

اتنا ڈرا سا تو تھا ڈبو، اس پہا پہا کی زخم! ر فوئی کا سارا اٹھلایا
پلایا انگ سے جھڑ گیا۔ ایسا سوکھا مارا انگلی کا کتابن گیا۔ یہ تو امی بھی بھکتی
تھیں اور نانی بھی کہ رات بے رات جب باہر سے پیہا پیہا کی آواز آتی تو
اندھیرے میں پلنگ چرچاتا اور دروازہ کھول دیتے تھے اپنے پیچھے بند
کر تا ایک سایہ باہر نکل جاتا۔ باہر سائیں سائیں کرتی رات سرد تھی اور
کبھی کبھار چھینٹے گرائے جاتی، مگر رفیعہ کا پلنگ خالی ہی ہوتا۔ اور کبھی
کتنے کئی پیہا میں بند ہو جاتی تو دوسرے دو ٹپے پیٹے دھیرے سے آتی اور لمبت
پہ لپے جاتی۔

کئی دنوں بعد طاہرہ بیگم، ضمیر میاں سے نمنا طلبا ہوئیں۔
"ٹہیا کے رنگ دیکھتے ہیں نا آپ۔!" مگر اب کے سے ان کے لہجہ
میں غصہ نہیں پہا رہتا۔

"کیا ہوا۔؟"
"دوئی دیکھتے نہیں آپ، زرد موٹی ترائی کا پھول برقی جا رہی ہے۔"

"امی مہنس تریں۔" اماں نے کہیں پیہا ر دیا۔ پیہا تو اس کے لگا
اور زخم ان کے لگ گیا۔ جس دن سے وہ پہلے بیمار تھا اس کا کھانا پینا
بھی چھوٹ گیا۔

"جہیز میں دھیر سارے کتے ہی دے دینا میاں تم۔" نانی ماں
نے اپنا خیال نکالا۔ اچھا ہے جی بہلا رہیگا۔

امی ہنسیں۔ "اے بچہ یہ نامراد اس کو اتنا پیار کرتی ہے تو کیا سسرال بھی ساتھ ہی لے جائے گی۔" اے لو ہو آکیا۔؟ بلا سے نوکرائی نہ ہسی کتا، ہسی ہسی۔ وہ کام بھی تو خوب کرتا ہے نا۔ صابن دانی اسٹھا کر وہ لائے۔ گنبد ہا وہ پک لائے۔ نندیل اسٹھا کر وہ چلے۔ بھلی خاصی ناند ہے تو کھر نوکرائی کا کیا کام۔؟

ضمیر میاں نے حیرت سے ساس کی طرف دیکھا۔ "اچھا! یہ ڈبو اتنا سدھایا گیا ہے۔" ان کی حیرت میں ناگواری کا کوئی ثابہ نہ تھا۔ یہاں تو مارے کا سارا آدا ہی! دندھا تھا۔ ساس نے چڑ کر داماد کی طرف دیکھا۔

"میاں اس میں حیرت کی کون بات ہے۔؟ جیسا لکھایا ویسا ہی سیکھ گیا۔"

رفیع نے دور بیٹھے بیٹھے سراٹھا کر دیکھا۔ اماں ابا دونوں بھی اب رضا مند ہو گئے تھے۔ اس کا دل کھل اٹھا۔ "اب تو ڈبو جو دل چاہے سو کرے۔ ہائے۔!" اس کا چہرہ چمک گیا۔

جس دن ڈبو کا زخم بھرا ضمیر میاں نے غور سے بیٹی کا چہرہ دیکھا اس کی آنکھوں کے گرد لگے سیاہ گہرے تھے۔ پہرے پر زردی اور گال دیے دیے سے تھے، مگر اب اس کے چہرے پر خوشی کی ہنسی بھری جا رہی تھی۔

"یہ کتنے کے پلے کے لئے! اتنی جان جلائی رہی ہے۔"

اس دن وہ حیرت سے اچھی بی بی سے بولے۔

”عورت، خواہ کسی کی محبت ہو۔ بس باؤلی بن کر رہ جاتی ہے۔“
 بی بی نے ذرا اچنبھے سے ان کی صورت دیکھی۔
 ”دیکھو تو رفیعہ کا رنگ، کفے کے پلے کے لئے کیسی باؤلی سی ہو کر رہ گئی۔“
 کتے کے بنا اس کا دل ہی نہیں لگتا جیسے۔“

”انسان تو انسان ہے، مگر جانور بھی کم نہیں ہوتا۔ اس کتے کا حشر
 بھی آپ نے دیکھا۔؟ رفیعہ کا دیوانہ ہے۔ کتا تو یونہی وفادار اور محبت
 والا ہوتا ہے۔ بھر بہ ڈبو تو زیادہ ہی دیوانہ ہے۔ اتنا تو وہ بھی دیکھے
 ہے کہ گھر میں ادھ کوئی اس کے گن نہیں گاتا۔ بس جو ہے سو رفید۔ ایک آدھ
 بار رفیعہ کام میں اٹھی رہے اور ماہر نہ جائے تو بار بار دروازے میں
 آکر جھانکتا ہے۔“

”اور کوئی سنے تو کہے بائیں تیار ہے ہیں، مگر یہ حقیقت ہے طاہرہ بی بی
 اس دن رفیعہ کی طبیعت خراب تھی۔ اس نے کھانا نہ کھایا تو ڈوب بھی بھوکا
 ہی رہا۔“

”بھلا اس نے کیسے سمجھا ہو گا کہ رفیعہ بھوکا ہے۔ کچھ اس کے سامنے
 تو بیٹھ کر کھانا نہیں کھاتی۔“ وہ جیرت سے بولیں۔

”اب بی بی یہ تو دل کی بات ہے۔ لاکھ جانور ہے اور بے زبان
 بھی، مگر محبت تو سمجھتا ہے۔ سوچا ہو گا روز تو رفید بار بار اٹھ اٹھ کر
 جاتی ہے۔ دیکھتی ہے۔ پانی کے پیالے کی خبر لیتی ہے تو کبھی روٹی لار
 ڈالتی ہے۔ آج نہ گئی تو سمجھ لیا کہ ضرور ایسی ویسی کوئی بات ہے۔ خود
 بھی بھوکا رہا۔“

ستھوڑی دیر فہر میاں چپ رہے، پھر بولے ”اور ایک بات تو

بالکل افسانوں کی سی کرتا ہے۔ اسی دن سب کی آنکھ بچا کر رقیعہ کے کمرے میں گھس گیا۔ رقیعہ نے کہیں مذاق سے اسے کہہ دیا۔ ”تو کھانا نہ کھائے گا تو میں مرجاؤں گی، اور یونہی جھوٹ جھوٹ بھڑکے گی۔ بی بی اس کی بے قراری تم سے کیا بیان کروں! حیرت اس بات پر ہے کہ اس نے میرے کاکیا کا مطلب سمجھا ہو گا۔“

طاہرہ بیگم ذمہ آزر وگی سے بولیں۔ ”جانور کی بات چنے انسان کی، سب محبت کے سچو کے رہتے ہیں۔ مجھے تو یہی خیال بار بار ستاتا ہے کہ اس کی شادی ہوگی تو ڈیو کا کیا بنے گا۔“

”ہیں؟ کیسے بنے گا سے مطلب۔؟ ارے وہ ساتھ جائے گا۔ اور کیا ساتھ جائے گا۔؟“ وہ حیرت سے بولیں، ”اور سسرال والے یہ نہ کہیں گے کہ نجی اور منحوس جانور ساتھ کر دیا۔ جانے کیسے لوگ ملیں۔؟ کیا سوچیں۔؟ فرض کرو زندگی خیالات کے ہونے اور جو کہہ دیا کہ ہم نہ دیکھیں تو۔۔؟“

”تو ادھر وہ! صبر۔۔“ وہ سنجیدگی سے بولے۔

”ہے بے خدا نہ کرے، کیسی بات منہ سے نکالتے ہیں۔“
”میرے منہ سے نکالنے کا کیا ہے، دیکھ لیتا کیسی ایسی جدائی کی نوبت آئی تو ایسا ہی ہو گا۔ اس دن ڈبلیاں گھوم گھام کر ذرا دیر سے تشریف لائے تو رقیعہ روٹھ کر بیٹھ گئی اور اسے غصے سے دیکھ کر بولی۔

”اچھا۔! یہ وقت ہے آنے کا۔ اب میں کبھی تو بات نہ کر دی۔ وہ بھی سمجھ گیا کہ مالک کا مزاج بڑھکانے نہیں ہے۔ دکا خوشامد کر لئے۔ پاؤں چاٹے، دم ہلائی۔ آزد باد گھیرے ڈالسا در قدموں میں پڑ گیا۔

میں بیچک ہیں بیچا سارا تماشہ دیکھتا تھا۔ رفیعہ پورنی غصے میں اسٹھ کر چلی گئی۔ میں نے اندر سے لبکٹ کا ٹکڑا اچھینکا تو اسٹھ کر سو گھٹا تک نہیں بچر۔ ہونے دوسرا لبکٹ اس کی ناک کے سامنے لے جا کر رکھ دیا مگر منہ موڑ کر بیٹھ رہا۔ بڑی دیر بعد رفیعہ اندر سے روٹی لئے آئی تو لپکا۔ اور جوہی اس لئے روٹی اس کے سامنے ڈالی مزے مزے میں کھانے لگا۔ کھانا جانا اور رفیعہ کی صورت کو دیکھتا جانا۔ ایسی باتوں کی سمجھ اسے کہاں ہے آئی۔؟ اور رفیعہ بی بی کا یہی حال ہے۔ ادھر ڈوبیاں بھی کچھ کم نہیں رفیعہ سے کبھی نہ یاد دینی ہو جائے تو ہمارے ہمارے ہی طرح روٹھ کر بیٹھ جاتا ہے۔ جنہیں دو گھنٹے کی سہارہ نہیں ہوتی وہ عمر بھر کی جدائی کا سہن کیسے کر پائینگے جھلا۔؟

”آج کل تو میں اس بھی دھما مانتھی رہتی ہوں کہ خدا دونوں میں کبھی

جدائی نہ ڈالے۔“

”جدائی پڑے گی ہی کیسے۔؟ ہم لاکھ ماریں باندھیں وہ خود رفیعہ کے

پچھے پچھے چلا جائے گا۔“

”اس کے جانے کی نوچ جوڑو۔ سسرال داؤں کا ڈر مجھے کھائے

جانا ہے۔“

اب تک تو یہ تھا کہ رفیعہ کے پیار میں ایک جھجک تھی۔ رکاوٹ تھا اسے معلوم تھا کہ اماں اب اس کے کہتے کو اور اس کے پیار کو کچھ پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھتے، اس لئے ڈری ہوتی رہتی۔ مگر اب اتنی مابینہ تو سستی نہیں۔ بھانپ گئی کہ دونوں نے نہ صرف حالات سے سمجھوتہ کر لیا ہے بلکہ خود بھی کہتے کو پیار کرنے لگے ہیں۔ رہیں مافی اماں، سوان کا کیا تھا۔ ہماری کی ڈگڈگی

تھیں۔ کوئی سنے نہ سنے ہم سبائے جاتے ہیں۔ اور بوں بھی اولاد اٹھو
سے بیٹی اکلوتی ہونو ماں باپ ہر سائی کو سہارا جاتے ہیں۔ بیٹی ٹھیری پر
گھری۔ آج ہے کل چلی، اس کا دل دکھائیں تو چین کہاں پائیں؟ اس کا برا
کام سبھی بھلا اور بھلا تو بھلا ہی بھلا۔

رفیعہ نے ڈبو کو اولاد کا سا پیار دیا۔ وہی کچھ کیا جو ماں اپنے بچوں
کے لئے کرتی ہیں کبھی ڈبولے بو نہی سرفنگیوں سے دہاکر لمبی نانی دی تو رفیعہ
کا دل ڈوب ڈوب گیا۔ کبھی وقت پر گھر نہ لوٹا تو جی کلپ کلپ گیا۔ کبھی متغیر
خوراک سے کم کھا یا تو دل بیٹھے گیا۔ دن سہ کوئی گھنٹہ خالی نہ جانا ہوگا کہ وہ
اس کی خبر لینے باہر والے آنگن میں نہ جاتی ہو۔ کبھی سروی ٹپنے لگی تو اندر
سے پرانی ردی گھسیٹ لائی اور گدیہ سا بنا کر بچھا دیا۔ کبھی بادل برسے
تو چائے پلانا نہ بھولی۔ گرمی ہوئی تو اس کے نہانے کا خیال کبھی دل سے
نہ ہٹتا۔

اور ڈبولے بھی اس پیار کا جواب پیار سے دینے کی کون کھی کی۔؟
رفیعہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد، لے دے کے گھر میں نانی اور
ماں، باپ باہر کے آدمی۔ اتنے بڑے سارے گھر بھرے دھائیں دھائیں
سپہا کرتی۔ اب اس کو ایک ساتھی جیسا مل گیا سہتا۔ رفیعہ کا کردار باپ
کے کمرے سے ملا ہوا تھا۔ ڈبو کو کبھی ادبہا کر مائیں کی یاد دلاتی تو بیچک
میں کھلنے والے دروازے کی راد چپکے سے اس کمرے میں آ جاتا۔ بیچ کا دروازہ
بند ہو جانے سے ماں اور نانی کو پتہ بھی نہ چلتا کہ ادھر کیا کارروائی ہو رہی
ہے۔ کبھی کبھار بول نہوتا کہ رفیعہ۔ اپنے کام میں الجھی ہے اور ڈبو کی خبر لینا
بھول گئی۔ ایسے میں ڈبو چپکے سے کھڑکی سے حجابک جاتا اور پھر دروازہ

کھلا پاکہ اندر گھس آتا۔ کبھی پاؤں چاٹتا، کبھی قدموں میں لوٹیں لگاتا۔ کبھی یونہی آنکھوں میں پیار بھرے اسے نکلے جاتا یا پھر دم ہلاتا کھڑا رہتا۔ رفیعہ کی طبیعت کبھی خراب ہو جاتی، منہ پیچھے پڑ جاتی تو ڈبو کا دل اپنے پہلو سے کہیں اڑ جاتا، کھانا پینا اس پر حرام ہو جاتا رفیعہ کھائے تو وہ بھی کھائے، ورنہ کھانا ایسا کون ضرور سی ہے۔

ایسی باتوں سے رفیعہ کے دل میں ڈبو کی محبت دوٹی ہو جاتی۔ کبھی کبھار آنکھوں میں آنسو بھر کر وہ اپنے بے زبان دوست سے بولتی۔
 ”ڈبو کہ جی مجھے مجھے چھوڑ کر جانا پڑا تو میں کیسے زندہ رہوں گی۔؟“
 ڈبو زبان سے بات نہیں کر سکتا تھا۔ مگر آنسوؤں کی زبان خوب سمجھتا تھا۔ ایسے موقع پر وہ بے کل ہو جاتا۔ بار بار گول گول گھومتا، زور زور سے دم ہلاتا اور جب رفیعہ اس کی بے تابی دیکھ کر ہنس دیتی تو وہ مطمئن ہو جاتا، اس کے قدموں میں لیٹ کر اس کے تلوے چاٹنا شروع کر دیتا۔ اس سے بھی زیادہ بے کل وہ اس وقت ہو جاتا جب کسی بات پر تنک کر رفیعہ بولتی۔

”دیکھو ڈبو تو ایسے سنائے گا تو میں مرجاؤں گی۔ ہاں۔“ اور وہ انہی گردن جھکا کر، آنکھیں موند کر مرنے کا یوں ڈراو ادیتی کہ ڈبو تڑپ جاتا۔ جانے ڈبو نے مرنے کا کیا مطلب سمجھ رکھا تھا۔ یہ تو ہوتا ہی تھا۔ کہ جہاں ڈبو نے کسی چیز کے کھانے سے انکار کیا یا کوئی اوندھی سیدھی حرکت کر دی کہ رفیعہ بولی اٹھی۔

”دیکھو ڈبو میں مرجاؤں گی۔ ہاں۔“ تو وہ یوں چپک سپیریاں کھانے لگتا جیسے دم سے بھڑوں کا چپٹہ لیٹ گیا ہو۔ لسنی ہی دیر وہ بے کل

بہکل سائنملائنا رہنا اور جب رقیعہ اس کے منہ میں روٹی یا بسکٹ کا ٹکڑا رکھ دیتی تو کھانا جانا اور چیکیلی آنکھوں سے اسے دیکھنا جانا بالو کہتا ہو۔ "اب سے اب اس کلمہ بد منہ سے نہ بھالنا۔ ہاں۔ سمجھیں۔"

ابامیاں بیٹھک میں سے سارا نمائشہ دیکھا کرتے۔ ایسی نا قابل یقین باتیں وہ اپنی بی بی کو سنانا نہ بھولتے۔

"اجی سنا، رقیعہ نے جب یہ کہا تو ڈیوٹے کیا کیا؟"

"اجی دیکھا، وہ کیسے روٹھ جاتا ہے۔ جیسے ہم تم ہوئے، جا فورہ

ہوا۔"

طاہرہ بیگم ادا سی سے لڑتیں۔ "ہاں کتنا بڑا سمجھدار جانور ہوتا ہے۔ جانے اللہ میاں لے اس کا پالنا گنہ کیوں بھرا دیا ہے۔ ہاں کی ادا سی کا مطالبہ ضمیر میاں سمجھ جانے کہ" سسرال میں رقیعہ کا جی کیسے لگے گا۔؟" بیٹیاں ماں باپ کے گھر زندگی گزارنے کے لئے تھوڑی سی ہی پیدا ہوتی ہیں۔ ایک دن تو انہیں سسرال جانا ہی پڑتا ہے۔ اور رقیعہ بی بی کو بھی جانا ہی پڑا۔ اماں یا دادا کو معلوم تھا کہ ادھر رقیعہ اور ادھر بڑ کیا کیا فیملی مچائیں گے۔ جس دن برات کو اتارنا تھا۔ اماں لے ڈیوٹے کو گودام کے ساتھ والے کمرے میں بند کر دیا۔

"اللہ جانے سسرال والے کن کنوں کے ہیں۔ پیٹ میں جھانک کر کس نے دیکھا ہے؟ محض اتنی بات پراسبھی سے دل برا کر لیں کہ ساتھ میں منحوس کتنا چلا آیا تو آگے بیٹیا کی زندگی کا کیا بنے گا۔؟"

روٹی اور ہڈیاں سامنے پڑی رہیں۔ صبح سے شام ہو گئی مگر ڈیوٹے کو کسم چیز کو منہ نہ نکایا۔ ادھر باجوں کی دھیمی دھیمی آواز کانوں میں

پری اور ادھر رقیعہ بی نے ہلکی ہلکی آوازوں سے رونا شروع کر دیا۔ مالک کے رونے کی آواز کانوں میں ٹپکتے ہی ڈلوکا دل اڑ گیا۔ اس نے ادھر ادھر اچٹا ہور بے معنی طور سے گودام میں گھومنا شروع کر دیا۔

ادھر رقیعہ نے بے جگری سے رونا دھونا مچا دکھاتھا۔ آنسو تھے کہ بچے چلے جاتے تھے۔ ساتھ کی سکھی سہیلیاں سمجھانے سمجھاتے تنہا گئیں۔ ”اے بی رو نہیں۔ کیا آج پہلی بار تمہیں پیا کے گھر جا رہی ہو۔“ ”بس سبھی ایسا رونا تو ہم نے کبھی نہ دیکھا۔ ارے یہ تو اتنی بہرائی ریتا ہے، کون لوں آنکھیں کھولنے کے پیچھے پڑ جاتا ہے۔؟“

رقیعہ بے نیکی پن سے بولی۔
”میں تو اپنے ڈلوکے واسطے رو رہی ہوں۔ ہائے! میں چلی جاؤں گی۔ تو وہ تو مری جا لے گا۔ وہ تو میرے بنا روٹی کو سونگھتا بھی نہیں۔“
ساری سکیوں کے منہ مست گئے۔

”ارسی پاگل! سہاگ رات کو دل نہیں دلوں کے سپنے دیکھتی ہیں یا کتوں کے لئے روتی ہیں۔؟ تمہو! کیا یہودی لڑکی ہے۔“
”ہم کو اچھا لگتا ہے جی ہمارا کتا۔ ہم تو مر جائیں گے، ہاں۔“ اور رقیعہ نے دگنی شدت سے تکتا تکتا کر رونا شروع کر دیا۔

سسرال کی طوفانوں نے دلہن کو سمجایا سوارا، زیورات پہنائے۔ میسی افشاں گڈائی، ماں باپ، عزیزوں سے گلے ملوایا اور بے چلیں۔ سچو لوں سے لدی پچھندی موٹریں ایک طرف رقیعہ کے دوہا بیٹھے اور ایک طرف رقیعہ ساتھ میں ساس، تندیں اور دوسری طرف رشتہ دار عورتیں۔ باجوں نہ نہت ہیں موٹریں نہی کی چال چلی رہی تھی۔

ادھر گھر بھر میں ایک دم ساٹا سا پڑ گیا۔ رفیعہ کی مہین مہین آواز نہیں
ختم ہو گئیں۔ ڈوبنے گول گول گھومنا بند کر کے صورت حال کا سنجیدگی سے جائزہ
لینا شروع کیا۔ کمرے میں کاشمیر کا پتھر پڑا تھا۔ کھڑی ہوئی بیچار چار پائیاں
لوڈ کی ہوئی تھاپیاں، میز، ٹالٹو صندوق، الابلا۔ گھر کا ہنٹ بچار سامان
سٹھ سب اسی کمرے میں ٹھونس دیا گیا تھا۔

ڈوبنے بلیوں کی طرح جست و کٹائی اور کھڑی چار پائی پر کود گیا۔
چار پائی سے اچھلا تو دیوار میں اوبھی کیل سے اٹکی چوکی پر لٹک گیا۔ وہاں سے
اچھلا تو روشن دان میں جا بیٹھا۔ روشن دان میں بیٹھ کر گھر کا جائزہ لیا۔ دھیرے
سے قدم اٹھا کر کچھ میل پہ پاؤں جائے۔ کچھ زور پر آہستہ آہستہ چل کر کچھ
نکل آیا۔ آنگن میں مہمان میزبوں کے لئے تخت بچھے تھے۔ اندر کھانا دلانے
ہو رہے تھے۔ آنگن میں کوئی نہ تھا۔ ڈوبتیزی سے اچھلا اور تخت پر کود پڑا۔

موٹر جیوش کی چال چلتی ابھی گھر سے چند ہی قدم پیچھے تھی کہ ڈوب بھی
خاموشی سے برات میں جا شامل ہوا۔ اجنبیوں کو دیکھ کر اس نے جھونک جھونک
کر آسمان سر پر اٹھالیا۔ نہ کسی کو کاٹنے، دوڑا، نہ کسی کو خشک مین نگاہوں سے
گھورا، نہ پیچھے لپکا۔ بوں خاموشی سے پیچھے چلتا رہا جیسے میت کے ساتھ ساتھ
چل رہا ہو۔ باجوں کی تیز تیز دھبڑ دھبڑے باوجود اس کے کانوں میں رفیعہ
کی سسکیوں کی ہلکی ہلکی، سی، سی، سنائی دے جاتی۔

برات سسرال میں جا کر رک گئی۔ براتی بھی اتر پڑے اور دد لہا۔
دلہن بھی۔ جب وہ لہا دلہن سجے سجائے کمرے میں لے جائے گئے تو ڈوب بھی
چپکے سے بیڑھیوں کے پاس دروازے سے لگ کر بیٹھ گیا۔ دو لہا دلہن
کے لئے کھانا آیا، دلہن شرمائی سہمی سی بیٹھی تھی۔ بھلا اپنے ہاتھ سے کیے

کھانے لگ جاتی۔ دولہا بیاں لے اپنے ہاتھ سے بیروں کی طرح کھانا شروع کیا اور دھیرے سے بولے۔
 ”کھاؤ نا۔ کب تک روگی۔؟ اب تو.....“ وہ شرارت سے ہنس کر چپ ہو گئے۔

پہلے تو رفیعہ یونہی بیٹھی رہی۔ مگر جب ان کا اصرار بڑھتا ہی رہا۔ تو اس نے گھونگھٹ کی آڑ سے ہاتھ نکالا اور ایک نوالہ توڑا ہی تھا کہ ایک دم ڈبلو آنکھوں میں بھر گیا۔ رفیعہ کو تو معمول تھا۔ کہ جب تک ڈبلو نہ کھا لیتا وہ نوالہ توڑتی ہی نہ تھی۔
 ہائے وہاں۔ یہ کس نے کھا نا دیا ہوگا۔؟ براقتوں کی گرہیں کسنا تو اس کی یاد آئی ہوگی۔ ہائے نامراد دان بھر سے اس تنگ کمرے میں بند رہنا
 ”بھس، بھس۔“ وہ سہجے سہجے رونے لگی۔ دروازے پر بیٹھ ڈبلو نے اپنی موجودگی کا دھجرا سے احساس دلایا۔

”غیوں، غاؤں، غباؤں غیوں۔“

رفیعہ نے بیتابی سے گھونگھٹ الٹا کر دیکھا کہ ڈبلو تو وہیں دروازے سے نکلا بیٹھا تھا۔ وہ لپکی اور آگ دم دروازے میں پہنچ گئی۔ ہاتھ کی روٹی اس کے آگے ڈال دی اور بیتابی سے ”ڈبلو، ڈبلو،“ کہہ کر پچکارنے لگی۔ اسی دم کمرے میں اسے کس غیر کی موجودگی کا احساس ہوا اور اس نے گھبرا کر چپے دیکھا۔ دولہا بیاں سنکا رہے تھے، شرم کے مارے اس کا جی کٹ کٹ گیا۔
 ”نہ انہی،“ چمکیں سہکائیں اور اس کا منکین سلونا چہرہ پھر سے ایک ہاتھ لپے گھونگھٹ کی ادھ میں چلا گیا۔

میں زبال ڈبلو کی خبر لینے گودام کے ساتھ والے کمرے میں پہنچیں تو

دیکھا روٹی، ہڈیاں اور پانی کا پیار جوں کے توں رکھے ہیں، مگر خود ڈبو
میاں غائب ہیں۔ سارے میں ڈھونڈنا پڑ گئی۔

”کہاں گیا۔؟ کدھر گیا۔؟ کہاں گیا۔؟ کدھر گیا۔؟“

”سجھاگ گیا ہوگا۔“ کسی نے سنایا۔

”اے لو، بات سنو۔ سچلاکتے بھی کہیں گھر چھوڑ کر جاوے ہیں۔؟“
کسی بڑی بیٹے کہا۔

”تو پھر دلہن کا پالا تھا۔ دلہن کے ساتھ چلا گیا ہوگا۔“

”دوئی کتا ہی تھا۔ بلی تو نہ تھا کہ اچک کر روشنہ ان میں سے باہر

کو بولیا۔“

”نا مراد نے کہیں جان تو نہیں دیدی۔“ طاہرہ بیگم نے ہولی کر سوتیا۔

”اگر وہ گیا تو سمجھو ریجہ بھی گئی۔“ انہیں کسی بلی قرار نہ آ رہا تھا۔

دس بجتے بجتے جب سسرال سے دلہن کی دالپی ہوئی تو ڈوبو میاں
آگے آگے جھونٹتے جھانٹتے چپے آ رہے تھے۔

”ہائے یہ تیرے ساتھ ہی چلا گیا تھا۔؟“ اماں نے جہرت سے

پوچھا۔ ساتھ ہی کبھی سہیلیوں نے جب کمر بد کرید کر سہاگ رات کی باتیں

پوچھیں تو رنجیدہ لے کتے کی باتیں نہ کیا وہ کہیں اور دوہا کی کم۔

”تھو۔ ایا سبھی کوئی کیا کرتا ہے۔؟ یہ لڑکی تو نرمی پاگل ہے۔ ہوشہ۔“

طاہرہ بیگم اور ضمیر میاں نے سوچا تھا وہاں سسرال والے کپت

میں اور کتے کو کس نگاہ سے دیکھیں۔ مگر سسرال والوں نے تو اس بات

سہ کوئی نوٹس ہی نہ لیا۔ کتا رہتا نہ رہتا۔ ان کا کوئی اعتراض ہی نہ تھا۔

رد نہا میاں اپنی نرگس سلونی دلہن کے علائقہ تھے۔ انہیں بلی پیار کی

تھی۔ اس سہکتا بھی پیارا ہونے والی نرگس سے گھر بھرے میں اپنی جگہ

جانی کہ کسی قسم کی ناامیدی کا سامنا ہی نہ کرنا پڑا۔

رفیعہ ایسے گھر میں پیدا ہوئی تھی جہاں آگے پیچھے کوئی مدد تھا۔ لے
دیگر اس کی ذات سبھو ن کے پیار کا مرکز تھی۔ نانی ہیں تو تشار، باپ ہیں تو
ہر جا بے جا ہند پوری کرنے کو تیار، اور ماں تو ماں سمجھیں سبھو لے سبھو کبھی
چھڑک سبھی دیتیں تو پھر ایک گھنٹہ آئندہ بہانیں کہ "ہائے میں نے اپنی لادو
کو کپول جپر کی دی۔"؟

اب ننگ اس نے صرف پیار کے سجانے، چاہے جانے کی لذت ہی چکھی
تھی۔ پیار کرتے ہیں۔ چاہتے ہیں جو مزد تھا اس کا اسے علم نہ تھا۔ دوہرایا
اسے یوں دل و جان سے چاہتے تو وہ بھی اپنا پیار لٹاتی۔

"پیار کرنا بھی اتنا سبھلا ہوتا ہے۔" وہ اپنے آپ ہی سوچے جاتی۔
ماں باپ سے فدا کر کے ہر بات پوری کر دالینا اور تھا، اور اب میاں کی
فدا پوری کر دینا اور۔ اس کر لینے اور کرو سینے میں کتنا بڑا فرق تھا! اب
نیک وہ ماں باپ سے خاومت کرواتی آئی تھی، اب وہ خود کسی کی خدمت
کرتی تھی اور اس میں لطف بھی لیتی تھی۔ بچپن میں گمڑیاں کھیلی تھیں نہ
کلیسا پکانی تھی۔ جھوٹ موٹ کے گھر کی دیکھ رنجیک کی تھی، اب سارے میں
جان پڑ گئی تھی اب یہ سب کچھ جتنی جاگتا ماحول بن گیا تھا۔ میاں بے
زبانی نہ تھی، خاموشی اور دیوانی نہ تھی۔ ماس، مسرے، نند، دیور اور
سپر سب سے بڑھ کر اپنا پیارا دلہا۔ ان سب کو اور سب سے بڑھ چڑھ
کر میاں کو پیار کرنے میں، ان کی خدمت کرنے میں اس کو عجیب لگات آتا
اور پہلے کے پہلے ہر ہر کام لپک لپک کر، کر دینے میں اسے بڑی خوشی ملتی۔
اس خوشی میں وہ ہر لمحہ ڈوبی رہنا چاہتی۔

اس دن معین میاں آفس جانے لگے تو ساڑھے نو بجے رہے تھے۔
پانے دس بجے آفس پہنچ جانا پڑتا تھا۔ رفیعہ نے ناشتہ میز پر لاکر رکھا
تو ہنس کر بولے۔

”تھناری وجہ سے آج آفس کو دیر ہو گئی۔“

”کیدل، بیڈ نے کیا کیا سبلا۔؟“ وہ حیرت سے بولی۔

وہ منہ سچٹ بن سے بولے۔ ”بھئی نوبجے تک تو ہم ایک ہی ایم تن کے ساتھ تھے۔“

”ہائے ہائے،“ رفیعہ شرمناک بولی، ”ایسی ہیان کم، بائیں بھی نہ کیجئے۔“

کوئی نے تو کیا بولے؟

”اچھا۔“ ”معین میاں ہنس کر بولے۔“ ”ہوا سو ہوا۔ اب تو جلدی

سے ناشتہ کر لیں۔“

معین میاں نے آج تک کبھی دلہن کے بغیر نوار نہیں اٹھایا تھا۔

اب اس وقت گھڑ دیکھ کر رفیعہ بولی۔

”صرف ایک پراسٹا تو میز پر ہے، اتنی جلدی میں ساتھ کھانا لیا

کیا ضروری ہے؟“ اجسی ماما پکا کر بھیجتی ہے۔ آپ کھائیے، انے بیاد۔

آجاتے ہیں۔“

”ناکھئی ہم اکیلے نہ کھائیں گے۔ چپہ وہ ایک نوار ہی کیوں نہ ہو۔؟“

”اور جو آفس جانے میں دیر ہو رہی ہے۔؟“ رفیعہ منہ لاٹھے پوچھا۔

معین میاں نے اپنے منہ بولے میں اس کی نازک کھائی دہچھائی۔

”بھوگی یا پھر رات کی طرح۔“

”ہائے ہائے، آپ اس قدر بے تکی ہیں۔؟ اب یہ رات۔۔۔“

یاد لگنے لگا کون تو قہ ہے۔؟“ اور رفیعہ نے پیدا جھری شرمیلی نظر لیا

سے مہال کو دیکھتے دیکھتے نوالہ منہ میں رکھ لیا۔
رفیقہ نے آج تک کبھی ڈلو کے بغیر نوالہ ڈاٹھا یا کھا سیر نہیں
کے نیچے بیٹھے ہوئے ڈلو نے پچلے تو ذرا حیرت، اور پھر ناگوار سی اسے رفیقہ
کو دیکھا۔ ہاں وہ کیسی ہی تو کھا رہی تھی۔ آج اسے ڈلو کی یاد نہ آئی۔ ڈلو
نسبے چینی سے دم ہٹائی اور وہاں سے اٹھ کر مہندی کے پودے نکل جا
سٹیٹیا۔

ناشتے کے بعد نوکر نے جھوٹے ہرنس اٹھائے اور مہندی کے پودے
تے جھوٹے ٹکڑے اور ہڈیاں ڈال دیں۔ ڈلو نے نفرت سے اٹھا کر ہوائیں
کچھ سونگھا اور پھر گردن دبا کر سوننا من گیا۔

دوبچے کے کھانے کے بعد اچانک رفیقہ کو ڈلو کی یاد آگئی۔ دکابی
ہیں روٹی اور گوشت کی بوٹیا اسے کہ وہ مہندی اتارے تو پھر ڈلو نہ اس
کی آمد پر کسی قسم کی خوشی کا اظہار نہ کیا۔ ٹانگوں میں گردن دہانے پر نہ ہی
ٹپرا دیکھتا رہا۔ رفیقہ اس کی ناراضگی کی وجہ سے ہانسیاں کھینچ رہی تھیں۔
”ڈلو راجہ کو غصہ آگیا۔“ اور ٹکڑے سامنے ڈال کر بولی۔ ”اوپر
ایک کھا جی لو اور ختم کر دے۔“

ڈلو نے اٹھ کر دو تین پینتڑے ہرے اور پھر پڑ گیا۔
”نہیں کھائے گا۔“ رفیقہ نے ذرا تیزی سے پوچھا۔

ڈلو نے مالک کو دیکھا تک نہیں۔

”اچھا یاد رکھو۔ تو نہیں کھائے گا تو میں سچ مر جاؤں گی۔“

اکہم ڈلو اٹھ بیٹھا۔ دم گھما گھما کر دو تین چمک پھیریاں کھائیں اور
روٹی پر پڑ گیا۔

اس دن تو یہ ہوا تھا کہ ناشتے کے وقت ڈبو بھلایا گیا تو کہیں
دوپہری کو یاد آیا، اب تو یوں ہولے لگا کہ ڈبو بھوکا ہی ہے۔ دو دو وقت
گزر گئے ہیں مگر مالکن کو یاد ہی نہیں آ چکتی کبھی : ن بھرے میں ایک
آدھ بار یاد آ گئی تو وہ دوڑی دوڑی آئی اور اپنے مرنے کا ڈراما دارے کر
اسے کھڑا پر مانی۔ لاکھ لٹا سنا، مگر محبت اور نفرت کا رو بہ خوب سمجھتا تھا۔
جانی گیا کہ اب اس کا ایک اور دعوے دار پیدا ہو گیا ہے۔ یہی نے ہی کئے
کو نظر انداز کر دیا تو محضوں کی جوئی کو غرض پڑی تھی کہ داری مدتے
جانا۔ پہلے جہاں معین میاں آفس سے آنے ڈبو نپکا پڑتا اور پیر
اور بزنوں کو والی سے بھگو جگر دنیا۔ اور وہ سب پیار سے جھکا رہتے۔
اب جب کبھی موٹر سائیکل گھر گھڑائی اور دروازہ کھٹکھٹاتا تو ڈبو پوچھ
مہندر کتنے سو بیا نہا پڑا رہتا۔ معین میاں نے اس کی اس تہری کو مانتا
نہا کیا۔

ڈبو کی خاتون بی بی محمد بی بی نہ آتا تھا کہ اپنی پہلی بیہوشی کی اتنی رقیبہ
کو کہا ہو گیا ہے کہ ابتر سے لگ گئی ہے۔ کہا یا پیدا سب، ابجائیالی سے لے کر
اٹھل دیتی ہے۔ کہانے سے دو بہان نہ پٹنے سے۔ بی بی دمیو دب پکے سے کے
ڈبیر میں اس نارنجیوں کے پھلکے دکھائی پڑتے، ورنہ پہلے تو ہاریاں سب
ہوتی تھیں اور روڈ کے آخر سے بھی کچھوڑنے کے ڈبیر میں۔ ہر بار حجاب
خانے کے پیچھے لگا رہتا تھا، اس میں تو خیر اب بھی وہی نعمتیں چھپی رہیں
مگر یہ رقیبہ کے کمر کے ساتھ دالے ڈرام میں اب بے دے کے وہی
نارنجی کے چھلکے، انار کے چھلکے۔ معین میاں دھن بی بی کے آگے کچھ ہوتے
بھی بچے جاتے بس نہ چہا کہ ب کے سامنے گور میں بد لیتے۔ مانتا ہے ر

دلہن بی بی کو اد، اد، کر کے ایکائیاں آتیں، تے ہونے لگیں۔ ادھر سے
 ساس دوڑی آتیں، ادھر سے مند۔ ادھر بھر خود دلیا میاں! ڈلوکی نینداں
 دنوں اور سبھی اچھی اچھی سی ہو گئی۔ رات بھر چوکسی سے جاگتا رہتا۔

پھر ایک رات اندھیرے کو چیرتی دلہن بی بی کی چھینیں سارے پھیل
 گئیں۔ سارے گھر میں جھگڑا مچا۔ نوکرا ادھر ادھر دوڑنے لگے۔ ڈبو
 مہندی تلے لیٹا سارا نمائش دیکھتا رہا۔ پھر ذرا ملے فانی تھا اور اندر سے
 ہمیں مہین چیموں کی آواز بنی آنے لگیں۔ جیسے دلہن بی بی کسی بڑے چھوٹی
 ہو گئی ہوں اور بار یک آواز سے روتی ہوں۔

ڈاکٹر ڈی باہر نکلی اور مہین میاں سے مسکرا کر بولی۔

”گرم۔ بائیں چھوٹی سی، مدر کی کاپی۔“

”مہین میاں کھڑے کھڑے زرد سے اچھیلے۔ پھر ماں کی موجودگی
 کا خیال کر کے شرمندہ ہو گئے۔“

رفیقہ نے اب تک گڑبولوں سے کھیلا تھا۔ کتے سے کھیلا تھا، میاں
 سے کھیلا تھا، مگر اس قسم کی عجیب و غریب زندگی بھر کی مسرت کے برابر
 تھا۔ جس کی آتی جاتی سالن اس کی اپنی زندگی کا پیغام تھی۔ بچی کے دم
 ولب میاں بیوی اور قریب آگئے۔ مہین میاں آفس سے بدول ہوئے۔
 اتوار کے انتظار میں رہے جلنے۔ اور جب انوار آتا تو نینوں، ماں،
 باپ اور بچی، کمرے میں ٹھہرے لگاتے، سکرانے، جنتے پھر شام کو بیٹا رانی
 اور آدو ہانڈو سا باپ، سیر کو نکل جاتے۔

بچی ابھی ماں کی گود میں، کبھی باپ کی گود میں۔ مہین میاں پہلے ہی
 کیا کم رفیقہ کے دیوانے تھے، اب تو بائیں ہی مٹ کر رہ گئے۔ اس نے انہیں

ایک عام آدمی سے اکدم باپ کا درجہ دے دیا تھا۔ اور در فیضہ بی بی کو ماں کا رتبہ معین میاں نے دم قدم سے ہی ٹوٹا۔ دونوں کی محبت پہلے سے دگنی ننگنی ہو گئی۔ اور بھی ان کی محبت کا زندہ ثبوت تھی۔ ایک ستارہ ٹوٹا جائے تو آسمان سونا نظر نہیں آتا۔ دوسرے ستارے اس کی کمی پورے ہی کر دیتے ہیں۔ ڈبوایا ہی ٹوٹا ستارہ تھا۔ جس کی کمی رنجہ نے محسوس نہ کی۔ در فیضہ کے دل کے آمان سے ٹوٹ کر گر بھی گیا تو کیا تھا۔ وہاں دو دو ستارے چمکتے تھے۔ آسمان کی روشنی میں کیا فرق پڑا۔ وہ اس کی زندگی سے دور۔ دور۔ اور دور ہوتا گیا۔ ہو گیا۔ مگر معین میاں اور پھر سنی کی زندگی نے سارے اندھیرے احواوں سے بدل کر رکھ دے۔ ایسے ستارے کا غم کون کونتا ہے۔ کون کرے؟

انسان اور جانور کا سوال نہیں ہے۔ سوال ہے محبت کا، جو کسی کی بیٹھری تکاد برداشت نہیں کر سکتی۔ اس کی پروا کی مسالہ نہ ہی نتیجہ یہ تھا۔ کہ ڈبو دوں باپ بیٹی کا دشمن بن گیا۔ اس کی حیوانی غفلت نے اسے یہی سمجھایا کہ جس طرح بن پڑے انہیں سنائے۔

ڈبو کو چیزیں نہ ہیں اٹھا کر ادھر ادھر لانے کی عادت تو ہوتی ہی۔ معین میاں جوتے اور موزے انا کر رکھتے تو دو موزے منہ میں اٹھا کر باہر لانا اور ادھر ادھر پھینک دیتا۔ وہ آفس جانے کو اٹھنے تو مارے میں ڈھونڈ رہا پڑ جاتی، موزے بھی نہ ملنے۔ ڈبو رب کو پر ایٹان دیکھ کر مارے خوشی یہ چمک پھیر پاؤں کھالے لگتا۔ کبھی بین میاں کے جوتے اٹھا کر کچھڑ میں پھینک آتا۔ کبھی مانی نظر آ جاتی تو چبا کر رکھ دیتا۔ کبھی دونوں میاں بی بی کی جہان ایمان سنی۔ اس نے جی کو بھی

اپنا دشمن تصور کر لیا۔ وہی تو ختی جو کاٹا بن کر آگئی تھی۔ ورنہ رقیبہ جس نے اے پھولوں کی طرح رکھا سنا۔ اس کا ٹپن کی طرح تکرار بھی سنی ڈوب اس کی ساری چیز جہاں دہر دکر دیتا۔ رقیبہ کی آنکھ بچا۔ بچی کا سارا دودھ پی جانا، بوتل میں لگا پل چبا ڈالتا۔ رقیبہ پریشانی ہوتی۔ غصہ ہوتی تو دور بیٹھا چیکیلی آنکھوں سے اس کی کارورہ الی دیکھ جاتا۔
 اب دل کتنے نہیں ٹائم میں سے شاپر ہی کوئی وقت الیا آتا جیسا رقیبہ ڈوب کر روئی ڈالتی ہو۔ نوکر ہی کھانا اور پانی لاکر سامنے ڈالتا دیتے، کھائے نہ کھائے کبھی کبھار پتی کو لئے دے اور وہ اسے دال دلیں جاتی تو شیر میوں سے اتنے اتنے اسے چرکار کر پوچھ لیتی
 "کیوں ڈوب کھانا کھا لیا۔؟"

شاید اس کے دل میں ابھی ستھوڑی بہت محبت باقی رہ گئی تھی۔
 ڈوب کی شرارتیں سد سے بڑھنے لگیں۔ مگر رقیبہ پر یہ سبید نہ کھلا۔
 گھر میں نہ کبھی ایک نہ دہ پور۔ سات بچے تھے جو دن بھر دل بچانے اور صحتیاں کرتے۔ ایک دن ان میں۔۔۔ کسی نے اس زور سے ٹھیکڑ مارا کہ ڈوب کی ٹانگ میں انا بڑا نہ تم لگ گیا۔
 آئی سے کئی دلوں پہلے نانی اماں نے پتھر پھینچ مارا توخا تو رقیبہ پر دلوں کی فینہ حرام ہوئی تھی۔ آٹ پھر اس سے نہ تم لگ گیا توخا۔
 باہر آئی اور بھولی کو ڈھپ کر بولی۔
 "توبہ! اتنے سمندر ہو، بے زبان کو مارنے شرہ تو سہس آتی
 ذرا سی۔؟" اور وہ نوکر سے کہہ گئی۔

'رحیم' ذرا اس کی خبر لیتے رہنا۔ زخم ٹھہ جائے تو جلد ٹھیک نہیں ہوتا۔
 رحیم روزانہ ایک سڑا ہا مرہم تقویٰ جاتا اور ڈوب اس کے

اوندیاد ہوتے ہی زخم کو نوچ نوچ کر پھر سے ہرا کر لیتا۔ زخم بڑھتا رہا۔
نگہِ رفیعہ کا دھیان ارہر گیا ہی نہیں، کیونکہ اودھ منی کی طبیعت خود
خراب تھی۔ دونوں میاں بی بی کا سارا سا وقت بیٹیا رانی کی تیمارداری
میں صرف ہو جاتا تھا۔

ڈوبنے زخم کھر مٹا چھوڑ دیا۔
زخم اچھا ہوا تو ڈوبو اور زیادہ شیر ہو گیا۔
سارے فساد کی جڑ تو مٹی ہی تھی۔ اب تو مٹی کے ریشمی قیمتی فراک
گم ہو جاتے، جوتے غائب، دودھ کا بگونا خالی۔ نہیں پھٹے چیمے۔ رقبہ
نے ایک دن الجھ کر یہاں سے شکایت کی۔
"بھئی یہ آپ کی آپا کے بچے اس قدر شیطانی ہیں، دیکھئے نا۔
منی کے سامان کی گشتاں بن گئیں نہیں تو پیٹے ہوئے۔ چیمے ہوئے
فراک غائب، جوتے گم، کھلونے کیچھڑیں۔ کوئی ایک بات ہے۔"
معین میاں نے سبھا بنجوں سجا بنجیوں کو بلا کر ان کی پرہیزی تو
وہ دیرے ٹپ ٹپا کر ان کی طرف دیکھنے لگے۔

ماموں جان پہنے تو ایک چیز کو بھی ہاتھ تک نہ لگایا۔
"شرارت کرنے کرتے ابنا جوتے بھی بولنے لگے۔" رفیعہ نے جل
کر میاں سے شکایت کی۔

ایک دن ڈوبو میاں اکیس منی کا بنیا پیل بھاڑے کی کشتش میں
مصرف تھے کہ رفیعہ کسی کام سے اودھ کل آئی۔ اس کام سے فراغت ہوئی
تو دودھ پر پل پڑا۔ وہاں سے بٹے تو رفیعہ کی آنکھوں میں خون اتر گیا۔
"ہوں، تو یہ آپا کی کارستانی تھی۔ اور بچے میچا رہے، رماحقہ ہی

ملعون ہوتے رہے۔"

ڈپٹ کر اس نے رحیم سے کہا۔ "نے جا کر نہیں تھے یہ مضبوطی سے باندھ دے۔" خبردار جو کھلا رکھا۔

ڈپٹ کے دانت خائے تیز تھے۔ اس نے تھوڑی ہی دیر میں رسا چرا
ڈپٹا اور سچے سچے بیویوں کے پاس موجود! رفیقہ نے، انتہائی کچھپا کمر دیکھا
اور دس کا نوٹ سپینیک قہقہے بولی۔

"رحیم، جا لو پہ کی زنجیر خربہ لا۔"

اب دن کبھر ڈپٹیاں زنجیر سے بندھے رہتے۔ نوکر بوٹھی جائے
ڈال دے، کھانا پڑتا۔ دو ایک دن تو بڑی بھلہ ماسٹ سے گزارے
چرا، جو کھانا شروع کیلے تو زمین آسمان ہل رہے۔ رفیقہ تو مزہبی
جانی تو زنجیر کھلائی، مگر کچھ نکلنے کی آواز سنائی کہ ادھر سے، سوتے ہیں
چونچنے اور ڈر ڈر کر بیچیں ماسے لگی۔ ماں کا دل کیسے برداشت کرنا؟
ڈپٹیاں پھر آزاد تھیں۔

کس چیز کو چین نہ رہا۔ کھانے کی چیزیں نہیں، پینے اور کھانے کی چیزیں
چرا، چابی، کھولنے، ادھر ادھر۔ ڈپٹوں سے گھر کا تین آرام تھا،
برہادر دیا۔

رفیقہ اتنے پر بھی سن کر مین، مگر ایک دن تو ڈپٹوں سے غیب ہی
کر دیا۔ رفیقہ کسی کام سے سنی کو اکیلا چھوڑ دانا میں آئی، واپس جڑ کر
یہ آئی تو کیا دیکھتی ہے کہ ڈپٹوں سے گھر۔ بیٹھا منہ پر جو کھا ہوا
تھا اور اپنے پیچھے سے منہ کے سکاروں پر چپٹی لٹا رہا تھا۔

"ڈپٹو!" رفیقہ پوری طاقت سے چلائی اور ڈپٹوں سے اسے کمرے

سہ پاؤں بچھ گیا

رات کو دم معین میاں سے بولی۔ "دیکھئے یہ ڈبو تو پڑا خطرناک
ہوتا جا رہا ہے۔ آج صبح کو اپنے بچے سے مار رہا تھا۔ ایسے تو وہ اس کی بہن
سے لے گا۔ آپ اسے لہریں اور چھٹکوا دیجئے۔"

معین میاں نے ذرا حیرت سے رفیعہ کو دیکھا اور بولے۔ "تم اس
ن سبھی کی بات نہ کرتی ہو رقی، سمجھ لا کتے کہیں اپنا گھر بھولتے ہیں۔"
"دور۔ بہت دور چھٹکوا دیجئے نا۔ شہر سے باہر پھر کیسے آئیگا۔"
"کتے بڑھوں اور بھی گھر ڈھونڈ لے نکال لے پیارے۔ تم واقعی بچوں
کی طرح سوچتی ہو۔"

مگر رفیعہ نے اتنی ضد کی کہ معین میاں کو ناں کھتہ بن نہ پڑی۔
ان کے کوئی دوست باہر جا رہے تھے۔ ڈبو کی زنجیر ان کے ہاتھ میں دبک
گئی اور کہنا۔ "رہیں بابا شہر سے بہت دور ہے جہاں تو اسے راستے میں۔
اندھیرے میں کہیں اتار دینا کہ راستہ کی پہچان نہ رہے۔"

اب گھر میں تھا اس سنا۔ دودھ جوں کا توں ملتا۔ پینا ہی پیسے
ہوئے نہ ملے۔ موزے، بونٹے، کونٹے، فراک سب اچھی اچھی جگہ رہتے
ڈبو نے گدی میں جو اس آئری پھیلا دی تھی اب وہ غم ہو چکی تھی۔

ایک دن رفیعہ منی کو گود میں لے آئیں میں بیٹھی تھی کہ سانس سے
ڈبو آنا نظر آ گیا۔ جسم کی ساری ہڈیاں نمودار ہو رہی تھیں۔ زنجیر لگے میں
لگسٹ رہی تھی۔ زبان دھکی ہوئی اور روئیں دار جسم جبکہ جگہ سے بچا
ہوا۔ آگیا، ننھوڑی دیر کھڑا رہ کر فو پیا دیکھ رہی تھی ہر اسے مانگن کو دیکھنا
رہا۔ بیٹھ کہتا ہوا۔

”ایسی بھی بے مروتی کوئی کیا کرتا ہے۔!“ اور جا کر مہندی تے بیٹھ گیا۔

رفیقہ کی ٹھٹھکی جو ٹوٹی تو اس کے منہ سے ایک سہمی ہوئی چیخ نکلی۔

”ہائے وہ کچھ آگیا۔“

گھر کا چین پھٹ گیا۔

منی کا بوٹن کمر سم ہو گیا۔ الٹا مٹا۔ میکے والے بچائے تھے اور سہ سال والے بھی جمع تھے۔ رفیقہ کا رنگ اڑا اڑا تھا۔ اماں نے برت سے پوچھا۔

”کیا بوابی بی، ایسی باڈی کیوں نظر آ رہی ہے۔ گھر میں سب اچھے

تور تے ہیں تاثر سے ساتھ۔؟“

رفیقہ نے کتے کی ساری زادات کہہ سنائی۔ سبوں کے سامنے ذکر چل نکلا۔ اماں غصے سے بولنے لگیں۔

”ناراد سے تبھی کہا تھا نہ پانی۔ اب کو کھ میں درد پانتی رہ بیٹیا

کر چبا کر نہ پھینک دے تب مجھے کہنا۔ پہلے تو اتنا منہ دکایا کہ اولاد کی طرف سپاہا اور اب منہ پھیرا یا تو وہ کہاں پر داشت کر بیگا۔“

رفیقہ نے کانپ کر کانٹوں پر ہاتھ رکھ دیے۔ ”ہائے اماں ایسا نہ

کہیے۔ پھر میری زندگی میں کیا رہ جائے گا۔؟“

”میں ترکہتی ہوں کیشتی والوں سے کہہ کر زہر کھلوادو۔“ ساس

خدا رائے دی۔

۔۔۔ اچھے لڑے بچہ کو پہلی بار ادھر کا درد پھر پڑنے کو بوٹن کیجے ہوا۔

”اے نہیں ایسا غضب بھی نہ کرنا کہیں۔ امانت ہے۔“
 ”پلیہ روت پونہی منڈ لا منڈ لا کر گھر پر سے کہ تباہ کر دیجی۔“
 ”پھر امرا کوئی حل بھی ہے۔“ ”میں میاں بے بی سے نواسہ۔“
 ”ہے تو بس یہی کہ رفیعہ اس سے دایا ہی پیا کرے۔“ امانت نے
 اپنے تجربے کی بات بتائی۔ ”ہم بوڑھے ہو، آنکھوں سے ایسی باتیں ہم نے
 دیکھی ہیں۔ حویلی والے اعظم میاں نے ایک..... وہ اپنی یادداشت سے
 کوئی قصہ اکبر نے لگایں۔“
 مگر رفیعہ کے لئے یہ ناممکن تھا سبھلا جسے اس کی بچ کوما ڈالنے
 کا نتیجہ کہ لیا ہو وہ پیا۔ کئے جانے کا مسخ تھا۔ ۵۰ جہ کی زہر بھٹی کہ
 کیسے مٹی کو طمانچے لگا رہا تھا۔
 ”اب آخری حل یہی ہے کہ مٹی کی (چھی طرح حفاظت کر۔) اے
 اکیلا پیوڑ دہی مت۔“
 ڈبلوی دشمنی بولی کی توں برقرار تھی مگر اب ہوتا بہ تھا کہ اسے
 موقع ملتا تھا۔ رفیعہ ہر دم بھی کسے ساتھ رہا یہ نبی گھومنی رہی۔ اب
 کچھ نہ گھنٹوں گھنٹوں ریگنا شروع کر دیا تھا۔ سارا کائنات ایک
 کمر ڈالنا۔ رفیعہ بھی اس کے ساتھ ساتھ سبھو کی نبی پاتنی دیتی۔ کبھی مٹی
 سو جانی کہ رفیعہ اس کے جاگے تاک۔ پانے کے پاس بھی رہتی۔
 گریباں اپنے شباب پر تھیں جس کی ٹیلیاں لگیں، پانڈا بھڑکا۔
 ہونا، بجلی کے ٹپکے چلتے، ہاتھ کی ٹپکھیاں چلتیں۔ مگر گرمی جوں کی توں
 بحال۔ گرمی نے لوگوں کے اس گم کر دیئے۔ مٹی پانچے بیٹے کی مٹی گول
 مٹولی، گرمی نے اسے بھی مٹھ کے رکھ دیا۔

"اس دن رات کے کوئی سات آٹھ بجے تھے۔ دونوں میاں بی بی کمرے میں باتیں کرنے بیٹھے تھے منی پالنے میں مرے سے سو رہی تھی۔

"ہٹ سالی گری۔" "میں میاں شرارت سے بولے۔" "کمرے میں تو سو ہی نہیں سکتے۔"

"آپ تو جب کرتے ہیں شرارت کی بات کرتے ہیں۔" رفیعہ شرما کر بولی۔

"ارے اس میں شرارت کی کیا بات ہوئی سبھی بکھنے آئیں

میں سونا پڑنا ہے۔ نہ ہی بچی کا ساتھ اور ڈوکم بخت کا ڈر۔ اگر کمرے میں سوتے رہتے تو کاہے کی فکر تھی۔" اور اسنوں نے شرارت سے

رنگہ بٹ کا دھواں رفیعہ کے کانوں پر اور آنکھوں میں چھوڑ دیا۔

رفیعہ نے آنکھیں من منائیں اور لپک کر ان کے منہ سے سگریٹ

کھینچ لیا۔ "تو ہے اگر می تو غضب کی ہے اور سگریٹ دھونکے جارہے

ہیں۔ بکھیرے جا رہے۔ ابھی کبھی کیا گندی لت۔" اور اس نے جلتا ہوا

سگریٹ دور اٹھا کر پھینک دیا۔

میں میاں ہنسے۔ "سبھی تم نے جو سگریٹ پھینک دیا تو دس سا کچھ

دوسرا بد رکھی تو ملنا چاہیے۔"

رفیعہ ناز سے بولی۔ "بس چین سے سو جاؤ۔ بد لہ دل کچھ سبھی نہیں

ملے گا۔"

میں میاں نے گردن اٹھا کر باہر کو جھانکا اور بولے۔ "ابھی تو باہر

بتر ہی نہیں بچھے ہیں۔ کہاں سوٹیں۔"

"یہیں سو جاؤ۔"

"اتنا گرمی میں۔"

"ہونہ، باہر تو جیسے برت پا رہی ہے نا۔ آپ لیٹے۔ میں نکلتا
جھپکتی ہوں۔"

معین میاں ناں ناں کرتے ہی رہے مگر رفیعہ نے انہیں پرہیز کرنا
دیا۔ اور خود بازو میں بلیڈ کر نکلتا جھپکتا مٹی۔ معین میاں جی آنکھیاں بند
ہونے لگیں اور غور رفیعہ کو بھی اونگھ آگئی۔

اک دم شہید گری اور آپنے سے دونوں گھبرا کر اسٹو پیٹے دونوں
نے ہڑبڑا کر دیکھا۔ دل لال شعلے بلند ہو رہے تھے۔ نوحہ کی مٹی پارمی کی
پوری جہل رہی تھی۔ کھونٹوں پر لٹکے کپڑے کیباؤں سے اٹکتے کرتے ڈاک
سار پین دھرا دھرا جل رہی تھیں۔ میری سے معین میاں نے رشتہ کیا
ہاتھ پکڑا اور گھسیٹ لیا دم گھونٹ دیے والے دھڑپیں میں رفیعہ نے ہاتھ
چھڑانے کی کوشش کی "میری منی۔"

مگر معین میاں نے بانگ اے گھسیٹ کر باہر ہانچے تھے۔ چنگ پھاڑ کر
سارا گھر باہر جت ہو گیا۔ آپنے اونچی ہوتی جا رہی تھی۔ ناں نیلے شعلے اور
ادر اوپر ہونے جا رہے تھے۔

"اے میری منی۔ اے میری گویا۔ اے رفیعہ گلا پھاڑ کر چپکے
جا رہی تھی۔"

ڈبلو بھی گڑبڑا کر آکھڑا ہوا تھا۔ معین میاں بدحواس کھڑے
بلے بسی سے بیٹے اونچے شعلے کو دیکھ رہے تھے اور رفیعہ اپنی سیدھ پر
سجول کر چپکے جا رہی تھی۔

"اے میری منی کو کوئی نکال ناؤ۔ اے میری گویا کو کچھ بھی
کر کے بچاؤ۔"

اتنی سستی زندگی کس کی تھی جو جلتی آگ میں کود پڑتا۔ رفیعہ کہہ
حواس دیکھ کر ڈوب کر آنکھیں چپکے لگیں۔ مارے خوشی کے حوان غول گھومتا
لگا۔ اس نے سہا سب لیا کہ اور تو سب ہیں، بس منی نہیں ہے۔ رفیعہ کی
آنکھوں میں آنسو دیکھ کر وہ اچکنے پھدکنے لگا۔

رفیعہ کے چہرے پر لمبے لمبے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ چپاتی پیٹ کر
بولی۔ ”ہائے میری منی! میں تو تبھی لے آتی تھی۔ مگر میرا ہاتھ پکڑ کر
گھسیٹ لائے۔ ہائے۔“ وہ ہلک ہلک کہہ چپاتی پر دو ہنسا رہی تھی۔
سب سن کھڑے تھے۔ آگ بلند ہوتی جا رہی تھی۔

”میں لاتی ہوں اپنی منی کو۔“ وہ ہلکی۔ مگر مدین میاں نے اسے
جکڑ رکھا تھا۔ اس نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی مگر بیک وقت
کئی ہاتھوں نے اسے جکڑ لیا۔ ساس چلائی۔

”دلہن پاگل نہ ہو۔ پیٹ میں جو نہنا جی۔ اس کا تو خیال کرو۔
ایک کے پیچھے اسے بھی گنوا دو گی۔“

”مجھے چھوڑ دو، میں لاؤں گی اپنی بچی کو۔“ وہ اچھل اچھل کر خود
کو آزاد کرانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

”پاگل نہ بنو رنی۔“ مدین میاں دکھ بھرے لہجے میں اسے سمجھاتے
ہوئے بولے۔ ”بچی کی جان نہاری جان سے بڑھ کر نہیں ہے۔ خدا کو
بھی منظور تھا تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔“

”نہیں نہیں، نہیں۔“ وہ چیختی ہوئی بولی۔ ”میں جاؤں گی۔
نیچے کوٹا نہیں رکھ سکتا۔“

ڈوبو خوشیا سے گول گول گھوم رہا تھا۔ آج اس بے زبان کی ماں

خدا نے سن لی تھی کہ رفیعہ کی مانتالیوں کلب رہی تھی۔
 "اے مجھے چھوڑ دو۔ مہنی کے بغیر میری زندگی میں کیا رہ جائیگا۔
 خدا کے لئے مجھے نہ روکو۔"

سائیں سائیں آنچ پک رہی تھی اور رفیعہ بھیانک آواز سے چیخ
 رہی تھی۔ چیخ جا رہی تھی۔

"خدا کے لئے مجھے چھوڑ دو۔" وہ چلتے کرے کی طرف پک کر بولی۔
 "مجھے چھوڑ دو، ورنہ میں مرجاؤں گی۔"

گول گول گھومتا۔ اچکنا ڈبوا کدم کھڑا ہو گیا۔

"ورنہ میں مرجاؤں گی۔! ورنہ میں مرجاؤں گی! ورنہ میں مرجاؤں گی۔"

آگ میں تیزی آگئی تھی اہلال لال شعلہ ہر سمت برسے آ رہے
 تھے۔ اس نے ایک نظر دئی ہوئی رفیعہ پر ڈالی اور سپر اک دم دو تین چمک
 پھیریاں کھا کر دم ہانا اندر کو بھاگ گیا۔ رفیعہ کے بھنی جا رہی تھے۔

اندر کمرے کی ایک کڑی دھیرے سے گری اور ادھر رفیعہ کا دم بھل
 گیا۔ اس کی سانس وہیں رک گئی۔ وہ دیدے پھاڑے کرے کی طرف
 دیکھ رہی تھی کہ اک دم سبکڑیوں پر ڈلو نو وار ہوا۔ گد پلا اس نے
 منہ میں یوں پکڑ رکھا تھا کہ ایک جھوٹی سی بن گئی تھی۔ وہ اپنی جان
 سے ذرا جھولی کو گھسیٹتا ہوا تیزی سے بیڑیوں سے اترا۔ اس نے

ادھر ادھر کان پٹپٹا کر دھو بہا سے بچنے کی کوشش کی اور ایک دست
 لٹا کر آنجن میں پہنچ گیا۔ اس کے جسم کے سارے بال جلنے لگے۔
 نیچے ٹھک آئے تھے۔ آنجن میں پچھا رہی تھیں۔ ہمیں جیسے بالوں
 دم اک دم بجھتی ہوئی تھی۔ جھولی میں سے باریک باریک گھٹائی ٹھہری

چھینوں کی آواز آرہی تھی۔ اس نے ہانپتے ہوئے زور دگایا اور تیزی سے
 آگے بڑھ کر جھولی رفیعہ کے قدموں میں ڈال دی۔
 زمین پر پڑتے ہی جھولی کھل گئی اور منی اسٹو بیجھنے کے لئے ہاتھ
 پاؤں مارنے لگی۔
 ڈپہ نے چکیلی آنکھوں سے ماکنن کو دیکھا اور کان ہلاتا ہندی
 تے جا کر لے دم سا ہو کر گر پڑا۔

آنکھ محولی

”چنا۔!“
 ماں اتنی زور سے چیخی کہ آنکھن کے پیر پر بھیا کوئی پنچھی پر پھٹ پھٹا
 کر بھاگ کھڑا ہوا۔

”ہاں ماں۔“ اب چنا بغیر کے ہشمن کی طرح، جذبات سے خالی
 آواز میں کہے جا رہی تھی۔ ”میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ مینرے
 اور بھیا میں کسی بات پر نوک جھونک ہوئی اور پھر دونوں میں چل گئی کبھی
 بھیا اٹھا کر پیچھے کھجی مینرے کو دے مارتے۔ جلدیہ کتنی دیر اور یہی
 ہوتا رہا۔ میں نے گہرا کر آنکھیں ہی بند کر لیں۔ ماں۔ ٹر۔۔۔ جب آنکھیں
 کھولیں تو۔۔۔ تو۔۔۔“

پہلی بار اس کی آواز کانہی اور وہ چیخ کر رو پڑی۔ ”تو ماں میری
 ان نامراد آنکھوں نے دیکھا کہ بھیا تو زخموں سے چور چور تھا۔ ہائے میا۔
 اسے مینرے نے میری آنکھوں کے سامنے اٹھا کر بیٹھے پانی میں پھینکا۔“
 ماں کے خیالات کی چکی گھر گھر چلنے لگی۔

عورت جب پہلے پہل ماں بنتی ہے تو آسمان کی ساری بلندی

اس کے قدموں میں سرنگوں ہو جاتی ہیں۔ نیلے نیلے آسمان سے جنت میچے اتر آتی ہے اور اس کے قدموں تلے نیا دلے لیتی ہے۔ شاداں کے قدموں تک پہنچتے پہنچتے ان بلند یوں نے کسی برس لگا دیئے۔
شاداں بیاہ کر سسرال آئی تو جس کس نے سب سے پہلے یہی دعا
اس کے کانوں میں اٹھائی۔

”اللہ چاند سا پوت دے۔!“

”مولا جلد ہی گود بھر دے۔!“

اور تو اور جب رات ڈھلے شیرے نے اس کا لال لال گھونگھٹ
اٹھایا تو تھوڑی دیر کی کمسن کمسن بچس بچس کے بعد دھیرے سے یہی کہا۔
”اب جلد ہی باپ تبا دنیا۔“

شاداں کا نازک سا دل ہل گیا۔ وہ اس چوٹے سے گھر میں کنتوں کی
مسترت کا سامان بن کر آئی تھی۔

”بٹیا۔ بٹیا۔ بٹیا۔“ محلے ٹولے میں جدھر بھی جا سکتی سب اس کو
دیکھتے ہی چھیڑنے لگتے۔ شاداں ہنستی، شرماتی اور بھرے بھرے بدن کی
لڑکیاں دو چہرہ لویں کو خالی وقت میں بیٹھی ایک دوسرے سے شمع شمعول کیا
کرتیں، ہلکے ہلکے بدن والی شاداں کو دیکھ دیکھ کر بولتیں۔
”بی بی تو تنہا رسی بیل پر ترائی کب کھلے گی۔؟“

شاداں گلابی پڑھاتی۔

محلے والیاں ساس سے پوچھتیں۔

”ارسی جھنا مان تیری بہو کو کچھ ہے۔؟“

ساس یونہی مایوسی سے سر ہلا دیتی۔

ایک دن محلے کی تجربہ کار جو خیال بولی۔ "اری بوا، ہو کے ہاتھوں ترائی
 کا بیج کیوں نہیں بوائی۔؟ میں نے چاہیے میں آپنی پتہ چل جائیگا۔"
 ساس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ارے اس بات کا اسے خود کیوں
 نہ خیال آیا تھا۔

اس دن شاداں بھینس کا دودھ دوہتی بیٹھی تھی کہ ساس نے پکڑا۔
 "شادو، اری او شادو۔"

بھری گنگری پہنچ کر شاداں کرتے کے دامن سے ہاتھ پونچھتی ہوئی آئی۔
 "مجھے بلایا ماں۔؟"

"یہ لے ذرا بیج سلنے والے تھانولے میں تو ڈال دے۔"
 "مگر اس موسم میں۔؟" شاداں حیرت سے بولی۔ "بیج جل کر نہ رہ

جائے گا۔؟"

ساس ہنسی۔ "پھل پکنے والا ہونو کرے موسم میں بھی بیج نہیں
 جلتا۔ تو ڈال تو دے۔"

"پہلے بھینس کے سامنے سے بولہ کی ٹوکری تو ہٹا لوں۔" وہ بیچ کو
 پلو سے باندھتی ہوئی بولی۔

دن ادھر ادھر دھل گیا مگر بنو کو یاد ہی نہ آئی کہ بیج بونا ہے۔
 شبرے لوٹا تو بچتے بچتے بولا۔

"بیج زمین میں ڈال دیا تھا نا۔؟"

شاداں تنک کر بولی۔ "گھر بھوے کو بیج ہی کی پٹری ہے، کیا دھرا
 ہے اس بیج میں۔؟ پونہ نیا زراٹیاں کھانے کا ارمان آ رہا ہے تو نور کی پوا
 کے ہاں سے ڈھیر ہی بھرا دوں۔؟"

شیر نے اس کی کلائی پکڑ لی۔ ”ارسی دوانی، جتنے پھل میل پر آئیں گے اتنے ہی تیرے ہاں بچے ہوں گے۔ ہاں رسی جبرت سے کیا دیکھتی ہے۔ جو خالہ یونہی نئی بہوؤں کی کوکھ آزمانی ہے۔“

”ہائے مولیٰ۔“ شاداں چھاتی پر ہاتھ مار کر بولی۔ ”تو کیا تم بھی سہی سمجھتے ہو کہ یہ بچہ بات ہے۔“

”اور کیا! وہ جو کونے والے گھر میں مریم بوارہ بنتی ہے نا، اس کی کلائی میل میں کبھی بھول کھلا نہ نرائی پئی۔ دیکھ لے اس کو ایک بھی بچہ نہ ہوا۔“

”بھٹو، کیسی باتیں کرنے ہو۔ ایسا بھی کہیں ہوا ہے بھلا۔! وہ تو بس ادھر دالے کی دین ہے، خواہ مخواہ کے درم ہیں سارے۔“ اور مارے غصے کے شادو نے پورے بچے کھولا اور دوسرے چمک دیا۔

”اگر ایسی بات پر یقین نہیں آتا تو چل پیر جی کے مزار پر۔“ وہ اسکا بازو گھسیٹ کر بولا۔

”دہاں جانے سے بھلا کیا ہوگا۔“

”مراد پوری ہوگئی، اور کیا۔“

شاداں اس کے سامنے بیٹھتی ہوئی بولی۔

”ہاں جی، خدا بڑا ہے کہ تمہارا پیر۔“

شیرے سٹٹا کر بولا۔ ”بڑی لمبی لمبی باتیں کر رہی ہے رسی بھلا کون کافر بولے گا کہ پیر بڑا ہے۔“

”تو پھر جو بڑا ہے اسی سے کیوں نہ مانگیں۔“ اس نے شیرے کا ہاتھ پکڑ کر اسے گھسیٹا اور خود بھی ہاتھ اٹھا کر بولی۔ ”کہو، اے مولیٰ! ہمارے گھر ایسا کر دیں، بہادر پوتہ بھیج کہ چلے تو زمین ہل جائے۔ بیٹھے تو

چار پائی ٹوٹ جائے اور ایسی بیٹی دے کہ گھر بھرے ہیں اجالا ہو جائے۔“
شیرے نے اس کی کہی بات دہرائی ہی تھی کہ ادھر سے ساس آگئی۔
”ہاں ہاں، موئے مکے مانگ بیٹی کی ہی دعا۔ کو لہے سے بٹھا کر رکھے گا
کیا۔“ بیٹی لے کر کیا کہہ سکی۔ ابھی آئی ابھی چلی۔“

شیرے جھینپ کر بولا۔ ”ماں بیٹے کی دعا بھی تو مانگی ہے۔ تو نے
سانہ ہو گا۔“

بڑھیا نے نفرت سے ہونٹ سکڑے۔ ”بیٹی، ہو نہ، بیٹی! بڑا
پہاڑا لڑا مکے لگی بیٹی! میں نے تو پانچ بیٹیوں کی نیا زمنت مان رکھی
ہے۔ ہاں۔!“ اور وہ شاد پر ایک گہری نظر ڈالتی ہوئی چلی گئی۔

سچھ سال کی مدت کچھ یونہی معمولی سی مدت تو ہوتی نہیں۔ شیرے
اور رشیدے کی شادیاں ساتھ ہی ساتھ بعد بارش ہوئی تھیں اور
رشیدے کی بیوی مسلسل بیٹے جتنے جتنے ایسے تنگ آگئی تھی کہ بچے کے
ذکر ہی سے سھاگ اٹھتی۔ ادھر گھر کا کام کرنے کرنے شاداں کے کومل
گلابی ہاتھ سخت اور کھردرے ہو چلے۔ ان ہاتھوں سے اس نے ہر ہر
کام کر لیا۔ نہ کیا تو بچے کا پیگوڑا ہلانے کا نہ منگی بخش کام۔

ساس نے کھلم کھلا چار عورتوں میں بیٹھ کر کہنا شروع کر دیا۔
”میں تو تبھی کہتی تھی کہ کھوڑ جسم کی ہے۔ کیا بچے جننے گی۔ مگر جانے
وہ منڈی کاٹا اس کی کون ادا پرہ بچھا۔“

”اچھا۔!“ کوئی بنا دئی جبرت سے پوچھ ہی لیتی۔ ”تو شیرے نے

اپنی پسند سے بیٹی اٹھائی۔“
اب بات گزر گئی تھی۔ چھپا کر کیا لیتا تھا۔ ساس ڈنکے کی چوٹ لیتی۔

”پھر کیا، بیاہ نہ لاتی تو مر ہی جاتا۔ جب دیکھو تب کچھ پاڑے سے
سنہری پھولوں کا گچھا لوڑا کہ چلا شادو کی طرف۔ پھول نہیں تو کبھی پو
سجلی۔ کبھی بلہدہ کبھی امک کبھی ! ڈھک۔“ سارے چھپو ڈھکے
راز ساس یوں مزے مزے سے کھول رہی تھی۔

”سنہری پھول۔؟ وہ کیوں۔؟“

ابا ساس کو غصہ آ جاتا۔ ”اے بنو کیا بھولی بنتی ہو۔ کبھی تمہارے
دھکڑے خالی ہاتھ تم سے ملنے آئے تھے۔؟ خالی ہاتھ جانیں تو پریم
پیارے کیسے کہلا لیں۔؟ پھول تو ہونے ہی چاہئیں۔“ جانے وہ کدھر
کھو جاتی، اس کے جھری دار چہرے میں سنہری سنہری آگ جھللا اٹھتی۔ ”بھلا
سنہری پھولوں کا مطلب کون نہیں سمجھتا۔؟ ہر گھر کچھ تو سنہری پھولوں کا
واسطہ دے دے کر کہتی ہیں۔ مولیٰ کرے ہمارے پیار کی آگ بھی لوجہ
جلتی رہے۔۱“

چکی گھاتے گھاتے شاداں بہت، بہت پیچھے پہنچ جاتی۔ آم کے
نلے کھڑے کھڑے پیرشل ہو گئے ہیں۔ شیرا ہے کہ آہی نہیں چکنا۔ اے لوو
پیلے پیلے پنے کے ڈکھڑائے۔ یہ سجاری سجاری قدموں کی چا پکسی ہے۔؟
ہائے میں یہ کیسے پھولوں میں نہائی جا رہی ہوں۔

”ہوں۔ تو اتنی دیر کر دی۔“

”ماں جو برآمدے میں چاول کڑھایاں ڈالتی بیٹھی تو اٹھنے کا
نام ہی نہ لے۔ بھلا کیسے آتا۔؟ نگر پچ بول، میرے لئے گھڑیاں گننا بھی نیچے
بھلا گتا ہے نا۔؟ بول۔؟“

یہ انتظار کیا جان لیوا۔ پھر بھی گننا بیٹھا کیا مسرتہ خشک موتا ہے۔

آنکھوں چولی

چمکی کا ہتھ آہستہ ہوتا۔ اور آہستہ۔ اور آہستہ، اور سپر رک جاتا۔ اور صرف ایک یاد شا داں کے ذہن میں باقی رہ جاتی۔
 "اگر مولیٰ مجھے اولاد کبھی دیدتیا تو ہمارے پیار میں کون کمی رہ جاتی۔"
 "بہو، انا چ لیں گیا۔" ساس کی آواز سن کر وہ پھر گھر سے بڑی چلنا شروع کر دیتی۔

شا داں آگے ہی دھان پان تھتی بسسرال کی رد ٹی بہوؤں کے اٹت یوں لگ جاتی ہے کہ دہوں کا پیار جی کو لگا رہتا ہے۔ گھی۔ سے تر ترائی چہ روٹیاں اتنا خون نہیں بڑھائیں تھنا محبت اور پیار میں ڈوبا ہوا ایک لفظ تبھی تو بسسرال سے لوٹتی ہیں تو چہرہ پونم کا چاند بن بنا کر جگہ گانا ہے مگر شا داں تو جوں کی توں ہی رہی۔ آنے ہی اس کے دل کو بچے کی وہ لگ دگا ہٹ رہی کہ اپنا آپا بھول گئی۔ جسے دیکھو وہی یہ بات نسانا۔

اور اب چہ برس کی مدت۔ مستقل کر ڈھن نے تو رہی ہی رونق بھی چھین لی۔ کال کہاں تو ایسے چمکیلے اور روشن روشن جیسے سنہری پھول پھچھو اڑے کے پودے پر نہیں اس کے گالوں پر ہی کھل اٹھے ہوں اور اب بڑی بڑی ٹھنکی آنکھوں کے نیچے ایسی سیاہیاں جیسے روتے ہیں کا جلی پھیل کر آنکھوں سے نیچے اتر گیا ہو۔ سہاگ رات کے بعد صبح کبھی شیرے لے ایسی لگن سے بچے کا نہ کہا۔ مگر یہ شا داں کا دل تھا کہ آپا آپ اس کی چاہت کے جانا اتنا تو دیکھتی سمجھتی تھی کہ بچے کی ماں بن کر بسسرالیوں میں محبت اور عزت دگنی ہو جاتی ہے۔ شیرے کو دیکھ کر اس کا جی چاہتا کہ وہ جب کبھی ماہر سے تھوکا تھکا۔ پسینے میں ڈوبا گھر آئے تو کوئی اس کے قدموں میں لپک پڑے۔

”ہا ہا ہا ہا۔!“
وہ ہنس کر اسے اٹھالے اور اس کے پاس لے آئے۔ شرارت سے بولے۔

”کیوں ری۔! میرے بچے کو پیٹ بھر دو دھکھی نہیں پلاتی۔؟“
”واہ! بڑے آئے شکایت لے کر۔ تمہیں کیا خبر۔؟“
”بھر دیکھو یہ میرا کتنا کیوں چوس رہا ہے، یہاں سے۔!“ اور سوچ سوچ کر شاداں کلپ کلپ اٹھتی۔

پھر جیسے شاداں نے حالات سے سمجھوتا کر لیا۔ کام میں یوں لگن رہتی جیسے خود کو بھول جائے گی۔ شیر آنا اور یونہی کمرے میں آ جانا ہنس کر بولتا۔

”بڑی نفع کن ہو رہی ہے شادو، قسم مولیٰ کی۔ ہاں۔“

”چائے بنا کر لاؤں۔؟“ وہ اٹھتے ہوئے بولتی۔

”اُسی پاگل ہے تو بھی۔ میں چلے پانی کو کب پوچھنا ہوں بھلا۔“

اور وہ ایسی شریہ سنسی منہ تانے کہ شاداں شرم سے دوہری ہو جاتی۔

”یہ اب ننگ مجھے کتنا پیار کرتا ہے۔؟ کوئی سری کا ہوتا تو مزے سے

دوسری لے آتا۔“

ایسے ہی ایک دن سنہری بھولوں کو جھوٹنا دیکھ کر اس کا دل دکھ گیا۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے اوپر دالے سے دعا مانگی۔

”تو سب دیکھتا ہے۔ فحشہ سے کیا چھپا ہے۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔

میں کچھ نہ مانگوں گی۔ بس اتنا چاہتی ہوں کہ میرے پیار کی سنہری آگ یونہی چلتی رہے۔“

شیرے نے اپنا سپٹا ہوا کرنا جسم سے اتارا اور شاداں کی طرف
سپینکتا ہوا بولا۔

”اری شادو، وہ کل دی کاٹنے والا شامو دادا ہے نا، اس کا کرتا بالکل
سچٹ گیا ہے۔ مجھ سے مانگ رہا تھا۔ یہ اسے دیدینا۔“
شاداں نے ہنسی، خوشی، ناز اور شرم سے اس کی طرف دیکھا اور
کرتے کو سنبھالتی ہوئی بولی۔

”بس بہت خیرات کر چکے، آگے کام آئیں گے پچھے پکڑے۔“
”کیا مطلب۔؟“ شیراجیرت سے بولا۔ ”پچھے پکڑے بھلا کس
کام آسکتے ہیں اری۔؟“

”تم تو ہاں ہی ولیجے ہو۔ آج کل کے تو کونو ارے لڑکے بھی ایسی دلی
باتیں سمجھ جاتے ہیں اور تمہاری شادی کو چھ برس ہو گئے پھر بھی بچوں کی
سی بات کرتے ہو۔!“

”مولی قسم میں سمجھا ہی نہیں تو کیا کہہ رہی ہے۔!“
شاداں ہنس کر حبیبی اور بولی۔ ”کان میں کہنے کی بات ہے۔ ہاں۔!“
اس کے گرم گرم سالنوں میں ڈوبے چند الفاظ شیرے کے کانوں
میں پڑے ہی تھے کہ وہ اچھل پڑا۔ اک دم اس نے شادو کو دونوں ہاتھوں
پر اٹھایا اور نیچے اوپر گھمائے لگا۔ شرارت سے اس کے منہ پر کال رکھ
رکھ کر بولا۔

”ہاں۔! بالکل میٹھا ہے۔“

ساس مرغیاں ہنکالتی ادھر سے گزری تو ہو بیٹے کو دیکھا۔ جان
بوجھ کر دونوں کو نظر انداز کرتی وہ آنکھیں میں اتر گئی۔

اور جب اس دن رنگ بھری دھپیری کو سب مجھے والیاں پائیں
 ٹھنڈی مٹی تھیں۔ پانڈاں کھلا تھا۔ سہاگ راتوں کی، مہاؤں کی
 ان کے بہبودہ انداز سے پیار کر لے کی پائیں ہو رہی تھیں تو سمیٹہ کی طرح
 شاداں کا منہ اترا ہوا نہ تھا۔ بیلین ہوائے پانڈاں اس کی طرف کھسکا
 کر کہا۔

”شاداں، سب کے ہونٹ لال ہیں، تو کیوں سوکھا منہ اے بیٹی؟“
 شاداں نے منہ پھیر لیا۔ ”بواپاں کے نام سے تو ابکائی پہ ابکائی
 چلی آتی ہے۔“

سب نے ایک دوسری کو دیکھا اور اک دم شاداں کی جان پر ٹوٹ
 پڑیں۔

”اری کیا۔؟“

”اری کیسے۔؟“

”اری کتنے دن ہوئے۔؟“

”اری نہ جی کون سے ماہ پڑ رہی ہے۔؟“

اور سارے گاؤں میں پھیلی تھی کہ جینا ماں کی بیو کے ہاں بچہ
 دو گنہ والا ہے۔

اب رات کو وہ قوی پاس پاس بیٹھے تو شاداں ہنس کر دھک دھک
 جاتی۔

”بھئی دور رہو۔“

”واہ، یہ ظلم کیوں۔؟“

”سکینہ بوا بولتی تھی۔۔۔“ اور وہ ہنس کر گنگنا تے لہجہ میں بات

پوری کر جاتی۔

”سکینہ بوا کی ابھی تھیں۔ وہ رہے اپنے میاں سے دور۔“

شیرا صاف ڈھٹائی پڑنل جاتا۔

اک دم شاداں خاص ماؤں کے سے انداز سے کروٹ پلٹ کر

پوچھتی۔

”ایک بات پوچھوں۔؟“

شیرا پورا کان بن جاتا مگر وہ کھپائے جاتی۔ شرمائے جاتی۔

”ہائے! میں نہ پوچھو تھی۔ شرم لگتی ہے۔“

”اچھا اچھا۔ سمجھ گیا، تیرا مطلب جان گیا۔ بد معاش کدھر کی؟“

”کیا بد معاش کی میں نے۔؟“ وہ ہنس کر بولی۔

”اب تو یوں شوشہ چھوڑ جائے گی تو ظاہر ہے میں خوشامد کرنے

کر تے تیرے گدہ کی شروع کر دوں گا اور۔ اور۔ ہاں۔“

”بس بس، اسی دھوکے میں نہ رہنا۔“

”اچھا یہ بات۔؟“

”ہاں اور کیا۔ اب تمہاری پردا کسے ہے۔؟“

ہنس کر شیرا اسے بچہ لیتا اور دنیا بھر کے عام بالوں کے لہجہ

میں پوچھتا۔

”بلیا کہ بیٹی۔؟“

”جو بھی ہو جائے۔“

”ہاں، جو بھی ہو جائے۔ پہلی تو بس اولاد چاہیے۔“

مگر سمن کو معرفت اولاد ہی نہیں بلکہ بیٹا چاہیے تھا۔ مارے خوشی

کے اس نے آٹے گئے سے کہہ کہہ کر نہ سکھایا۔ "بہو کو بٹیا ہونے والا
ارسی سنتی ہو سکو ہوا، میری بہو پوت جنے گی۔"

بہو خالہ نے لاکھ بار منع کیا کہ بول سارے میں بات پھیلایا نہیں
کرتے، لوگ جا دو منتر کر دیتے ہیں۔ مگر ساس کی خوشی تو وہ سورج سختی کہ
بادل دیکھے نہ ہرلی۔ جھیلکے ہانا ہے۔ اتنی خوشی کی بات چھپاتی بھی کیے
بازو کے گھر والی حسینہ خالہ جب سے حج کر آئی تھیں حاجن لہاں
کہلاتی تھیں اور چھو چھا بھی کر نہیں۔ کالی دھاریوں والی کاسنی چادر
جو گاؤں کے منگل ہاٹ میں ڈیڑھ ڈیڑھ روپے کو ملتی تھی۔ اور صوکرہ
ہر گھر میں جاتیں اور انہی دعا بیٹن مفت ہانٹا کرتیں۔ شاداں پران کی
خاص نظر عنایت تھی۔ جھنا ماں کو مخاطب کر کے بولتیں۔

"جھنا بہو سے کہہ وہ دن گئے جب منوں وزن اٹھایا کرتی

تھی۔ اب پوچھے اٹھانا چھوڑ دے۔"

شاداں کو پاس بٹھا کر ہر وہ بات پوچھ ڈالیں کہ کبھی شیرے نے
بھی ایسی باتیں نہ پوچھی ہوں گی۔ شاداں سنسی روکتے روکتے لال لال
ہو جاتی اور سپر رات کو شیرے سے بولتی۔

حاجن اماں پوچھتی تھیں تیرا بچہ گول گول گھومتا ہے کہ نہیں۔

شیرے کی جبرت دو چہد ہو جاتی۔

"ہائیں! انٹے سے پیٹ میں بھلا بچہ کیسے گھوم سکتا ہے۔ کیا بچہ

ایسا ہی ہوتا ہے۔؟" اور دونوں جبرت سے سوچتے سوچتے سوہاتے۔

کہاں تو شاداں بڑے بڑے بوجھ، من من بھر کے جوار می کے
تھیلے اٹھا کر سپینک دتی اور ہانپتی تک نہ تھی، اور اب اتنے ذرا سے

ہیٹ کے پھر گھسٹتا گھسٹتا اس کی جان پر آتی تھی۔ شاداں کا وہ ہلکا پھلکا۔ دھان پان سا جسم اب نئی نئی موزنگ پھلی کی طرح بھر گیا تھا۔ اور کہ ہوں کے پاس جو گڑھے جیسے تھے وہ آپنی آپ بھر گئے تھے۔

بازو و نیزاد رنگوں میں نہرے پھول چمکنے لگے تھے۔ اور پھر اس کے علاوہ ہیش غوب ادخا ادخا ہو گیا تھا اور پھر اس سے بڑھ کر فیئرے کو شاداں کے چہرے کا ایک بہانہ ہاتھ آگیا تھا۔ اندھیرے اجالے وہ اسے کہیں نہ کہیں ماں کی آنکھ بچا کر بچھڑا لیتا اور تنسی تنسی ہوتا۔

”بول بے بات پھولی کیوں جا رہی ہے۔؟“ مٹا پاؤ دیکھو ذرا۔! ابھی ابھی تک تو دھان پان تھی۔“

شاداں شرما کر دونوں ہاتھوں سے اپنا دوشہ پورے جسم کے گرد لپیٹ لیتی۔

”تم کھانا نہیں کھاتے کیا۔؟“

”کھاتا تو ہوں، پھر۔؟“

”تو بس آجروالے کا رزق بھی اللہ نے اتار دیا ہے۔“

اتنے دنوں کے بعد آج میسرے کی سکھ میں آیا کہ شاداں کیوں اتنے دنوں سے سچے کپڑے جمع کر رہی تھی۔ ماں نے کھلے کھلے غفلتوں میں بغیر کسی شرم کے سادھی بات کھول کے رکھ دی اور آنگن میں کھڑا مرداد اکہاں لالچہ رہا تھا یا اب غرض ہو کر بولا۔

”واہ رہی جتنا ہوا۔! بہو کا ہیٹ ہاتھ میرا ادخا نکلا آہ اور مجھے کبھی ہی نہیں۔! اچھا اب پرانے کسے کر کیا چاٹوں،؟ جنائی پر اب تو نیا کرتا ہی دن گا۔“

سارے پہنے لگی۔ "اے دیو گے، وہی گے فرور ونگے۔"
 شاداں کی چھائی اب ہیشہ جلی رہی۔ بشیرا لائے آئے شاداں سے
 پہلے آتا اپنے ہاتھوں سے ملاتا۔ جس چیز کی شاداں چاہت کرتی وہاں
 کھانے پینے کا، چاہے شہر سے کیوں دکانی پڑتی۔ مگر چھائی کی جھلا
 جوں کی توں برفراز تھی۔

حاجی، ماں نے سنا تو بولیں: "وہی ایسی جھلا شہر دے
 بیٹھے سے کہاں ہائے مٹی پیدا ہوگی، دیکھ لینا، اسی کی جھلا ہے ساری۔"
 "تو بیٹھے چھائی کی جھلا کا کیا تعلق سجلا۔"
 "ارے مٹی کے سر پہ جھنڈا لیے ہال رہتے ہیں کہ نہیں۔ وہی ماں
 کی چھائی پر جلتے رہتے ہیں۔"

شاداں نے ہنس کر شیرے کے تصور میں چھوٹی شاداں ابھرا لی
 گدی پر بڑی جھوٹے چھوٹے ہاتھوں پر رول والی، سر پہ لہر مارنے والی
 گھنٹاں لٹنے والی اور ہرنٹ، عین میں شاداں کے ہونٹ دیکھ لو۔ اسے اپنے
 بچا کے خیال میں سامنے بیٹھی شاداں کے ہونٹوں پر اپنی انگلیاں رکھ دیا
 شاداں جھلا کر بولی۔

"اے، کچھ شرم ہے کہ تیشیں۔"

شیرے تو بڑی کھو یا ہوا تھا۔ اسی لیے خیالی سے لڑا۔

"ارے واہ! شرم کیسی؟" اپنی بچی کو یہاں بھی نہ کر دلا۔

شاداں دھڑکی ہو گئی: "ہائے ہائے ہائے۔"
 "پیند میں شاداں ایسے زور سے چلائی کہ شیرے کی آنکھ جھٹ سے کھل گئی۔
 "مری، مری" کے علاوہ کچھ کہتی ہی نہ تھی۔ شیرے ہانکے سر پہ کچھ کر پڑا۔

دبا تھا۔ "ارے کیا ہوا۔؟ کا ہے سے مری۔؟" مگر وہ تو بونہی رٹ لگائے تھی۔

"ہائے مری۔ مولیٰ تیری دہائی۔ ہائے، ہائے۔" شیرے کو اور تو کچھ سوچا نہیں، جھٹ سے گنڈی کھول کر آنکھیں میں پیکا اور جھنجھوڑ کر بولا۔

"ماں ماں، شاداں مر رہی ہے۔" ماں گھبرا کر اٹھ بیٹھی اور دوسرے ہی لمحے کمرے کو لپکی۔ بخوڑی دیر میں باہر نکلی آئی اور غصے سے بولی۔

"پانگل کہیں کا۔ کہیں سونے سے اٹھ کر یوں کہا کہ نہ پس کہ شاداں مر رہی ہے۔؟" پھر منہس کر بولی۔ "ارے گدھے شاداں مر نہیں رہی جی رہی ہے۔"

شیرا اچھل کر بولا۔ "ماں تیرا مطلب ہے اسے بچہ ہو رہا ہے۔؟" "چل ہٹ، بے شرم۔ شرم نہیں آتی ماں سے ایسی باتیں پوچھتے؟" سگاؤں میں کوئی تنہا نہیں ہوتا۔ ایک کے دکھ پر ساری آنکھیں نم ہو جاتی ہیں اور ایک کی خوشی ساروں کے ہونٹوں پر ہنسی بکھیر دیتی ہے۔ شاداں کی چھینیں ادھر گھومیں گونجیں منہیں کا ادھر ادھر سے عورتیں جھانکنے لگیں۔ کسی نے دانی کو بھی بلا لیا۔ یوں ماں خود کیا کسی دانی سے کم تھی۔؟

شیرے کو اس لمحے تو بڑا غصہ آیا کہ جب دروازے بند کر کے اسے کمرے سے باہر نکال دیا گیا۔ اب بند کمرے سے دلی دلی حنین باہر آرہا تھیں۔ جو اندر قینا بے حد تیز ہوئی گی۔ شاداں درد کی شدت میں کراہ

کراہ کر چلا رہی تھی۔

”ہائے مری۔ اد شیرے مری۔“

شیرا پہلے تو چپکا کھڑا سنتا رہا، پھر دردِ وادے پر مہو کا دھیر بولا۔

”ماں! شاداں مجھے کیوں پکار رہی ہے۔؟“

کوئی جواب نہ ملا۔ شیرا بے قرار سی سے بولا۔

”ماں! شاداں مجھے کیوں پکار رہی ہے۔؟“

”ہاں ہاں، وہ تیرے ہاتھوں حینائی کرانا چاہتی ہے۔ اس لیے

پکار رہی ہے۔“

ماں کی غصہ بھری آواز آئی۔

شیرے وہیں بت نہا کھڑا رہا۔ یقیناً شاداں بہت بُری مصیبت میں مبتلا تھی، تبھی تو اتنا چلا رہی تھی۔ ورنہ ایسے ویسے درد کو تو وہ یوں ہنس کر ٹال جاتی تھی۔

ایک بار صحنہ نے سینک مار دیا، اس کا بال بھی بیکانہ ہوا جو اس کے تھیلے سمیت ایک بار اوندھے منہ گر پڑی مگر ان نہ کی۔ یونہی ایک بار بڑے سے تھچو کے دُہن سے ہری طرح جھونک کھا گئی مگر سنہتی ہی رہی پھر

اب۔؟“

”اد شیرے۔ ہا۔۔ مر گئی۔“

چلاتے چلاتے اس نے ”او، او“ کر کے ایکائیاں لینی شروع کر دی۔

”اری پریم دوانی۔ ساس جھلا کر بولی۔“ یوں اٹھ سال سن تو نہ

کہیں۔ بچہ اوپر چڑھ جائے گا۔ تو جلد ہی نہ اترے گا۔ نیچے زور ڈال۔“

شاداں نے ہنرٹوں پر دانت ڈکڑ کر پوری طاقت پیچھے کی طرف

پینیکٹی شروع کر دی۔

صبح کا اہلا نمودار ہو رہا تھا۔ دور سے ٹوڈن کی آواز آئی اور مطلبی شیرا جھٹ بانے کے چپکے منہ پر مارنا نہ کو کھڑا ہو گیا۔ ابھر صبح کا سورج چپکا اور ادھر شاداں کی چبچبوں میں کمی ہو گئی۔

پھر تھوڑی دیر ہو نہی خاموشی رہی اور اس ایکٹھے کی خاموشی میں شیرا کئی بار مارا رکھن بار نہ ہوا۔ پھر اک دم سے "چیاں۔ چیاں" کی پیشی مٹیچی آواز باپ کے کانوں سے جا ٹکرائی۔

"ارسی واہ رسی شادو، واہ!" وہ کھڑے کھڑے ہی چلایا

"اللہ تجھے اچھا رکھے، ماں کو آج دادی بنا دیا۔"

تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا، شیرا شریف بن کر در جا کھڑا

ہوا تھا سبلا ماں کے سامنے کیسے بیوی کے پاس جا کے؟

"تو آؤل روہمیں میں گاڑ دے، تب تک میں سہینسا دودھ کر سہو کے"

تازہ دودھ سے آؤں۔" ماں دانی سے مخاطب تھی۔ اس کے ٹھنڈے

سمجھاؤ سے شیرا سبھ گیا کہ شیرے نے نہیں نہیں شاداں نے جنر لیلہ ہے مگر

اس کے دل میں تو خوشی کے چاند چمک رہے تھے۔ ماں تھاں پر گئی کوئی

محبٹ دھچپنی پر لپسی کالی دھار لپوں والی کاسنی چادر اوڑھ شاداں

کے پاس جا بیٹھا۔

شاداں ہنس کر بولی۔

"یہ عورتوں کی طرح چادر کیوں اوڑھ رکھی ہے۔"

"ماں پیچھے سے آکر دیکھے گی تو سمجھے گی کہ حاجن اماں ہے۔ درہ

مجھ تو مار ہی ڈالے۔"

کھن کھناتی سنہی سنہی کہ شاداں پڑھی گھسی عورتوں کی طرح سے
بولی۔

”مولوی جی کہتے ہیں ناماں کے قدموں تلے جنت ہوتی ہے۔ شیرے
آج میرے قدموں بھی آسمان سے چاند اتر کر آ بیٹھا ہے۔“ اس نے
ناز اور غرور سے اپنی پابنتی دیکھا، جہاں نہی سی کچھ ہکتی پڑی تھی۔
شیرے نے آگے بڑھ کر اسے ذرا ڈر ڈر کر دور دور سے چھوا۔
”ہائے رے۔! کسی نکل نکل سی ہے۔ نرم نرم۔ یو۔ یو۔“ پھر سنہی کہ
بولی۔ ”تیرے جیسی ہی ہے ری شاداں۔“
شاداں کے منہ پر خوشی ہی خوشی تھی۔

”مجھے تو مولیٰ قسم بیٹھا بھی ہوتا تو اتنی خوشی نہ ہوتی۔“ شیرے کی
باتیں ختم ہونے میں نہ آ رہی تھیں۔ ”مجھے خوشی نہیں ہوئی کیا؟“ وہ
احقوں کی طرح بولا۔

شاداں کو پاس کا رویہ یاد آ گیا، الجھ کر بولی۔
”کیوں؟ اسے تو مہینے پیٹ میں نہیں رکھا کیا؟ اس کے
پیدا ہوتے درد نہیں گئے کیا؟ سر سے پاؤں تک لپٹنے کے لیے بہ بہ
گئے تب باہر آئی۔ ایسی کیا ادھر کی آئی ہے کہ خوشی نہ ہوئی۔“
”ماں بنتے ہی تجھے اتنی ساری باتیں کہاں سے کرنی آ گئیں۔ جیسے
بڑی تجربہ کار ہو گئی۔ ابھی اتنی ذرا سی تو ہے۔“
شاداں سنہی دی۔ اب کے ہے اس کی سنہی میں مقوثا سا غم
بھی تھا۔

”خوشی کیسے نہ ہوتی شیرے؟ مگر میں نے آج پھر اپنے مولیٰ جے

ایک بار وہیں دعا مانگی ہے کہ میرے پیار کی آگ کو بجلا رکھیں۔
 شیر کے حیرت سے اس کو غوٹھیا توڑ لی۔

”ہاں شیر نے عورت کو سہاکی خوشی کا خیال سنا لے۔ ہم تم
 خوش ہو لیں تو کہا ہے۔ اماں کا بھی مل ہے، اس دلی کی بھی آرزو ہے۔“
 اُن دروہ کا کٹورا پیٹ کر آئی تو ساجن اماں کو سبٹھا دیکھ کر خوشی خوشی ہوئی۔
 ”دیکھو۔ ہوا، اللہ کے فضل کیا ہے۔ راتوں رات درد اٹھ اور
 بھر ہونے۔۔۔۔۔ شاداں کی سنسنی صورت دیکھ کر اماں نے سالی دھامریوں
 والی کاسنی چار کو غور سے دیکھا بھلا حاجن اماں اتنی آڑی چڑی کب
 ہے؟ اس نے آگے جھک کر چار پر سے کھینچ پھینکی۔ ”ارے کم بخت اس نے
 جو رو کے لحاظ، بخرم تو نہیں آئی ذرا سہا۔۔۔۔۔“

ساس کی نگاہوں میں بھی لاکھ ناکہ ناقابلِ اہمیت تھی مگر شاداں کیلئے
 اس کا کیا رتبہ تھا؟ یہ کہہ کر شاداں کہہ دل سے ہی پوچھتا۔ اس کے ننھے
 بھندے چہرے سے ایک ماں کا درد چھوٹ رہا تھا۔ وہ اور شیر ایل کر دلوں
 غور کرنے، سوچنے رہے کہ اس بیٹا کو کیا نام دیں؟ جس نے ان کی زندگیوں
 میں جیسے بھر دیتے تھے، اُنہاں نے بھر دیتے تھے۔ رنگ بھر دیتے تھے۔ خوشبوئیں
 بھروں تھیں۔ بڑے سوج بھار کے بعد دونوں نے مل کر بچی کا نام چاندنی
 رکھا۔ کوئی چاند کہتا۔ کوئی چندا۔ کوئی چندر اور گہڑا لے جڑھٹے وہ چاند
 پڑ گیا۔

چاندنی گھٹنوں گھٹنوں ہی رہتی تھی نہ تھی کہ ایک دن پھر شاداں
 شیر سے کو پچھنے کیڑے سیلتی نظر آئی۔

شیرا کر تا پچھتے پچھتے رک گیا۔ ”ارے اتنی جلد! پھر سے وہی بات۔“

و کھل کھلا کر ہنسنے لگا۔ "اری واہ رسی شاداں بی بی، مولیٰ تجھ اچھا
رکے! تو تو میرا گھر بھرنے پر تل گئی ہے۔"

امتا کے تسلیں دہا احساس اور خوشی نے اس کے سینے میں اہریا
اخبار دیں اور چھیل چھیل دھڑا اس کے کرتے کے اوپر سے ہنسنے لگا

اس رات بائبل پچیس سال کی سیاہ وادہات ہوئی۔ شاداں سوتے
سے چونک کر اٹھی، مگر اب اس کی تڑپ میں وہ الہڑپن اور نا تجربہ کاری
نہ تھی۔ کراہتے ہوئے بولی۔

"مجھے جنائی کے درد لگ رہے ہیں۔" پاس ٹپری کچا کو باپ کی گود میں
دیکر بولی۔ "اے باہرے جاؤ، مجھے چیخت چلاتا دیکھ کر سہم جائے گی۔"
شیر نے بڑی عزت، محبت، عقیدت اور کچھ کچھ عبادت کرنے
کے سے انداز سے شاداں کی طرف دیکھا، جو ایک بار ماں بننے میں اتنی
مکلفین اٹھا چکی تھی اور اب دوبارہ اس زندگی اور موت کی کشمکش
میں مبتلا ہوتے ہوئے بھی کس قدر پرسکون تھی۔

سب کچھ پہلے جیسا ہی ہو رہا تھا، مگر ہر بات میں ایک اطمینان
اور سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ عورت چاہے تلوار اپنی جان دے دے،
اپنا ہر احساس قربان کر دے، مگر اس ایک نام کو جو حیوان مرث کا
سنگی ساتھی ہوتا ہے، کرے سے کرے دکھ میں بھی نہیں بھولتی۔ اب
شاداں کا وہ الہڑپن اند پنا پھر مٹ آیا تھا اور وہ تڑپ تڑپ کر پکار
رہی تھی۔

"شیرے۔ شیرے۔ مرگئی۔ ہائے۔ آہ۔"
شیرا باہر کھڑے کھڑے کانپ رہا تھا۔ کانپے جا رہا تھا۔ اس کے

امرا پر شاداں نے جھینپ، شرما تے سب کچھ تباہ یا تھا کہ رات اس پر کیا کیا بہت لگی تھی۔ "آج وہ پھر اسی راستے سے گزری ہے۔"
چھینیں دکھیں، رات کے سناتے میں اور اضافہ ہو گیا، کوئی شیرے کے کان کے پاس سرگوشی کرتا گزر گیا۔

"میرے مولیٰ اب کی بار مجھے چاند کی صورت دکھاتا کہ اس کی وجہ سے سارے ہیں اچال ہوا اچال اچیل جائے۔" یہ یقیناً شاداں کی آواز تھی جو کراہتے کراہتے بھی دعا مانگتے جا رہی تھی۔

"اے خدا! اے مولیٰ! میرے پیار کی آگ کو جلتا رکھیو۔"
مٹا ٹوٹا اور تیز تیز چھینیں درو دیوار سے ٹکرانے لگیں۔ اسی دم ساس کی غوشیوں سے پوچھل آواز، جس میں آنسو بھی بھرے ہوئے تھے۔
تیسلی آئی۔

"اوتے شیرے! ارے شاداں! تجھے کیا ہوا ہے، تیرے باپ نے دوبارہ جنم لیا ہے، ہاں دیکھ تو۔"

شیرا شیر کی سی تیزی سے لپکا اور دروازہ بھڑا کر اندر گھس گیا۔
کمرے میں ایک درہم سا دیا جل رہا تھا، مگر جب اندر داخل ہوا تو دیکھا زمین پر اس جگہ جہاں شاداں کا چہرہ تھا۔ کئی چراغ، کئی چاند، کئی سوچ ایک ساتھ جھللا رہے تھے۔ یہ مانتا کی وہ روشنی۔ وہ غیبیاء وہ تانبا کی وہ مقدس آگ تھی جو اور کسی کے نہیں ایک ماں کے چہرے پر ہی جل سکتی ہے۔ شیرا اس بے پناہ روشنی سے خائف سا ہو گیا اور دلے پاؤں، یوں چلیے عبادت گاہ میں داخل ہوتے ہیں، دیر سے جھک کر پولا۔

”شاداں - میرے بیٹے کی ماں - اے

شاداں کے چہرے کے آس پاس نور کا وہ عالم روشن .. اور وہ
— اور روشن — اور روشن ہو گیا اور وہ دھیرے سے گنگنائی ہوئی ہوا

”شیرے پھر سے کہو - ”میرے بیٹے کی ماں - میرے بیٹے کی ماں -

میرے بیٹے کی ماں - ماں میں تمہارے بیٹے کی ماں ہوں -“

بیاں ماں باپ کی اس خوشی نے دور نہیں رہنا چاہتا تھا۔ اس نے

تیز تیز رونے لگا۔

”سردی لگ رہی ہوگی -“ شاداں دھیرے سے بولی۔

”سردی ایسا کہاں کی سردی - شیراجہرت سے بولا۔

”تم تو سمجھتے ہی نہیں۔ ماں کے پیٹ کی گرمی کی بات ہی اور ہوتی

ہے۔ مائی کا گدیلہ کہاں کہاں رکھ دیا ماں نے - وہ ادھر ادھر دیکھتی ہوئی

بولی۔

شیراجہرت نے کہا۔ ”ماں تو گاؤں بھرے میں نہ دینے لگی ہے شہر

میں دیکھتا ہوں۔“

وہ ہنس کر دلی۔ کوئی بیگمیلہ نہ پا کر شیراجہرت شاداں کے پاس

آیا تو چیخ پڑا۔ ”پکیا، اسی پکیا کرتی ہے شادو۔“

شاداں، جس نے ابھی اسکی، چند لمحوں پہلے بچے کو جنم دیا تھا۔ دھیرے

دھیرے قدموں سے چلنی ہو کونے میں، طاق میں روئی تھا مٹ کر رہ گئی۔

”اتنی جلدی نہیں چلا کرتے شادو۔ ماں دیکھے گی قصہ ہوگی۔

تو اتنی کچی رہے، بگاڑ ہو جائے گا۔“

شاداں نے گھوم کر اپنے پیٹ کے باپ کو دیکھا۔ اتنا ادنیٰ کر کے

طاق سے روئی لگی تھیں نکالتی نکالتی بولی۔

"شیرے، عورت جب ایک بیٹے کی ماں بن جاتی ہے تو آسان اور زمین کی ساری طاقتیں اس کے سامنے جھک جاتی ہیں۔ اب میں کڑھ نہیں۔ اب۔ اب۔ اب،" وہ لال لال سے کیرے کی طرف غور سے دیکھتی ہوئی بولی۔ "اب میں شیرے بیٹے کی ماں ہوں۔"

شاداں ہنس کر بولی۔ "ہاں شیرے بیٹے کا نام سوچا۔؟" "بیٹے کا نام۔ بیٹے کا نام۔؟" شیرامند ہی منہ میں سوچنے کی خاطر گنگنا گنگنا کر بولنے لگا۔ "بچو کا نام؟ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے تیس مار خاں رکھ دے۔"

شاداں ہنسنے لگی۔ "واہ، کیا نام بھی سوچا۔ بھئی دل لگی مت کرو۔ سچ بچہ اچھا سا نام سوچو، ہاں۔" "پر کچھ سمجھ تو پڑے۔"

"واہ، اپنی بیٹی کے وقت سمجھ پڑا اور اب میرے بیٹے کی بارمقل سو گئی۔"

"اچھا۔" شیرے اس کے پاس گھس کر بولا۔ "یقیناً کب سے کرلی۔" بیٹی میری اور بیٹیا انہا۔!"

شاداں جھٹ سے اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولی۔ "یہ تھا ماں جیوٹا سا روپ ہے۔ میرا دل ہے۔ یہ تو میرا ہی ہے۔"

شیرے نے چاندنی کو گلے سے لگایا۔ "اس میں کچھ تیری ہی من موہنی نیکل دکھائی پڑتی ہے۔ سچ بچہ برسر ہے۔"

شاداں خوشی سے پاگل ہو کر بولی۔ "تم نے بیٹیا مجھ سے دیا تھا؟"

”باہن!۔“

شاداں سنجیدہ ہو کر بولی۔ ”تو یہ حق بھی میرا کہ جو نام چاہوں کہوں“
اس کی سنجیدگی پر شیرا ہنس کر بولا۔ ”اے پگلا تو اس میں پوچھنے
کی کون سی بات ہوئی۔؟“

وہ گیلی گیلی آواز سے پوچھنے لگی۔ ”تو اس کا نام یہاں بادل رکھ رہی ہو؟“
”اے واہ رے بادل خاں۔“ شیرا ہنستا جانا اور بولتا جاتا۔

”واہ بری میا، خوب نام دیا پتھر کو۔ بادل خاں۔“

شاداں جھلا کر بولی۔ ”نہ رکھو، خود ہی سوچ لو۔“

اب شیرا سنجیدہ ہو گیا۔ ”مگر ذرا تو سوچ رہی یہ کیا نام ہوا؟ جھلا
کہیں بادل بھی رکھ کر جیسا نام ہوا؟ ایسا ہی ہے تو چاند رکھ لے۔“

شاداں ٹپٹپٹ کھسی غور توں کے انداز سے بولی۔ ”چاند تو آج کالا
پھیلا تا ہے اس لئے چاند کہلاتا ہے، سو چاندنی نے یہ نام حاصل کر لیا۔

باجھ نہ کی وہ گھومتا رہی تو اسی نے دور کر دی نا۔ تم نہیں جانتے بادل
پیا سی دھرتی کی پیاس بجھاتا ہے۔ یہ ننھا بچہ بادل جبکہ مجھ پیاسی زمین
پر ہر سا اور جیون بھر کے لئے میری پیاس بجھا گیا۔ جھلا بولو تو یہ بادل
نہ ہوا تو پھر کون ہوا؟“

شیرا نے اسے حیرت سے دیکھا۔ اتنی ذرا سی تو سنی شاداں مگر کہیں
کھاد ماں سے بھی نہ یادہ بڑھی اور عقل مند نظر آنے لگتی تھی۔

”واہ رے میرے بادل خاں۔“ شیرا نے ہچکچاہٹ سے کہا
اور گھوم گھوم کر پوچھنے لگا۔ ”واہ رے بادل خاں سا رے واہ رے
میرے.....“

چاندنی اور بادل، بادل اور چاندنی گھر بھرے کی زندگی سدا
منگے۔

خیاں بدلوئے سال بھر بڑی سختی۔ مگر سال بھی نہ گزرا تھا کہ
بدلوئے پیچھے چھوڑ گیا۔ ساتھ ساتھ بوتے ٹوبہ بڑا نظر آتا اور چھوٹی
ماں کو تو سبھی اولاد ایک جیسی پیاری ہوتی ہے، پھر بھی بدلوئے شاہاں
کا دل تھا، جو سدا اس کے پہلو میں دھرمکتا رہتا تھا۔ کبھی چوٹ
بدلوئے لگتی تو خون اس کے نکل آتا۔ بھارہ پڑتا، گوشت اس کا گھر نے
لگتا۔ ہنستا وہ، زندگی اس کی لمبی ہو جاتی۔ ماں کی توجہ اور بے پناہ پیار
نے اسے سوکھی جواری بھرا خھیلا بنا دیا۔ پھر پھر سارے برس بھاگتا
پھرتا۔ چنکے سال بھر بعد ہی بدلوئے چلا آیا تھا اس لئے جناب نے ایک
سال بھر ہی دودھ پیا۔ بدلوئے چار سال مسلسل ماں کا دودھ پیتا
رہا۔ ساری دنیا کی کھلائی پلائی، پھل میوے ایک طرف اور ماں کے
دودھ کی طاقت ایک طرف۔ بدلوئے ہنسے ہاتھ بھراؤں نکل آیا۔
ماں باپ اور دادی۔ تینوں کے دلاسے دوہنے میں دجود۔ ان میں
بدلوئے یا وہ پیارا تھا کہ بیٹے کی جون میں پیدا ہوا تھا اور ماں کا
ایسا دلا کر زندگی کی ہر چھوٹی بڑی مسرت اسی کے دجود کی مرہون
منت ہو کر رہ گئی۔ بھینس دودھ کرا سختی تو شاہاں اسے یونہی کچا
کچا تازہ دودھ پلا دیتی۔ ابا نے کرا سختی تو ساری ادھر کی بالائی کھلا
دیتی۔ اتنے دنوں سے وہ ساری دینا سے ٹوٹ سی گئی تھی۔ سب اسے

نکسے شاتے تھے اب وہ ایک بیٹے کی ماں تھی۔ اس سے کچھ
پیار نہ کرتی۔ اپنی زندگی بھی دار دیتی تو کم تھا۔ جو بے بس رہے کبھی
شیر اسے گھر کی دے دیتا تو منہ دیکر بات نہ کرتی۔ ایک بار ایچہ ہی کھد

بات چلی کہ باپ نے ایک شوٹنگ ماری، شاہ ماں کے تین بچے لکھا
 نہ کھایا۔ وہ تو اس آنکھ کو چھوڑ ہی ڈالتی جو اس کے بدلو کو بڑھے
 سے دیکھتی، چاہے وہ کوئی بھی ہوتا۔

(۲)

روکیں خود رو جھنگی سیلوں کی طرح بس پسلی پڑتی ہیں۔ بڑھی چلی
 جاتی ہیں۔ چنا بھی لٹکا ہی تھی اور یونہی بڑھ رہی تھی۔ مگر بدلو کا ہر
 کبھی دھیر سے کام نہ لے رہا تھا۔ بڑھا جا رہا تھا۔ دونوں آگے ہی آگے
 بڑھے چلے جا رہے تھے۔ بڑھتے بڑھتے جیبے چنا کے پاؤں تو کسی نے یوں ہی
 روک لئے۔

”بس مٹی بس، لڑکی ذات کو یوں کد کر ڈے نہیں لگانے چاہئیں۔“
 مگر بدلو کو کون روکتا۔ بہت دور جا کر انہوں نے پیچھے پلٹ کر دیکھا
 تو شامک کر رہ گئے۔

”ارے! اس دھڑنے جھلگئے میں ہم نے کچھ سوچا ہی نہیں، اتنی
 جلدی ماں بڑھی کیسے ہو گئی۔؟“

ادھر عمر کے اس پار شاہ ماں کھڑی تھی سلیکے سفید کالے بال؛
 کاشمی جو کسی زمانے میں تھی ہوئی رہی ہوگی اب ڈھیل پڑ گئی تھی۔ ہاتھ پاؤں
 جیبے اگڑاٹی لینے کے بعد کوئی ڈھیلے چھوڑ دے سخت مضبوط اور گول
 گول چھتیاں، جن کا اس پتے پتے اب بدلو اور چیلوں جوانی بکھوڑ
 چکر ڈے مڑ کر اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے، نیچے کو ڈھلک چکے تھے۔

اچھا آنکھیں دہاں آنکھیں تھاپ بھی یونہی تاروں کی طرح چمکتی تھیں
ان میں پر لہا ہوا استقامت دلہا بدلو۔ میرا اپنا ہی بدلو۔ اجیوں کے
کسے اچھے ہی کلمے مڑھ پر شیرا چپکے سے ہاتھ چھڑا کر چلتا بنا۔ عورت
کا سہاگ منہ چائے تو دنیا میں کیا رہ جاتا ہے۔ آئندہ اور صرف آئندہ
جوراء کے اندھروں میں بچوں کو جگر لے میں اور دل کو کھوکھلا کر دیتے
ہیں مگر اچھے میں بھی ہر لوکا و جوداں سے کہنے لگا بھئی بن گیا۔ بھئی کا
دیکھیں، جو طوفان کے ہوتے بھی عافیت اپنی بنا کھلے جانے۔

اس دن شاداں صبح میں یونہی دودھ کر اسی فی الجہد کر بیٹی سے بولی۔
"ہاں دودھ کی بیٹی دیکھو اور کام کی نہ دھام کی محلے والی کلنڈم کو کبھی
دیکھا ہے وہاں کا گھٹنا ہاتھ نہاتی ہے۔"

"تو تو کبھی سچے میں میرا نام نہیں جانتی۔ بھئی سہیا ایسا کون پہلا
لٹہ ہکاتا ہے۔" وہ گنا چوتھے چوتھے سچا جھٹ سے بولے۔

سہیا کا نام سن کر شاداں کی آنکھوں میں محبت بھرا لٹی
"وہی پیشیاں رہا ہے۔ تیرا کیسے آج یہی کل بولی تو کہاں
اس کی برائیاں کر رہی۔"

"اوہ نہ! تو یونہی اپنے بیٹے کی فریڈ کوئی رہتی ہے۔ کسبتوں پر
آؤ صاف کام کرتا آدھا دھو وقت تو گھڑیاں گنتا رہتا ہے۔"

دیکھو اور بے کے پودے پر پھری پھول اسی سارے جھوم رہے ہیں
شاداں چونک کر بڑی۔ کیا کہا۔ اس کے لئے گھڑیاں گنتا ہے۔
"مجھے کیا معلوم! مگر کبھی جا کر دیکھ تو یہی ہوگی کوئی نہ کوئی۔"
شاداں کے منہ پر ہلکی سی غم چھری جس پر بھر کر رہ گئی۔

بہارِ بیا آتی چھا، ان کے پیچھے پیچھے خزاں۔ ہوسے ہوسے، پیچھے
 پیچھے تپوں کی یہ آنکھ مچولی مہدیٹہ جاوی رہی ہے۔ ہوسے تھے پیچھے ہو گئے
 پیچھے گرتے ہیں، پھر پیلی پوشاکِ سرخ اور ہوسے ہوسے سے دل جانی
 ہے۔ بھروسہ بیاں، پھر وہی خزاں، وہی خزاں اور بہار کا آنا جانا
 دنیا کتنے رنگ بدلتی ہے مگر پایہ بھروسے دل کیسی رنگ نہیں بدلتے
 وہ یونہی دھڑکے جاتے ہیں، چاہے شاداں ہو یا شبیرا، چمنیاں
 ہو یا رسول خاں، گھنٹوں پر یا چن۔ بینہ ہو یا سکوا۔ بدلو ہو یا منیرا، کبھی
 محبت بھی اپنا مقام بھول ہے۔

گلہری پنچ کر شاداں دھیرے سے بولی: "جہون کی ایک ڈیس غرور
 یہ بھی ہے، تو کیا جانے؟"

گیہوں کی برائی کا نادم تھا، یہ لوجھ صبح سے جانا تو شام کو ہی لوٹتا
 اپنے سے ترتر، منہ سرخ سرخ، الہ پشانی پر جھکے ہوئے۔ شاداں کا دل
 اس کو دیکھ دیکھ خونیں بھی ہوتا، ڈوب بھی جاتا،

"کئے میرا دل! ساری گھر داری سنوے لے ہے۔ ہائے کھیتوں کی
 یکٹھی دھوپ اسے ہمارے ڈال دے۔!"

اس دن دھوپ میں زیادہ ہی تیزی تھی۔ شاداں نے جلدی جلدی
 ٹھلیا بھری، بیٹھی کھٹی لسی کن روں سے چھٹکنے لگی۔ چنا آنگن میں پڑے
 پچھروالے چوہے کے پاس بیٹھی روٹیاں پکا رہی تھی، شاداں پکار کر بولی۔
 "روٹی کچھ کرا بھی دیدے، دھوپ تو دیکھ کیا فطسب کی ہے
 ذرا بدلو کو لسی پلاؤں، پھر نوروتی لے کر چلا جاتا۔"

جبھا کے سے شاداں اٹھا اور ٹھلیا سنبھال چلی۔ کھیت میں پہنچے

کراؤ صردیکھا، ادھر دیکھا، یہاں ادھل، کہیں بدلو ہو تا تو دکھائی
بھی دیتا۔ لڑکی جو نیپڑیا کے پیچھے سے منہ کی آواز آئی تو جھانک
کر دیکھا۔
”ہائیں ری کلثوم تو ان گنوں کی ہے۔!“ وہ من ہی من میں جھلا کر

بولی۔
”یہ کام کا وقت ہے یا ٹھٹھول بازی کا؟“ انجان بن کر وہ
تک گئی اور ہونٹوں کے آڑ و بازو ہتھیلیوں کی دیوار کھڑی کر کے زور
سے چلائی۔

”بدلو۔ ہوئے بدلو۔“

کھیت میں آواز گونجی اور بدلو، بدلو کتنی واپس آگئی۔ اک دم
جھپکے سے کاسنی دوپٹہ اڑا، چوڑیاں چنکیں اور جھکے جھکے کوئی
سایہ سالپک گیا۔ بدلو انجان بنا نکل آیا۔
”ماں! ارے آنٹی دھوپ میں تو۔“ میں تو بونہی جھونپڑی میں
جا کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ آنکھیں چرا کر بولا۔

شاداں درشتی سے بولی۔ ”یوں کام کے وقت اندر جا کر بیٹھ
جاتا ہے، جھلاکساں کی اولاد کو دھوپ سے کیا ڈر۔؟“
بدلو نے سر اٹھا کر ماں کو دیکھا (”ماں! تجھے کیا معلوم جھونپڑی

کے اندر کیسی ٹھنڈک ہے۔!“
”نہی یہ لسی پی لے۔“ ایک دم اس کی نگاہ اس کی جیب سے جا مکرائی
”یہ پھول کیوں بھر رکھے ہیں۔“ وہ الجھ کر بولی۔
”ماں۔ ماں۔ یوں ہی۔ بس اچھے لگتے ہیں نا۔“ وہ سٹپا گیا۔

”شادیاں نے اس سے کچھ نہیں کہا۔ لسی کی خالی ٹھیلی لئے جب گھر جا رہی تھی تو اس کا وزن پھولوں سے بھی ہلکا ہو گیا تھا۔ اس کا دل خوشی سے اڑا جا رہا تھا۔

”کلنوم ایسی بری بھی نہیں۔ اچھی خاصی ہے۔ ہاں بس بال بے حد بڑے ہیں، اور لوگ کہتے ہیں کہ لمبے بال منحوس ہوتے ہیں۔ پونہ تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“ وہ دل ہی دل میں ہدلو کو دلیا بنا دیکھ رہی تھی۔ اس کے آس پاس باجے بچ رہے تھے۔ اور تنہائی کے باوجود وہ اپنے ساتھ ساتھ برات لئے چل رہی تھی۔

اس دن چناکانپ رہی تھی۔ اس کا رنگ جو پہلے ہی مبدہ شباب تھا اب سفید پڑ رہا تھا، بلکہ ہندی ہو رہا تھا۔ وہ سہمے سہمے آئی اور کونے سے لگ کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ اور منہ سے بات نہ نکال رہی تھی۔ گھر میں اس وقت کوئی نہ تھا۔ شاداں رشید حجاز کے ہاں محلے کی چار چھ عورتوں کو لے کر کلنوم کو مانگنے گئی تھی۔ دھوڑ ننگر کھیت پر تھے۔ دادی حسب معمول کھانسی پڑی تھی۔ اور گھر بھرے پر ہیبت ناک سناٹا چھا رہا تھا۔

شاداں کوئی گھنٹے بھر لچر لٹی تو خوشی کے مارے مری جا رہی تھی۔ اپنے آپ میں باتیں بھی کئے جا رہی تھی۔ ”اتنا تو دیکھتے ہی ہیں کہ سارے محلے، بلکہ سارے گاؤں بھرے میں بدلو اپنے نام کا ایک ہی ہے۔ کون کام وہ نہیں کرتا۔ گھر وہ سنبھالے، خط وہ پڑھے، کشیتاں وہ لڑے۔ اس دن دنگل میں میسرے کو کیسی ایٹ دی کہ سارے میں واہ واہو گئی اور میسرے کھیا گیا تھا۔ اور غلی ڈنڈے میں پالی والوں کو کیسی کھائی

پلا دی۔ اتنے پر بھی اگر نام کو نہیں۔ اپنے بڑوں سے کیے جھک کر لٹا ہے۔
 بھائی اور سات کے سارے ارمان پورے ہو جاتے ہیں تو یہ
 ارمان بھی اپنی جگہ پر امنیں لگتا کہ پوتوں، لو اسوں کے ہاتھوں
 اپنے سفید بال بچھڑا لیں۔

تیکہ پھیر دیکھ کر لوٹے اور پھر گھنٹیاں بجنے لگیں۔ سب اپنے اپنے
 گھروں کو لوٹ رہے تھے۔

شام کا اندھیرا اٹھ گیا مگر بدلو نہ آیا۔
 بہت دیر ہو گئی، اندھیرا گہرا ہونے لگا۔ پھر بھی بدلو نہ آیا۔ شادا
 نے دروازے کے باہر جا کر دیکھا ایک بار جھانکا۔ اور پھر دلی کو قسبی
 دے لی۔

”کھیت پر صرف بوائے ہی تو نہیں کرتا۔ وہاں۔“ اور وہ دلی ہی
 دل لینا نہ سہا پڑی۔

پھر شام گہری ہوئی اور رات آئی۔ رات ہلکی سیاہ تھی۔ پھر گہری
 ہونے لگی۔ بدلو پھر بھی نہ آیا۔

نیلے آسمان پر تارے چمک اٹھے مگر بدلو نہ آیا۔
 چاند دھیرے دھیرے اپنی جگہ سے سرکنے لگا۔ مگر بدلو پھر بھی
 گھر سے باہر ہی نہ نکلا۔

شاداں نے باؤلوں کی طرح بوجھ کو ہر جگہ کاٹنے شروع کر دیے
 پھر وہ چلا کر چلائے ہوئے۔ ”تیرا بھیا کہاں وہ گیا؟“ تو سوچتا تھا
 پریشانی ہو گئی۔

چنانکہ دیدے پٹے ہوئے تھے۔ ماں اس کے قریب آئی اور

خوف سے بولی۔ "چنا تو بولتی کیوں نہیں۔؟"
 چنانے سارے زور لگا دیا مگر اس کی زبان نہ کھلی۔
 شاداں نے اس کے بال کھینچے گاں پر ایک ٹھپڑ دکا۔ "سنے سے
 بولتی کیوں نہیں، سو کیوں رہی۔؟"
 چنا پھر بھی سوتی رہی۔ ماں نے اسے کفسوٹ ڈالا۔ دیر سے
 دیر سے اس کی آنکھیں مٹیں اور زبان کھلی۔
 "ماں! بھیجا اب کبھی نہیں آنے گا۔ وہ تو نہ ہی میرا بہہ گیا ماں۔"
 "چنا۔!" ماں اتنی زور سے چیخی کہ آنکھن کے پٹھر پے بیٹھا کوئی
 پیچھی پر چھٹ چٹا کر چھاگ کھڑا ہوا۔

"ماں ماں۔" چنا بغیر کے، مٹین کی طرح، جذبات سے
 خالی آواز میں کہے جا رہی تھی۔ "میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ
 میرے اور بھیجا میں کسی بات پر کوک جھونک ہوئی اور پھر دونوں میں چلنی
 کبھی بھیجا اٹھا کر میرے کو پیٹنے، کبھی میرا بھیجا کو دے مارے۔ جاسے
 کتنی دیر اور میری ہوتا رہا۔ میں نے تو گھبرا کر آنکھیں ہی بند کر لیں ماں۔ مگر
 جب۔ جب آنکھیں کھولیں تو۔ تو وہ بھیجا جا رہا تھا ماں۔"

"جب سے کشتی میں بھیجے میرے کو اپٹ دی تھی تب سے وہ
 اس کی جان کا لاگو ہو رہا تھا ماں۔ کہتے جانتے اس سے لڑائی کے
 پہلے نکالتا تھا۔ اور بھیجا طرح دے جاتا تھا۔ مگر آج تو دور سے
 دیکھ کر کشتی کا نام لیکر چیڑنے لگا۔ ایسی ہی کوئی گند کی بات کہی بھیجا
 کو غصہ آگیا۔ مہن نہ کر سکا۔ دونوں میں وہ لڑائی ہوئی کہ میرے جسم کا بال
 بال کھڑا ہو گیا۔ بھیجا اس سے مارنے والا تھا۔؟ مگر اس کہین نے،

بولتا ہے جہان بھی دنیا ہے اٹھائے۔ ایسا پتھر سر پر مارا کہ وہ چکرا ہی گیا۔
میں جھار پر چلوں گے انڈے اتارے بتیجی تھی۔ یہ سب کچھ دیکھ کر تو
مری گئی۔ آنکھیں بند کر لیتی تو گھبرا کر زمین پہی آ پڑتی۔ بڑی جبر بعد
میں نے آنکھیں کھولیں تو.....“

پہلی بار اس کی آواز کانپنی سر سر گھسرتے الفاظ رک گئے اور وہ
”جج کر رہ پڑی۔“ تودہ زخموں سے حرر چور تھا۔ میرے نے اسے ہینک
دیا ماں۔ اس کی جان بے لی۔ ہائے وہ مر جانے کتے بھی اس کی لاش
کو نہ اٹھا میں۔ دنیا کا کوئی سکھ نہ دیکھے۔“

”تاسہ ادھر سے ادھر ہونے لگے۔ چہرہ ایسی ہی جھگڑاتی صبح نمودار
ہوئی جیسی ہالو کی پیدائش کے دن ہوئی تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا سے شادال
کے مال ہراتے تو نہانے دیکھا کہ اس کے سارے بال روئی ایسے سفید
ہو رہے ہیں۔ آئینہ سے گھر گھر چہنیں وہ خیالات کی چکی رکی اور شادال
کی آنکھ جھپکی تو دیوار پر ننگے چہرے سے جا کرائی، جس سے شیراہر
بقرعید پر جگرے فزع کرتا تھا۔“

”ججہ پر دانہ پانی حرام ہے۔“ وہ اپنے آپ سے کہہ رہی تھی۔
صبح گزری۔ سہ پہر، شام، رات اور پھر صبح۔ دنوں اور راتوں
کا یہ پتھر چنار ہوا۔ کوئی تین چار دنوں بعد شادال واپس آئی، چہرا
اس کے ہاتھوں میں لٹک رہا تھا۔ سفید بالوں میں مٹی بھر گئی تھی۔
بکڑے ڈھیلے ہو کر نیچے کو اڑے تھے۔ (اس نے چندے ٹوٹ کر پوچھا
”وہ سور کا جنا کہہ کر گیا تھا مجھے معلوم ہے۔“

”مجھے نہیں معلوم ماں۔ میں تو ڈر کھارے پتوں میں یوں چھپی

بیشی تھی کہ کسی کو نظر بھی نہ آسکوں۔ پتوں کے نیچے سے جھانک رہا تھا۔
 ضرور تھا۔ پھر دو رنگ نہ دیکھ سکی کہ کہاں چلا گیا۔
 شاداں بالکل ہی دیوانی بن کر رہ گئی۔

راتوں کو گھر سے نکل جاتی اور دن کو کھیتوں کھیتوں خاک چھاتی
 پھرتی۔ جانے میرا اس کی کو کھ میں آگیا کہ کدھر مر کھپ گیا تھا۔ شاداں
 کی کمر سے چھرا بونہی کھلتا رہتا۔ گاؤں میں کسی کو پتہ نہ چلا کہ بدلو کہاں چلا
 گیا۔ سب یہ سمجھے کہ شہر بھاگ گیا۔ شاداں کی حالت دیکھ دیکھ لوگ
 نہر بھری باتیں بدلو کو سنانے۔

”ماں کو دیکھو کہ آنکھ کی تیلی بنائے رکھا۔ اور اولاد کو دیکھو کہ اٹنے
 کو پر ہوئے تو پھر سے اڑ گیا۔“

”شہر کی ہوا ہی ایسی ہوتی ہے کہ ماں کی محبت ہی سہلا دے۔ کچھ تو
 خیال کرتا۔“

شاداں دیوانی کسی کی بات کا جواب دیتی نہ کسی سے اپنا غم بتاتی
 اپنی ہی دھن میں گن رہتی۔

تینے دن گزر گئے کہ گیموں کی نہری بالیاں ہواؤں سے ہرا کر
 سارے بھاسونہ صوفی لپٹیں اٹھانے لگیں۔

شاداں بچ بچ دیوانی بن گئی۔ اپنے آپ میں ہنسنے جاتی۔ گاؤں
 کے ہر جوان کو روک کر اس کی صورت دیکھتی۔ لوگ دکھ سے بولتے۔

”نامراد اپنے بدلو کو کھو جیتی ہے۔“

مگر نامراد بدلو کو نہیں، شہر سے کو کھو جیتی تھی کہ ایک ہی وار میں اپنے
 دل کی ساری پیاس بجھا ڈالے۔

اس رات پونم کا چاند آسمان پر چمک رہا تھا۔ گاؤں کی فضا میں
 توہمناک سا سحر تھا، دھلی دھلی سی ہوتی ہیں۔ اس دن تو چاند تھا
 پونم کا اور رات بھی بہار کی۔ تارے ہم چم چمک رہے تھے۔ ہوائیں جو
 چل رہی تھیں تو جیسے بہند میں گھلی گھلی۔ ندی پار سے کافی، جھومتی ہوئی
 اپنے ساتھ کچھ فطول کی خوشبو بھی اڑا لیتی تھیں۔ شاداں کھیتوں میں،
 درختوں کی آڑ میں، جھونپڑوں کی ادھوں میں، ادھر ادھر، یہاں دہا
 کھو جتی پھر رہی تھی کہ کہیں تو میرا ملے گا۔ آج کا رات تو وہ رات تھی کہ
 پیالہ من کے لئے ہی بنی تھی۔ آج تو ہر راز عریاں ہو جانے کی سی رات تھی۔
 شاداں پیڑ کی آڈتے تھکی تھکی کھڑی تھی نیم نیچے سے دو بایا
 باتیں کرتی گزر رہی تھیں۔

”میرا نہیں آیا۔“

منہسی، شرم اور محبت سے مٹی جلی۔ ”اس کے باپ نے شہر
 بھی رکھا تھا۔ آج ہی تو لوٹا ہے۔“

”ہوں۔ تبھی گاؤں پر پھول چمک رہے ہیں۔ نا۔؟“
 پھر وہی منہسی۔

”اچھا راجہ، کبھی وہ نہیں آیا تو۔؟ تو تو کیا کر گئی۔؟“

”کیا کرونگی۔؟ ساری رات کھڑی رہ کر انتظار کروں گی۔ جب

چمکا چاند ادھر سے ادھر ہو جائے گا تب تو وہ آئے گا۔ اس انتظار میں
 کبھی کٹھنڈا آتا ہے کہ بالم کی راہ دیکھی ادھر وہ نہ آیا۔ اور جب ٹرپا لاکر
 آیا تو سینے سے سڑکا دیا، سارے گلے دھل گئے۔ ہلے وہ غرور آئے گا۔“

اترائی میں املی کا گھنا پڑا اپنے پیٹے بن سا رہا تھا۔

چھتے ہوئے اندھیرے اجالے سے شاداں سر جھکائے گزر رہی تھی۔ کہ سامنے ہی سو کھستے چہرے اور کوئی سایہ آگے بڑھا شاداں کا دل اچھل پڑا۔

”نیرا۔!“

وہ بلی کی پھرتائی سے لپٹی اور اس کے راستہ میں آگئی۔ ”تو نے ہی میری کوکھ اجاڑی ہے نا۔“

نیرے کا رنگ فق ہو گیا۔ اتنی بڑی حقیقت کو وہ کیسے جھٹلا سکا تھا۔ اس کے ہاتھ پیرسن پڑ گئے۔ شاداں نے چمکدار چہرہ نکالا اور زور سے سر کے اوپر گھما کر نیچے لاسی رہی تھی کہ اکدم اس کی نگاہ ٹھٹھک گئی۔ نیرے کی جیب سے نہرے پتھروں کی کلیاں جھانک رہی تھیں۔ اکدم شاداں جوان ہو گئی، سفید بال سیاد ہو گئے، چہرے کی جھریاں مٹ گئیں، بازو صحت مند اور قد تن گیا۔ آنکھوں میں جگمگ جگم چراغ جلنے لگے۔ وہ نیم کے نیچے کھڑی شیرے کا انتظار دیکھ رہی تھی۔ بڑی راہ دکھا کر شیر آ یا تو وہ بلکتی ہوئی اس سے لپٹ گئی۔

”نہروئی کہیں کے! میرے دل کا بھی کوئی خیال ہے کہ میں؟“

چہرا اس کے ہاتھ سے چھٹ کر زمین پر گر پڑا۔

تہ خانہ

گورے گورے ہاتھ بڑی پھرتی سے چل رہے تھے۔
 بڑے سے تھاں میں گیسوں کا آٹا بھگوئے ذکیہ بی کی دگا رہی تھیں۔
 ہاتھوں کی حرکت کے ساتھ ان کا ہڈکا پھلکا بدن جھٹکے کھا رہا تھا۔
 کھڑے گھلے کے کرتے میں سے گلابیاں اڑی پڑ رہی تھیں۔ راشد میاں
 کو شرارت سوچھی، ایک کنکرا اٹھا کر چھنیکا جو سیدھا ان کے گٹے میں سے ہوتا
 ہوا کسی نشیب میں جا بیٹھا۔

”اے داد، ذرا سی لاج بھی نہیں آتی۔!“

میاں اشارے سے بولے۔ ”لاج کیسی۔؟“
 ”اوہر ماں جان بیسی ہیں۔ نظر نہیں آتیں کیا۔؟“ انہوں نے

اشارے میں جواب دیا۔

اب کے راشد میاں زور سے بولے، ہنسی منہ پر کھجری ہوئی۔

”کیوں جی اگر ہیں۔“

ابھی ان کی بات منہ میں ہی تھی کہ کھجواڑے کے دروازے سے
 دھڑ دھڑ کرتے تینوں بچے داخل ہوئے جو سستی سے ان کے منہ ممتا رہے تھے

مٹا دیا۔ اس سے چلا کر بولا۔

”اجی اماں جی! اجی ابا جی! ملی نے بچے دیئے ہیں۔“
 شانو نے آواز میں آواز ملائی۔ ”ہاں ابا ہم نے خود دیکھے ہیں۔ بہت
 خوبصورت ہیں۔“

بے بی سبلا کسی سے پچھو کیوں رہتی۔ ”ہاں ابا چھب کے چھب
 گلابی گلابی ناک کے ہیں۔“

”ہج۔“ راشد میاں بھی بچوں میں بچہ بن گئے۔
 ”ہاں، ہاں۔“ تینوں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا شروع کیا۔
 ”آپ خود چلی کر دیکھیے ابا۔ اتنے پیارے ہیں۔ ہم نے دور ہی سے
 دیکھا ہے، در نہ پل تو نوچ ڈالے گی۔“

راشد میاں کے چہرے پر سچی بچوں کی سی خوشی کھیل رہی تھی۔
 ”اچھا اچھا چلتے ہیں سب۔ مگر جو پل مار بیٹھے۔“ بچوں کو خوش
 کرنے کے لئے وہ عواد عواد بزدلی دکھا رہے تھے۔

”وہ نہیں مارے گی ابا۔ ہم کوئی چھیڑتے تھوڑا ہی ہیں۔“
 ”ہم تو ابکہ والا لے لیں گے۔ وہ جو پیلا پیلا ہے۔“ شانو نے سب
 سے پہلے قبضہ جمایا۔

”اور ہم وہ کالے دھبوں والا۔ ہاں۔“ منے نے بھی حق جتا دیا۔
 ”اور پھر ہم کیا لیں گے۔“

”پل جو تنہا رہی ہے۔“ راشد میاں نے قبضہ کرنا چاہا۔
 ”ہنس۔“ پھر وہ غصے سے لڑی۔ ”اچی بڑی پل ہم نہیں لیتے۔“
 آپس میں آواز میں ہیں ہونے لگی۔ راشد میاں نہیں کہہ بولے۔

”ارے بھئی ابھی سے تو نہ لڑو۔ ابھی انہیں خدا بڑے تو لینے دو۔“
 بیٹھتے بولتے سب کے سب دروازے سے نکل گئے۔

ذکیہ بی بی کے ہاتھوں میں اب تک آٹا لٹھا ہوا تھا۔
 ”ہونہہ! کیسے مزے مزے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ کم بخت بی بی کو بھی
 اس وقت بچے خننا رہ گیا تھا۔ اور یہ بھی کہیں ہیں کہ بچوں میں بھیجے ہا
 جھوٹا اٹھ کر چل دے۔“ ذکیہ بی بی کا جی جل کر رہ گیا۔

ساس نے ادھر سے برجھی چھوئی۔ ”اے میں کہوں اب روٹی
 بچے گی یا پونہی آٹا ملتی رہو گی۔ روٹی کی بجائے سو یاں انا لے لے کا تو ارادہ
 نہیں ہے۔“

ذکیہ بی بی نے تھلا کر ساس کو دیکھا: ”کبھی آپ لوگ سبھو کے رہے ہوں
 تو کہتے نا۔ آپ کو تو وقت پر کھانا مل جائے گا۔“

میاں خود دام سے ”تو بچے آگے پیچھے جھول رہے تھے۔ بلے بی
 مارے اتر اٹھ کے کندھے پر چڑھ بیٹھی تھی اور مہنس مہنس کر باپ کے
 ساتھ ہاتھیں ہوا تھیں۔“

”ادد اباجی نے اسے پکارا تو بی بی تک نہیں پہنچے تو موتی بولتے ہی بھاگی
 آئی تھی۔“

”اور ہاں اب۔“ ثنا بولا، ”آپ نے پچ پچ کیا کر دہ تو ویسی
 ہی بیٹھی رہی جیسے اللہ جانے کون بلانا ہو۔ کتنی برسی ہے سالی۔!“
 ”ارے ارے! یوں گالیاں نہیں دیا کرتے تھے بچے۔“
 باپ نے ہچکا کر کہا۔

”تو پھر وہ آئی کیوں نہیں۔؟“

”سبھی اب وہاں ہی گئے۔ اب اسے ہم سے زیادہ اچھے بچوں کا خیال ہو گا۔ اب وہ کیا ہماری بات سنے لگی بھلا۔“

بیالہ نے تو بچوں سے سر راہ یہ بات کہہ دی مگر یہ تیسرے سیدھا ذکیہ کی کہہ دی میں جا کر اٹک گیا۔ پار محل جانا تو اتنی کلب نہ پہنی، مگر وہ تو وہیں چھوڑا رہ گیا۔ دھوپ کے بہانے انہوں نے آنکھوں میں بھرے آنسوؤں کو پونچھا تو سانس نہ دیکھ لیا۔

”دوئی اپنی کو کہہ تو بھرتی نہیں، موئے نا اصلی بلی کتوں کا بھی حسد دھوٹا۔“

بہو نے تڑپ کر سانس کو دیکھا، مگر وہ اپنی کرتی کی تریالی کرنے میں مشغول ہو گئی تھیں۔

دوسرے دن صبح ہونے ہی سب کے سب بھر گودام کی طرف بھاگے۔ اود تو اور اب کے راشد میاں نے ذکیہ بی کو بھی گمبٹ لیا۔

”ذرا دیکھنا تو کتنے پیارے بلو نگرٹے ہیں۔“

ادھر سے اماں چلا پیش۔ ”دوئی کیا کام کے موئے! اٹھا پھینکو۔“

”ارے واہ! اماں بی یہ خوب سائی آپ نے۔“ وہ ہنسنے لگے۔

”بھلا اتنے اتنے، ذرا ذرا سے ٹونگڑے رنہ جا میں گے۔“

”اے! تو کیا گلے میں بازو کر لٹکاؤ گے۔ باہی چار دن کوڑے برن گے تو جگہ جگہ کو موت کرتے پھر نیگے خواہ مخواہ گندگی ہوگی۔“

مناجبت بول اٹھا۔ ”واہ! بلی گندگی کہاں کرتی ہے۔! بیچارے پہلے تو گرٹھا کھودتی ہے اور پھر اس میں.....“

دادی نے پوتے کی بات کاٹ دی۔ ”اے بلیا! تو پھر لستر دیں

سلاؤ، چار اکیا جاتا ہے۔ " یہ اماں تو ہیں سدا لہ نہی کہتی پھرتی ہیں، چلو دکا۔ " بچے تو بچے
 تھے، میان بونگڑوں کو دیکھ کر بچوں کا چہل رہے تھے جیسے سب کے چہلے
 بچے بھی ہوں۔
 جلاگڑے ہیں چیں دودھ پی رہے تھے نہ آ نکھوں سے ٹوٹی ٹوٹی
 گرمیاں کا گرم گردہاں بچے جبار چھٹکے، ملیوں صلیں حتی جلیے اب دنا
 کی کسی چیز کی حسرت، باقانا نہ رہ گئی ہے۔
 " ارے ملی کے لئے دودھ لاتیں ہم، بھوک کی ہوگی، " اور کسی کے
 جواب کا انتظار کے بغیر منا اندر دوڑ گیا۔ فطرتی میں دودھ لے آیا اور
 ملی کے سامنے آہستہ آہستہ سے رکھ کر بولا۔

" لے، پوسی پوسی، پوسی، لے پی لے۔ "
 ملی نے پچ پچ سن کر ایک لمحے کو آنکھیں کھولیں اور دوسرے
 ہی لمحے پھر بند کر لیں۔

" شاید گرم چائے پر دل چا رہا ہوگا اس کا، اب کے شانو
 میاں دودھ گئے جبین کی فطرتی میں چائے لا کر اس کے سامنے رکھی
 اور پڑے پیار سے پچکا کر بولے۔
 " لے مولی، یہ چائے پی لے۔ "

موتی نے چھپائی آنکھیں کھولیں اور پھر بند کر لیں۔
 " ہنس، وہ تو پراٹھا کھائے گی۔ " بے بی انہر دھڑکنی اور مٹھی
 میں نرم نرم پراٹھا دبائے سجا لائی اور بالکل اس کی ناک میں پراٹھا
 گھسیڑ دیا۔

پوسنے حد درجہ ناگوار سی سے بے بی کو دیکھا۔ دکوئی طریقہ ہے کھانا کا
بچوں پر خوراک ایسی چھانگنی۔

”یہ تو کچھ بھی نہیں کھاتی جی ابا۔“

ابانے بچتے ہوئے جواب دیا۔ ”وہ ماں بنکر ہر چیز سے بے نیالہ ہو گئی
ہے بیٹے۔ اولاد کی محبت ہی ایسی ہوتی ہے۔“ بی نے آنکھ کھول کر سب کو
دیکھا، اپنی جگہ سے ذرا اٹھی اور بچوں کو اپنے نیچے کر لیا۔ پہلے بلو نگرے کی
ذرا سی مگر نظر آ رہی تھی۔ پوسی بڑی محنت سے اس کی کمر کو اپنی زبان
سے چاٹنے لگی۔

بچے بد دل ہو گئے۔ پھر سے وہی سوال دہرائے گئے۔

”یہ کچھ کھاتی کیوں نہیں ابا۔؟“

”سبک نہ لگی ہو گی۔“ راشد میاں کو خود کوئی معقول جواب

نہ سوجھ رہا تھا۔

”ارے واہ! سبک کیسے نہ لگی ہو گی۔ ۱ روز تو جب لوسما لوسما
کر کے جاتے تو سہاگی چلی آتی تھی۔ آج کیا ہو گیا۔؟ ۲ روز تو جب تپے سرخو
پہ دھنکار رہا تھا تھی اور آج تو کھانے کو سو نکھتی بھی نہیں۔“

”ارے اسے گوشت کھلانا چاہیے۔“ منا پھر دوڑا اور ہاتھ میں
کچے گوشت کا ایک ٹکڑا پارچہ اٹھائے آیا۔

”ابا تو کھائے گی سالی۔ ۱“ اس نے جوش میں آ کر کہا۔

”سپر وہی نکالی۔ ۱“ راشد میاں کبھی تربیت سے غافل نہ
رہتے مگر سننے نے اپنی نرم جوش میں ان کی تربیت کا کوئی نوٹس نہ لیا اور
علین بی کی بند آنکھوں کے سامنے ٹکڑا لیں ٹکڑا تاکہ سے چھوڑے گا۔

بلانے لگی سس کسمساہٹ کی، اپنی جگہ سے اٹھی اور دوسری کر دٹ
 پر بیٹھ گئی۔ دونوں بوننگڑے دوسری طرف سے دودھ دھونڈنے لگے۔
 ”آج تو وہ کچھ نہ کھائے گی۔“ راشد میاں ہنس کر بولے۔ ”اب اسے
 بچوں کے سامنے کوئی چیز نہیں سہانی۔“

ذکیہ بی کو اچھا دل پہلو میں لٹتا ہوا محسوس ہوا۔ آنکھوں میں
 آنسوئے ہوئے آنسوؤں کو انہوں نے بڑی مشکل سے ضبط کیا اور بغیر
 منہ سے ایک لفظ نکالنے کو دام سے نکل گئیں۔

گھر کی ہنسی پلستی فضا میں جیسے رکاوٹ آ گئی، مگر صرف ذکیہ بی کی
 حد تک۔ دل اندر ہی اندر جیسے کٹا جاتا اور گھر میں تو جب دیکھو تب پوسی
 اور بوننگڑے موصوع بنے ہوئے ہیں۔ میاں باہر سے آتے تو بچے ہاتھ بچہ
 کر سیدھے گودام میں دوڑ جاتے۔ بچے اسکول سے لوٹتے تو پتہ بغلی میں
 شگے ہی ہوتے اور بلی کا لطواف مشروع ہر جانا۔ ذکیہ بی کے دل میں جیسے
 گرہ پڑ گئی۔

”بچہ سچی دنیا میں کیا نعمت ہے۔ چاہے انسان کا ہو، جانور کا ہو
 سب اسی کو گھیرے رہتے ہیں۔“ اپنی خالی کوکھ کا خیال آتا تو اللہ میاں
 پر غصہ آنے لگتا۔

”محلے میں جس کو دیکھو کر پر کا لاپلا بچہ چڑھانے پھرتی ہے۔ گھر
 سجرے پڑے ہیں اور کھلنے کو دانہ دکھا تک نہیں۔ خود میاں کو تین
 تین ہیں۔ میری سبھی گود سبرد تیا تو کیا جانا خدا کا۔“

راشد میاں بڑے دل والے، بڑی محبت والے میاں تھے۔ ذکیہ
 بی کی خالی گود پر انہیں کبھی اعتراض نہ ہوا۔ ہونا کیوں؟ اللہ نے انہیں

تو آل اولاد سے خوشی ہی خوش رکھنا تھا۔ سونے آنگن کو تین تین بچوں کی پیچ و پکار خاصا آہاد کر دیتی ہے، مگر اس کا کیا علاج کہ عورتوں ہونے کے ناطے خود ہی ذکیہ ہی ایکسٹنشن سے وجود کے لئے ترستی تھیں۔ شادی کو سچ سات سال تو ہو ہی چکے تھے۔ کیسے کیسے ارمان جی کو لگے ہوئے تھے۔ مگر سب جی کے جی میں ہی گھٹ کر رہ گئے۔ سوت کے تین تین بچے تھے۔ مگر انہیں دیکھ کر تو بجائے پیار کے ان کے آگ لگتی مٹتی۔ اپنے ہونے تو کیلجے سے لگائے لگائے پھرتی۔ مگر اب تو ان کی منہسی، ان کی بیٹی پکارا جیسے کانون میں چھید ڈالتی۔ بات بے بات دھتکارا کرتی تھی، خواہ مخواہ ڈانٹ ڈپٹ کرتی۔ غصے کی بات پر بھی غصہ اور پیار کی بات پر بھی غصہ۔

پہلے پہل شادی ہوئی تو بچے چھوٹے چھوٹے تھے سمجھ کہ ہماری ہی ماں ہو گئی۔ مگر پہلی ماں ایسی تھی کہ بھول سے بھی پٹسکار نہ کرتی غصہ کی حرکت پر بھی پھلا نہ کرتی اور پیار کی حرکت پر بھی پیار ہی کئے جاتی۔ بھول کے بھی بھول کی چھڑی بھی نہ چھواتی۔ ابڑیاں گھس گھس کر جو ہند کی پوری کر دی۔ وہی اماں اب کیسی ہو گئی تھی کہ دیکھنے ہی آنکھوں میں نمون اتار لیتی۔ کہاں تو وہ پیار دلا رہی اور کہاں یہ روز روز کی پھٹ پھٹا رہی۔ بچے ہی تو تھے، تنہا رہے ہی دنوں میں یہ حال ہو گیا کہ ماں سے کٹے کیلجے پہنے لگے۔ دن بھر ملہا دو چار باتیں کر لیتے تو کر لیتے۔ ورنہ یمنوں آپ ہیں آپ روٹتے بھی مٹنے بھی۔ بہت ہوا تو شام کو باپ کے سامنے شکایت کر دی۔ نہیں تو دادی کی جان پر ستم توڑ لے گئے۔

ساس بہوؤں کی آیس میں کبھی نہیں لپٹی۔ یہ ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے اور ہوتا رہے گا۔ اب یوں دیکھو تو لپٹنے بھی تھے اور لپٹی بھی

اب کوں ارمان سہلا ان کے جھوٹا رہ گیا تھا۔ مگر گھونگھٹ بھی نہ اٹھا ہوگا کہ ساس نے بات پیچھے پھینک دینا شروع کر دیا۔

یہ کبھی ذکیہ بیگم کے دل چڑھے نہ ساس کی زبان رکی۔ مہینے پیچھے ہر بار ذکیہ بیگم کو آس بندھتی کہ ممکن ہے اب کے سے حمل رہ گیا ہو۔ مگر وہ اسی پابندی سے نماز نافہ کرتی رہیں اور ساس اسی لگن سے طعنوں کے تیر برساتی رہیں۔ اور ادھر ہر لمحہ ذکیہ بیگم کی آنکھوں میں منا، شان و ادب بے لی کھٹکنے لگے۔

کچھ والوں نے جھوٹ نہیں کہا ہے کہ خدا کے ہاں دیر ہے مگر اندھیر نہیں۔ ایک بار یونہی ذکیہ بیگم کے منہ اٹھی، تے ہوئی اور چکر پڑ چکے آئے لگے۔ ہاتھوں پیردوں کا دم ہی جھیبے جاتا رہا۔ پلنگہ ہی سے لگ گئیں۔ منہ چکر پڑے دنوں کا حساب بھی سبھول گئیں اور مہینہ چڑھ گیا۔ دوسرے مہینے پلنگ چھوڑ کر اسٹو کھڑی ہوئیں۔ کام کاج میں چلنے، پھرنے لگیں تو ساس نے دیدے گھما گھما کے دیکھنا شروع کیا۔ منہ چکر تو تھے ہی، چہرے کا رنگ بھی پیلا پڑ گیا تھا۔ اور چال میں یہ بہکا بہکا پن۔ دن گزرے جا رہے ہیں اور یہی کہ پابندی سے نماز پڑھے جاتی ہیں۔

ساس کو برا ارمان تھا کہ پانچ پوتوں کی دادی کہلاؤں۔ ذکیہ بیگم تو اپنے رب سے اتنی مایوس تھیں کہ اس قسم کی خوش نصیبی کا خود پر گمان نہ ہو سکتا تھا۔ مگر ہوا یہ کہ دو چار مہینے بعد پیٹ سا بڑھا چلا آنے لگا اور ہر اجنبی بری چیز کے لئے طبیعت لیلیٰ لگی۔ کبھی کھٹے میوے، مینا کو کبھی تیز تیز مونگ کے برے، کبھی جواڑی کی باسی روٹی کے ساتھ

اچار پر طبیعت اندر رہی ہے تو کبھی اودی اودی جانوں پر۔
 ذکیہ بی کو کیسی کیسی شرم آتی کہ میاں بھلا کیا سوچیں گے کہ یہ
 ایسی آل کھاؤنی کیسے ہو گئی ہے کہ ہر چیز پر ہر جگہ کی طرح ٹوٹی پڑ رہی
 ہے۔ مگر ایک دن محلے کی دائی لے، جو وہ نہیں اماں جان سے گپ لڑاتے چلی آتی
 تھی۔ یہ انکشاف کر کے کہ یہو بیگم کو نو پانچواں سہرا ہے، ذکیہ بی کے دل
 کے آئینے میں سو سو گلاب کھلا دیئے۔ آنکھوں کی پتیلیوں میں چاند چمکنے لگے
 دل کے کسی کونے سے آپنی آپ صدا آنے لگی۔

”سو جا رہے میرے پیالے سو جا رہے میرے بالے
 ذکیہ بی ان دنوں زمین پر نہیں آسائوں پر چلتی تھیں اور ہواؤں
 میں اڑتی تھیں۔ ساری چیزیں تندی، ساری بد مزاجی ہوا ہو گئی۔ وہی
 ماس کہ جن سے لڑتے جھگڑاتے ادھر کا سورج ادھر ڈھل جاتا۔ اب
 ایسی پیاری ہو گئیں کہ اماں جان میں تو سب کچھ ہے۔
 ”اماں جان کے دانتوں میں زور بھی کہاں ہے کہ بیچارہ کچھ سخت
 گرم چبا سکیں۔“

”کبھی ستریاں پک رہی ہیں تو کبھی نرم نرم گلنتی، کیسی جادوؤں
 کے آٹے کا حلوہ ہے تو کبھی بادام کا حریرہ۔ بچوں سے بھی آپنی آپ ملتی
 ہو گئی۔ جو چیز آ رہی ہے سب مل بانٹ کر کھا رہے ہیں۔ بچے بچے ہی ٹیرے
 نکادیں نرمی دیکھی تو ادھر جی ڈھک پڑے۔ بچے ماں کے آس پاس مٹلا
 رہے ہیں۔ میاں سے تو تو میں میں کی بجائے پیار و لگاؤ کی بانیں ہو رہی ہیں
 چیز چھاڑ دی ہو رہی ہے میاں تو سو جا رہے سدا ہی کے سیدھے سادے تھے۔
 یہ آپنی آئینہ جاتی تھیں۔ اب گھر پر خوشیوں کا دور دورہ تھا۔ گولے

کرنے سے مسرت ہوئی پڑتی تھی۔
 چلہ نہا کر اٹھیں تو پھر گھر کے سام کاج گئے پڑ گئے۔ مگر اس میں بھی
 ایک لطف تھا۔ ادھر ادھر سے آکر بچے کا منہ چوم جائیں، گود میں اٹھا لیتیں
 سینے سے لگا لیتیں۔ پدشاب کر دیا ہوتا تو پونہ لڑا بدل دیتیں۔ روئے
 نہ روئے آپنی آپ بہلا لیں، منائیں۔ اور جو کبھی رو ہی دے تو کس کی
 ہانڈی، کہاں کی روٹی۔ ہانڈی چلتی ہے تو سو بار چلتی رہے، روٹی
 کو ٹوٹتی ہے تو ہزار بار ٹوٹتی رہے، جیسے ایسا لال لاکھوں روپے دار
 پھینکوں۔

محلے والیاں خواہ مخواہ ہی اتراتی پھرتی تھیں کہ دودھ نہیں
 اترتا، بچے کا پیٹ نہیں بھرتا۔ میوے کھا رہی ہیں، پھل جو رس رہی ہیں۔
 حریر سے ڈھکوس رہی ہیں اور سہر بھی شکایت کہ دودھ سوکھتا جا رہا ہے
 یہاں تو بی ذکیہ نے کبھی میوہ چکھا۔ پھل کی خوشبو ہی سونگھنا۔ بیک نہ جانا
 کہ حریر کیا بنا ہے۔ بچہ پلانے کو بیٹھتیں تو لگتا کہ لیس دو نہ رہیں ہیں کہ
 اڈی چلی آ رہی ہیں۔ کیسا بہتونی دودھ تھا کہ دن بھر بیٹے کو چار چھ
 بار پیٹ بھر بھر بلانے کے بعد بھی تین چار کرتے بدلنے پڑتے۔ جب تب
 گود میں لیتیں محبت کی ایسی لہریں اٹھتیں کہ نہا کھائے پئے ہی دھاریاں
 بہہ جھکتیں۔ بچے کو پا کر ہر چیز سے بے نیاز ہو گئیں۔ سانس کہہ کہہ کر جاتی
 مگر حلق سے گواہ نہ اترتا۔

اچھا برا تو ادھر والا ہی کرتا ہے۔ کون جانے کس بات میں اسکی
 کیا مصلحت چھپی ہے۔ ہم لاچار بندے تو بس یہی کہہ کر دل کو تسلی
 دے سکتے ہیں کہ اللہ کا جو کام ہوتا ہے مصلحت سے ہی ہوتا ہے۔

گرمی کے ذن تھے۔ بدن تھے کہ چھلے جا رہے تھے۔ اترتی دھوپوں میں بچے کو ٹھنڈے پانی سے نہلایا۔ گرمی دالوں کے مارے حیم پھر بھرا گیا تھا۔ موٹا تازہ، گدگد اچھ پانی کے ٹپ میں بیٹھا تو لگا چھپ چھپ پانی کے چھپا کے اڑا لے۔

بچے کو خوش دیکھ کر ماں کا جی کیسا خوش ہوتا ہے۔ ذکیہ بی کے دل میں کوئی جھانک کے دیکھتا۔ گلزار کیلے جا رہے تھے۔

”دوئی دہن غضب خدا کا! ایسی چپکتی دھوپ میں آنکھیں میں بچے کو نہلائے جاتی ہوا در آتی دیر سے پانی میں بٹھال رکھا ہے۔ دھوپ لگ جائے گی نا۔“

”اماں جان گرمی تو دیکھیے۔ جھلسا جا رہا تھا۔ اب کیسا خوش ہو رہا ہے۔“

”خاک خوش ہو رہا ہے۔ منو بیہ ہو جائے گا، ہاں!“

ذکیہ بی کو ہنسی آگئی۔ ”منو بیہ! اوئی اماں جان! بھلا دھوپوں

کے دنوں میں منو بیہ ہو گا۔“

”نم کو بھلا کیا تجربہ ہے بی بی، تمہاری بڑی مند کی بچی پوہنی جاتی رہی۔ اچھی خاصی کھیلتی ہلتی۔ بس نہلانا ہی بہانہ ہو گیا۔ مگر تم لوگ کسی سی ماں کو بھی۔ اگلے زمانے دالوں کو تو تم نے لوگ پوہنی چپکیوں میں اڑاتے ہو۔“

ذکیہ بی نے ہنستے ہنستے سفید توال میں لپیٹ بچے کو اٹھا لیا۔ اور

راشد میاں نے رونے رونے سفید ملل میں لپیٹ قبر میں سلا دیا۔

دو ہی چار دنوں میں ذکیہ بیگم کا کیا حال ہو گیا۔ ذرا سامنے نکل آیا۔

ہاتھ پاؤں سوکھ گئے، دل ردہ ردہ کسے بس ہو۔ ہو گئے جاتا۔ اپنے دیڑھ

دیکھتے، اپنے ہاتھوں ہو کو نہلایا تھا! سفید ملل میں لپیٹ کر موگے

کے ڈھیر بھا چھپا دیا تھا، مگر ماتا کا مارا بے کل جی چین پائے تو کیسے، بے کوئے کھدروں میں جھانکتی پھرتیں، کبھی چو لہے کے پاس دیکھتیں تو کبھی دالان میں، یہاں تو نہیں چھپ گیا، وہاں تو نہیں چھپ گیا، اماں جان آپ نے تو نہیں دیکھا، یہ میں تو سویا تھا، ابھی کے ابھی میں کہاں چلا گیا، کہاں کھو گیا۔

روتے روتے آنکھوں میں گلابی گلابی دھبے تیر گئے، بو بو بکا رتے بکا رتے ہونٹ پڑا گئے، مگر بو کو آنا تھا نہ آیا، عمر بھر کے لئے ریلچے کو سچاٹ لٹکا کر چلتا بنا، بو سچول تھا، ذکیہ بی چین، سچول گیا تو کیا چین اور کیا چین میں سہارا، وہی دن تھے اور وہی راتیں، بات بات پر الجھ پڑتیں، پاگلگوں جیسی حرکتیں کرتیں، کاٹنے کو دوڑتیں، بعد میں پھر کبھی تو گودھر مانتے ہوئی، ان کی قسمت میں ادھر والے نے ایک ہی سچل کھا تھا، وہ بھی ادھ بکا۔

باپ کو دیکھتے ہی بچے آگے پیچھے جھول گئے۔

"ابا ابا! بلونگڑوں نے آنکھیں کھول دی ہیں۔"

"اچھا۔" وہ ذرا بنا دئی جیرت سے بولے۔

"ہاں ابا۔ ادا اب تو وہ ذرا دور تک گھوم پھر بھی لیتے ہیں۔"

بلی کا ٹھکانہ آج کل ذکیہ بی کے اپنے کمرے میں تھا، سات

گھر گھمانے کے بعد اس نے چھپر کھٹ پیچھے ہی اپنی ٹیک لگائی، ذکیہ بی

نے چھپر کھٹ کے پاس راشد میاں کا بڑا سا پلنگ تھا، بچے باپ

کے پلنگ پر چڑھ گئے اور سر نیچے جھوکا جھوکا کر رہ گئے ہوئے بلونگڑوں کو دیکھنے لگے۔

راشد میاں نے بھی سر جھکا کر دیکھا۔ پوس ٹپے اہلنیاں سے دھڑ
 پڑ رہی تھی۔ چھوٹا بلونگر اس کی دم کے پاس پڑا پیادوں کی پیاؤں کر رہا تھا
 "ارے، اس کانے وجہوں والے کو کس نے ماں کے پاس سے
 ہٹا دیا۔؟" راشد میاں ذرا الجھ کر بولے۔

"بہن نے۔" شانوں سہم کر بولا۔
 "اور جو اس کی ماں اس کو رادھو رادھو ڈھونڈتی پھرے گی۔؟"
 "وہ دیہیں تو چپکاپے ابا۔ ذرا منہ موڑیگی تو آپنی۔ دکھ جائیگا۔"
 "خبردار! جو بلونگر دوں کو کبھی ماں سے الگ کیا۔ وہ سارے
 میں چلائی پھیرے گی۔ ہاں سن لو۔" راشد میاں کے بگڑے غور دیکھ کر
 تینوں بچے سہم گئے۔

ذکیہ بی، جو تو بے پردہ ڈال رہی تھیں، روٹی کے ساتھ ساتھ
 اپنا پنجہ بھی ڈال گئیں۔ "سی، کی آواز ان کے منہ سے نکلی۔ انگلیاں
 جل کر کوہ پیا ہو گئی تھیں۔

"خبردار! جو بلونگر دوں کو ماں سے الگ کیا۔" ان کے کانوں
 میں نیس میں گونج باقی رہ گئی۔ "خبردار! خبردار! اہل
 رات کے کھانے پر آلو کا سالن تھا، جو میاں کا من سہانا کھا جا
 تھا۔؟ سوہر کی دال، چپاتیاں اور کھیر۔ آلو کے سالن میں غلطی سے مرچیاں
 زیادہ پڑ گئی تھیں۔ سو سو کر کے کھائے جا رہے تھے۔ بی بی نے کھیر کا
 پیالہ سامنے بڑھایا۔

"ایسا بھی کیا میں کھائے جا رہے ہیں۔ ہٹائیے رکابی سامنے سے ذرا
 کھیر تو لیجیے۔" خندک ٹپ جائے گی۔"

"ابا کبیر۔" راشد میاں خوشی سے بولے بیٹھوں میں کبیر پر دم دیتے تھے۔ پیالہ بچہ جلدی جلدی چمچے چلانے لگے۔ زبان میں اس بری طرح جلن ہو رہی تھی کہ میٹھے سے بھی آگ۔ کبھی نہیں۔ ابھی سوسو جاری ہی تھی کہ پیالہ بچہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"کہاں جا رہے ہیں۔؟" ذکیہ بی حیرت سے بولیں۔

سہنس کر بولے۔ "ذرا پوسی کو کھلا دیں تھوڑی سی۔"

ذکیہ بی ذرا برا مان کر بولیں۔ "خود آپ کے منہ کی آگ تو بجھی نہیں اور ملی کا چو نچلا سوجھ رہا ہے۔ کھالیجے بنا۔ آپ کا تو پسندیدہ میٹھا ہے۔" "ملی بھی تو پسند کی ہے۔ ایسا بھی کیا ہے، بے چاری نے دو دو بچے جنے ہیں۔ کچھ تر مال اسے بھی تولے۔"

باپ کے ساتھ بچے بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ "ہاں ابا۔ اہم کھلا گئے۔ ہم بھی کھلائیں گے۔"

ذکیہ بی نے سامنے سے رکابی سرکا دی۔ "حلق سے اترتے تب نا۔ لگتا تھا سارے گھر والوں کے دلوں پر ملی چھا کر رد گئی ہے۔ اماں جان نے ریشمی کترنوں سے بلونگروں کے لئے مٹکوں میں ڈالنے کو پٹے بیئے جن پر دو دو پیسے میٹلنے والے چھپکتے گھونگھر دیکھی ٹانگ دیئے۔ سردی کے دن تھے اس لئے راشد میاں نے ماں سے سفارش کی کہ ملی کے لئے چھوٹا موٹا، پرلے دھرانے کپڑوں کا نہالچوسی دیا جائے۔ پوسی سردی سے مر نہ جائے گی۔؟"

ملی خال کے کیا ٹھاٹ تھے رز سے گرد نہ پڑتی ہیں اور ہونگروں

۱۔ ۲۔ ۳۔ ۴۔ ۵۔ ۶۔ ۷۔ ۸۔ ۹۔ ۱۰۔ ۱۱۔ ۱۲۔ ۱۳۔ ۱۴۔ ۱۵۔ ۱۶۔ ۱۷۔ ۱۸۔ ۱۹۔ ۲۰۔ ۲۱۔ ۲۲۔ ۲۳۔ ۲۴۔ ۲۵۔ ۲۶۔ ۲۷۔ ۲۸۔ ۲۹۔ ۳۰۔ ۳۱۔ ۳۲۔ ۳۳۔ ۳۴۔ ۳۵۔ ۳۶۔ ۳۷۔ ۳۸۔ ۳۹۔ ۴۰۔ ۴۱۔ ۴۲۔ ۴۳۔ ۴۴۔ ۴۵۔ ۴۶۔ ۴۷۔ ۴۸۔ ۴۹۔ ۵۰۔ ۵۱۔ ۵۲۔ ۵۳۔ ۵۴۔ ۵۵۔ ۵۶۔ ۵۷۔ ۵۸۔ ۵۹۔ ۶۰۔ ۶۱۔ ۶۲۔ ۶۳۔ ۶۴۔ ۶۵۔ ۶۶۔ ۶۷۔ ۶۸۔ ۶۹۔ ۷۰۔ ۷۱۔ ۷۲۔ ۷۳۔ ۷۴۔ ۷۵۔ ۷۶۔ ۷۷۔ ۷۸۔ ۷۹۔ ۸۰۔ ۸۱۔ ۸۲۔ ۸۳۔ ۸۴۔ ۸۵۔ ۸۶۔ ۸۷۔ ۸۸۔ ۸۹۔ ۹۰۔ ۹۱۔ ۹۲۔ ۹۳۔ ۹۴۔ ۹۵۔ ۹۶۔ ۹۷۔ ۹۸۔ ۹۹۔ ۱۰۰۔

گھوم گھام کر آتی ہیں، سپر ہیرو میں بلونگر سے ہیں اور ان کی زبان۔ پتلی
سبز زبان سے اتنا چاشیتیں کہ بلونگر لے سوئے چیلے گیلے ہو جاتے۔
باپ کی اجازت سے بچے بلونگر لے کر اسٹاکر والاں میں آتے
اور گھر گھر سے کوتاہی ہو جاتا۔ فنا لڑا پنا گیند سپینک دیتا اور بلونگر لے
اس کے پیچھے پیک پڑتے۔ بستر بچائے جلتے تو بلونگر لے کر کوئی شہرارت
سو جھو جاتی۔ چادروں، گدروں پر لوٹے پڑتے۔ دو چار گھر دیکھتے جب تک
بچوں کے ہاتھوں پر نہ پڑ جلتے نہ یہ ملتے نہ وہ ملتے۔ میاں میں کر
تہاتے۔

”دیکھا دکا؟ بد معاشوں نے میرے ہاتھ بھی لہو لہا کر ڈالے۔“

ان کے لہجے میں پیار ہی پیار بھرا ہوتا۔

”سب ملی اور اس کے بچوں کے دیوانے ہیں۔ کسی کو فرصت
نہیں کہ دو گھنٹہ کو میرا بھی حال پوچھ لے۔“ ذکیہ بی نے بڑے کرب
سے سوچا۔

سردیوں کی راتیں تھیں، چپلنے کی سروچی پڑ رہی تھی۔ محراب
میں بھی لوہے قندیل جل رہی تھی، سب رضائیوں میں سکڑے سے
پڑے تھے۔ بڑے سے پلنگ پر تینوں بچے آڑے آڑے سوئے تھے۔ اور
خود چھپر کھٹ پر راشد میاں کے پہلو میں ذکیہ بی بی۔

ذکیہ بی نے منہ پر سے رضائی سرکائی اور بے چین نگاہوں سے
کمرے کا جائزہ لیا۔ سبھی سو رہے تھے۔ رضائی کو دھیرے دھیرے کمر
تک، اور سپر ہیروں تک سرکا دیا۔ ہولے سے بستر پر اٹھ کر میٹھی میٹھی
میاں نے جو پلنگ ہلتا محسوس کیا تو مندی مندی آنکھوں سے سیو کی کو

دیکھ کر بولے۔

”کیا کر رہی ہو۔“

”ایسے ہی، پیاس لگی ہے۔“

میاں پھر کر دٹ لے کر سہا ہے۔

ذکیہ بی چھپر کھٹ سے اتر کر کھڑی ہو گئیں۔ میاں کے منہ پر جھک کر اطمینان کر لیا کہ کہیں کچی بیند تو نہیں ہے۔

تھوڑی دیر یونہی کھڑی رہیں۔ میاں خرخر کر رہے تھے۔

ذکیہ بی نے اطمینان کی سانس لی۔ نیچے بیٹھ کر چھپر کھٹ کے نیچے جھانکا۔ ملی تمبیں سیر کو گئی ہوئی تھی۔ دونوں بلونگر ٹے گا دی پر خرخر کرتے پڑے تھے۔ ذکیہ بیگم کی سانس اد پر نیچے ہونے لگی۔ دل کو دبا کر انہوں نے گدی کا کونہ پکڑ کر بولے سے اپنی طرف کھینچا۔

”پیاؤں، پیاؤں۔“ دھکا کھا کر دونوں نے مری مری آواز

میں چلانا شروع کر دیا۔ مدھم سی روشنی میں دونوں بلونگر ٹے بڑے پیارے لگ رہے تھے۔ دھکے سے ان کی بیند میں خلل آ گیا تھا اس لئے بچ مچی آنکھیں کھول کر انہوں نے ناگوار سے ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا۔

ذکیہ بی نے گدی اس انداز سے لپیٹی کہ دونوں بلونگر ٹے اس میں اچھی طرح لپٹ جائیں۔ پھر تہہ کی گدی کو لے کر دھیرے دھیرے آگے بڑھتی، پیچھے دیکھتی وہ آنکھیں میں مکمل آئیں۔

کمرے کی نیم گرم سے فضا سے مکمل کر باہر اک دم شدید سردی میں آکھڑی ہوئیں۔ مگر انہیں سردی کا کوئی احساس نہ ہوا۔

گیارہ بجے کا غل تھا۔ مرزا صاحب کے گھر سے اب تک باتوں کی اور منسی کی آوازیں آرہی تھیں۔ بیگم مرزا کا بڑا اصرار تھا کہ تمہارا بلی کے بلونگرے ہوں تو ہمیں دینا۔ پوسی ستنی تو دیسی بلی، مگر یہ بڑے بڑے جھاردار بال۔ ہگد گدے، نرم نرم، مونے مونے پنچے، بھار بھرم۔ بلونگرے بھی دلیہ ہی ہوئے۔ محلے بھرے میں بہت سوں کے دانت تھے۔

بیگم مرزا اس وقت ذکیہ بی کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئیں۔
 ”اس وقت؟ حیرت تو ہے۔؟“ وہ بوکھلا کر بولیں۔
 ذکیہ بی نے بازو کے نیچے سے لپٹی ہوئی گدی نکالتے ہوئے کہا۔
 ”کیا کہوں بہن؟ تمہارے کہے کا کس قدر پاس تھا مجھے۔ بارود سوختی تھی لا کر دوں گی، مگر بچے اور ان کے باپ جھوٹے تباہ۔ اب سو گئے ہیں تو لے آئی ہوں۔ اور اتفاق سے پوسی بھی کہیں باہر گئی ہوئی ہے۔ مگر بہن! انہیں کہیں اندر ہی چھپا کر رکھنا۔ ورنہ بلی تو پا ہی لے گی اور بچوں کے کہیں دیکھ لیا تو پھر واپس لے سھائیں گے۔“
 بیگم نے دیوانوں کے سے انداز سے بلونگرے چھین لے۔
 ”ارے۔! دونوں ہی!“ ان کی آواز میں خوشی کے ساتھ ساتھ حیرت بھی تھی۔

”ہاں! مجھے معلوم تھا۔ بہن تمہیں بلیوں سے بڑا پیار ہے اس لئے دونوں ہی کو لے آئی ہوں۔ ایک بلا ہے ایک بلی۔ اب اسن چلائی رہو۔“
 ذکیہ بی نے گہرائی ہوئی منسی کے ساتھ کہا۔
 بیگم نے اٹھنے میں ایک تیر چلا یا۔

”ان کی ماں تو نامراد ہائے ہائے نہ مچائے گی۔“
 بہت دیر تک تو ذکیہ بی کو جواب ہی نہ سوچھا، پھر اُکھڑے اُکھڑے
 لہجے میں بولیں۔

”بڑے بھی تو خاصے ہو گئے ہیں نا۔“ بڑی شکل سے وہ ہنسنوں
 تک ہنسی کو گھسیٹ کر لاسکیں۔

”اے مین۔ اہڑے چھوٹے کی نہ کہو، ہوتی آخر اولاد ہی ہے۔۔۔۔۔“
 ذکیہ لہنے ان کی بات پوری مولنے سے قبل ہی کہنا شروع کر دیا۔
 ”تو مین رکھ کہاں رہی ہوا نہیں۔؟“

بیگم نے سامنے ہی دالان میں دھوے صندوق کی طرف اشارہ
 کیا۔ ”اس میں ایک گد بلا بچھو ادھنکی، مزے سے رہیں گے۔ اور اس صندوق
 میں اتفاق سے ایک بڑا سا سوراخ بھی ہے، ہوا جاتی آتی رہیگی۔“

ذکیہ بی جب دسمبر کی کرکڑا دینے والی سردی میں اپنے کمرے
 کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئیں تو ان کے ماتھے اور گردن پر پسینے
 کے بڑے بڑے قطرے جگمگا رہے تھے۔ ڈگ ڈگ ڈگ مگ قدموں سے
 چلتی وہ اپنے پلنگ تک آئیں اور میاں کے بازو پر دھپاک سے ٹپڑیں۔
 صبح سارے گھر میں ہڑ بونگ بھی ہوئی تھی۔

بچے الگ بدحواس تھے، اماں جان الگ چٹکھاڑ رہی تھیں۔ اور
 راشد میاں تو ساکت ہی رہ گئے تھے۔ سب سے زیادہ قابل رحم حالت
 پوسی کی تھی۔ میاؤں میاؤں کر کے سارا گھر سرپاٹھا لیا تھا۔

بلونگرٹے آخر گئے تو کہاں گئے۔؟
 بس ایک ذکیہ بی تھیں کہ روز کی طرح ہر چیز سے سگانا خاک

یگانی بیستی تھیں۔

”بے بی سے پوچھیے ابا۔ ایک دن یہ اپنی سہیل نورینہ سے کہہ رہی تھی کہ بلونگرے بڑے ہرجائیں گے تو ایک تم کو دیدیں گے۔“ شانو بولا۔
 ”واہ وا۔! اچھے ہو جی تم۔“ منا بے بی کی حمایت میں بولا۔

”وہ بے چاری تو خود اتنا پیار کرتی تھی، چپ ٹالنے کو کہہ دیا ہوگا
 ”دیکھئے نا بھائی جاں۔“ بے بی نے اپنا ایک حمایتی پا کر خواہ مخواہ
 بسورنا شردع کر دیا۔ ”میں الزام دے رہے ہیں، خود بخواہ۔“
 ”واہی اماں سے پوچھیے۔ وہ ہمیشہ بولتی تھیں کہ بلونگرے گندے
 دہن ہیں، انہوں نے تو کسی کو نہیں دے دیئے۔؟“

”خاموش رہو بے وقوف۔“ راشد حیاں نے منے کو ڈانٹ دیا۔
 ”بلی نہ کہیں اٹھا کر لے گئی ہو۔“ راشد میاں تھوڑی دیر چپ
 رہ کر بولے۔

”اے داد! سات گھر تو اس نے پھر ادیے، اب کہاں لے جاتی
 بھلا۔؟ رات میں نے خود چھپرکٹ کے نیچے دیکھے۔“

اور انہوں نے بے اعتباری کے انداز سے بہو کی طرف دیکھا۔
 ”اور میں کہوں اگر خود ہی اٹھا کر لے جاتی تو یوں کلپ کلپ کر میاؤں
 میاؤں کہوں کرتی۔؟“

بات تو واقعی دل کو لگتی ہوئی تھی، مگر راشد میاں کی کسی صورت
 تسلی نہیں ہو پا رہی تھی۔ پھر شک و شبہ سے بولے۔
 ”کسی بے دلے نے نہ کھائے ہوں۔“

”سر دی کے مارے دروازہ تو مارے بند کر لیتے ہیں۔ پھر بلا

آئے تو کدھر سے ؟ روشن دان بھی کھلے نہیں رہتے۔“

ہر بات کا واضح جواب موجود تھا۔ پھر :

”میاؤں — میاؤں — میاؤں — میاؤں۔“

بلی بری طرح چلا رہی تھی۔ وہ وہ کر چھپر کھٹ کے نیچے جاتی۔

گودام کی طرف دوڑتی، مودی خالے کے چکر کاٹتی اور پھر جا کر گدی کو منہ سے کھینچے لگتی جو ذکیہ بی لے جہاں کی تہاں پھینک دی گئی۔

”دکھیا کا صبر بڑے، جس نے سبھی اس کا کلیجہ کاٹا ہے۔“

اماں جان نے کلیپ کر کو سادیا۔

ذکیہ بی بیٹھے ہی بیٹھے سر سے پاؤں تک تھرا گئیں۔ بچے الگ رنگ کی بولی بول رہے تھے۔ راشد میاں ہر بار نئی بات سمجھا رہے تھے اور اماں جان کو سنوں کی بھرمار کر رہی تھیں۔ ایک ذکیہ بی کی زبان بند تھی کہ ایک دم سانس نے ان سے پوچھا۔

”وہیں بیگ، تم نے کہیں دیکھے ہیں بلونگڑے۔؟“

ذکیہ بی نے اپنی ساری طاقت سمیٹ کر منہ سے آواز نکالی۔

”میں کسی کے لینے میں نہ دینے میں، میں کیا جانوں۔؟“

صبح سے اب تک یہ پہلی بات تھی جو ان کے منہ سے نکلی اور نہ وہ

خاموش رہی تھیں۔

بلی نے پورے گھر کے چکر لگا ڈالے مگر بلونگڑے ملے تھے نہ ملے۔ پھر

چار، چھ چھ منٹ کو باہر سے آئی اور چھپر کھٹ کے نیچے کھس جاتی اور

ایسی درد بھری آواز سے میاؤں میاؤں کرتی کہ ذکیہ بی کا دل تھرا

تھرا اٹھتا۔

”راند دودھ کے مارے تو تھن بن گئی ہے۔ جانور ہو یا انسان ہو، میا محبت تو اللہ نے سب کو دکا دی ہے۔“ اماں جان، جو سدا بونگڑوں کو خیرات کر دینے کے بارے میں لیکچر دیتی رہتی تھیں۔ آج مانسا کی پکار کے آگے سپراند اڑ ہو چکی تھیں۔

بچے اداس اداس اسکول سدھارے۔ راشد میاں منہ اٹکا آفس چلے گئے۔ اور اماں جان کا دل اس دن سیون میں نہ لگ سکا۔ لاکھ جانور کے بچے تھے۔ مگر دن بھر اچھل بھلاہٹ جوتھی تلگے کی گھنٹی دیکھ پاتے تو اس سے اتنے نیچے چلاتے کہ وہ کھل کھلا کر الجھ الجھ جاتی۔ کترنوں کی وصول دھاتی کرتے۔ اتنی پھینک پھانک کرنے کہ سارے ہن کترنوں اور ناگوں کا جال بچھ جاتا۔ اماں جان بھی منہ لپیٹ کر پڑ رہیں۔ پوسی کی پکار نے ان کا کلیجہ ہلا دیا تھا۔

دو بچے پوسی پھر آئی۔ پیشانی کے پاس سوکھا ہوا خون جما ہوا، ناک پر مارے نشان، منہ ایک طرف سے پھول گیا تھا۔ ایک پاؤں سے لنگڑائی ہوئی، اور گدی کے پاس بیٹھ کر مری مری آوازیں میاؤں میاؤں کرنے لگی۔ یوں جیسے روئی ہو۔

سب اپنی اپنی بولی بول چکے تھے۔ بس ذکیہ بی کی دل کی دل یہ رہ گئی تھی۔ سب کی باتیں ہلک سستی رہیں اور خاموش بیٹھی رہیں۔ اس خاموشی کا اتنا شدید ردِ عمل ہوا کہ دو مہری سے انہیں سننا کہ بغا چڑھ آیا۔

ساس نے کانپتا دیکھا تو اٹھیں اور دالان سے اٹھا کر کمرے میں جا لیا اور رضائی اڑھا دی۔ ایک رضائی سے جاڑا نہ گیا تو دھری

سجی لا اڑھائی۔

بچے اسکول سے لوٹے تو گھر پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ داوی مہیشہ کی طرح سیون نہیں کر رہی تھیں۔ اور اماں بھی چولہے کی بجائے پلنگ پر منہ لیٹے پڑی تھیں۔

شا نو پڑی ادا سی سے بولا۔ "بلو نگر طے نہیں ہیں تو گھر کیا لگ رہا ہے۔ سجائی جان۔"

شا کیپہ نہ بولا۔ دکھ سے سانس لیکر رہ گیا۔ جیسے جی پر بہت بوجھ ہو۔

"ہائے اللہ اپننے تو نام بھی سوچ لئے تھے۔ نارا اور سورج۔ کیوں سجائی جان، وہ پیلیے دھبوں والے بلو نگر طے کا نام سورج ہی سوچا تھا نا، جو بلا تھا۔"

کھے دل سے منا بولا۔ "ہاں بے بی۔ سورج چلا گیا اور نارا جی چلی گئی اور اب گھر کیا اندھیارا اندھیارا سا لگتا ہے۔"

"بڑی عجیب بات ہے کہ چور کا پتہ نہیں چلتا۔" شا نو جبرست اور پریشانی سے بولا۔

بے بی کا نہاد دل محبت اور غصے سے چور چور ہو رہا تھا۔ دانت کچے کچا کر بولی۔

"اگر مل جائے نا تو ٹھال سے نبردق مار دوں۔"

منا غم سے بولا۔ "ہم تو پھر ان کے مالک تھے۔ اس کی ماں کا حال تو سوچو خدا۔ ایک دن کبھی اما دیہ سے گھر پہنچے ہیں تو داوی اما کتنی پریشان ہو جاتی ہیں۔"

”تینوں خاموش ہو گئے۔ مگر گلتا تھا کہ ان کے معصوم دلوں سے
بلوگر دلوں کی یاد کبھی نہ مٹے گی۔“

”اماں کچھ تپہ چلا۔“ ”راشد میاں نے گھر میں داخل ہوتے ہی
مال سے پہلا سوال کیا۔“

اماں جان نے اٹکل سے تیر چلایا۔ ”جس کے دل کو ماں کی مامتا
کا درد ہوئے وہ ڈھونڈھیا کرے۔ ایسا بھی کیا موا کو راہنہ:“
اماں کا شبہ آجا کہ بیوپر جا رہا تھا۔ ”موتی نامراد زخموں سے
’چور چور تھی۔‘“

”کون چور چور تھی اماں۔“ ”راشد میاں نے حیرت سے پوچھا۔
”اے وہی ہتھاری ملی۔ جانے کدھر کدھر کھو جی پھر رہی ہے کہ
سارا منہ سجالائی۔ ناک الگ سو جی ہوئی، پیشانی الگ۔ زخموں زخم۔ خون
بھی بہہ رہا تھا۔“

”ہوں۔“ ”ایک بہت لمبی ٹھنڈی سی سانس آپنی آپ راشد میاں
کے حلق سے نکل پڑی۔“

جھٹ پٹے کا وقت تھا۔ گلی کی مسجد سے مغرب کی نماز کی اذان
بلند ہوئی۔

شانو سرگوشی میں منے اور بے بی سے بولا۔
”سجائی جان! ادا بے بی! چلو مسجد میں چل کر دعا مانگیں کہ
اللہ ہمارے بلی کے بچے.....“

دل برداشت بے بی بولی۔ ”اللہ میاں ہمارے دعا کاٹے کو
سننے لگے۔“

”سچ پچ۔“ منا گہرا کر بولا۔ ”ایسا نہیں کہتے، گنہ ہوتا ہے۔“
 دھڑ دھڑاتے ہوئے وہ تینوں آگے پیچھے بھاگنے لگے۔
 ”اے نارادو! یہ کون کھیلنے کا وقت ہے؟“ چھپے سے دادی
 اماں چلائیں۔

”آنسوؤں میں متھرتی بے بی کی بے بس آواز آئی۔
 ”دادی اماں! ہم اللہ میاں سے دعا مانگنے جا رہے ہیں۔“
 رات کے ٹوبے سرہی اپنے زور پر تھی۔ ادھر ذکیہ بی کا بھاء اپنے
 شباب پر ہنسا کہ وہ رضائی پھینک کر اسٹھ کھڑی ہوئیں۔ آنکھیں سرخ
 ہاتھ پاؤں کانپتے ہوئے، بال اچھے اچھے۔
 میاں نے ہڑبڑا کر پوچھا۔

”کیا کر رہی ہو؟“
 ”ایسے ہی جی گھبرا رہا ہے۔“ درابا ہر جاؤ گی۔“
 ”مگر اس وقت اتنی سردی ہیں؟ تمہیں بخا رہا ہے نا؟“
 ”تو کیا ہوا؟“ وہ کانپتی آواز میں بولیں اور ہلکتی چلتی دروازہ
 کھول کر باہر نکل گئیں۔
 دروازے پر اتنی رات گئے انہیں کھڑا دیکھ کر بیگم مرزا حیرت
 سے بولیں۔

”تم؟ ارے، یہ کیا حال ہو گیا ہے تمہارا؟ کیا بات ہے بہن؟
 خیر میت تو ہے؟“
 وہ ان کے سوال کو نظر انداز کر کے بولیں۔ ”بلو نگرے کہاں ہیں؟“
 ”وہ ہیں ہیں۔ کیوں؟“ ”پھر سنس کر بولیں۔“ وہ تنہا رہی پوچھی

آئی تھی۔ شاید بچوں کی بوپا گئی کہ بار بار صندوق کے گرد گھیرے
ڈالتی تھی، سر جھنتی تھی۔ میں نے سجدہ کا سبک دیا۔ بہت ستانے لگی تو غور
نے دو ایک چہرہ ایسے کس کے مارے کہ منہ الگ سو جا اور ٹانگ الگ لنگرا
گئی۔ ”وہ زور زور سے ہنسنے لگیں۔

”اور بلو نگرے۔“ ”ذکیہ بی نے ڈو تہی آواز میں پوچھا۔
”وہ۔؟“ ”موتے اداس اداس سے ہیں۔ دودھ دیا بھی مگر منہ تک
نہیں لگا رہے ہیں۔ بری بری آوازوں سے رو رہے ہیں۔“
ذکیہ بی نے منت بھری آواز سے کہا۔ ”کہاں ہیں وہ۔؟“ ایک نظر
دیکھ لوں۔“

”دوئی، یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہوئی۔؟“ ”نہیں تو ہیں۔“
مرزا صاحب کی اماں دالان کے کونے میں مضانی میں سرکڑی۔
”سوسا، سی سی، کرتی پڑی تھیں۔ دونوں کو صندوق کے پاس جانا
دیکھ کر پوئیں۔“

”بن ماں کے بچوں کی بھی کوئی زندگی ہے موئی! ماں کی گود کا
مرزہ ہی کچھ اودہ ہوتا ہے۔“

کئی سال ایک لمحے میں گزر گئے۔ اسی ایک لمحے میں ذکیہ بی دلہن
بنیں، سوتیلے بچوں کی ماں بنیں۔ ڈاسن، کوکھ جلی ماں بنیں۔
پھر بہو کی ماں بنیں، اور اب پھر ان کی گود خالی تھی۔
بیگنے آہستہ سے ڈھکنٹا کھولا۔

”میاؤں۔ میاؤں۔ میاؤں۔ امی آؤ۔ امی آؤ۔“
یہ وجہ روتا تھا تو یوں نہیں ”امی آؤ، کہتا تھا۔“

نجاوے سنسناتا جسم کانپ کانپ اٹھا۔ انہوں نے لرزتے ہاتھوں سے بلوگرلوں کو اٹھا لیا۔ چونک کر بولیں۔

”ارے دوہی دنی میں اتنے دبلے کیسے ہو گئے۔“

دالان کے پرلے کولے سے مرزا صاحب کی اماں کی آواز آئی۔

”جانوروں کی بات ہے نہ انسانوں کی، سب جھٹکا سوالی ہے

بیٹا۔ ماؤں سے بچے چھپٹیں یا بچوں سے مائیں۔“

ذکیہ بی کیچہ نہیں سن رہی تھیں۔ بلوگرلوں کو انہی چھاتی سے چٹا کر بولیں۔

”بہن، میں انہیں لئے جا رہی ہوں!“

بیگم مرزا کا مزاج جاتا رہا۔ ”وہ کیوں بہن۔؟“

منہ سے کچھ کہے بغیر ذکیہ بی جلدی جلدی دروازے کی طرف لپکتی

لگیں۔ ان کی خاموشی سے بیگم کا پارہ اور چڑھ گیا۔

”اے داد! خود ہمدیلے اور خود ہی لئے کسی جا رہی ہیں۔ کیسی

ردغلی زبان ہے بی تمہاری! کوئی یوں دم کا سانپ پانا ہے انہی زبان

میں۔“

دردازے سے تھکتے تھکتے، پیچھے مڑے بغیر تیز، لگو کا پتتی ہوئی آواز

سے بولیں۔

”تم نے کسی بچے چنے ہا۔؟“

وہ بے تاباں سے گھر میں داخل ہوئی۔ بلوگرلوں کی چھاتی سے

چٹے ہوئے تھے

”نہ، شانو، بے بی۔ دیکھو بیٹو، دیکھو میرے بچے، یہ تمہارے کھلونے!“

”ہوپا کر پوسی چوکس ہو گئی۔ گدی پر سے جھک کر لالے کر اچکی اور بلونگڑوں پر ٹوٹ پڑی۔ دیوانہ دار چوم چاٹ کر انہیں گیلیا کر لے گئی۔“
 تینوں بچے کسی اندرونی احساس سے متاثر ہو کر اک دم جا پڑے۔ ”آہا تارا۔ آہا جی سورج!“ نیند بھری آنکھوں سے دیکھ دیکھ کر ہری طرح چلائے گئے۔

”اماں جی! اباجی! یہ کہاں سے آئے۔ یہ کہاں ملے۔ یہ کہاں تھے۔“ تینوں کے تینوں بلی اور بلونگڑوں کے آس پاس ناچ رہے تھے۔
 ذکیہ بی کھڑی کا پینٹی جامہ ہی تھیں۔ دونوں ہاتھوں سے اپنا دل ستھام رکھا تھا۔

راشد میاں نے اٹھ کر ان کے شانے پر پیار سے ہاتھ رکھ دیا۔
 ”میں جانتا ہوں ذکا دودن سے تمہارے دل پر کتنا بوجھ تھا۔“
 ذکیہ بی نے گہرا کر میاں کو دیکھا۔ ان کی آنکھوں سے وحشت پیرس رہی تھی۔

”ماں، جب تم بلونگڑوں کو لے کر جانے لگیں تب میں جاگ رہا تھا۔ مگر میں جان بوجھ کر چپکا بنا پڑا ہوں۔ اگر میں تمہارا راز کھول دیتا تو میرے بچاں کے بچوں کو کبھی ماں نہ ملتی۔“

سچے سچے انداز سے ذکیہ بی راشد میاں کو دیکھ رہی تھیں۔
 ”میں جانتا تھا ذکا تم بہت دنوں یہ ظلم نہ کر سکو گی۔ میرا ایمان ہے ذکیہ کہ ہر عورت کے دل میں ایک تاریک خانہ ضرور ہوتا ہے، مگر وقت پڑنے پر اس تاریکی میں مانتا کی مشعل ضرور جگمگا اٹھتی ہے۔“
 ”ہیں۔ م۔ م۔ میں....“ جذبات کی شدت کے مارے ذکیہ بی

کے منہ سے الفاظ مہینیں نکلیں پارہے تھے۔ "جب میں پوسی کی پکار سنتی تھی تو مجھے خود اپنی تڑپ اور ماتمنا یاد آتی تھی۔ جب میں نے سوکھے مارے بلونگڑوں کو روکنے دیکھا تو..... تو..... میں نے سوچا کہ ماؤں اور بچوں کے لئے ایک دوسرے کے وجود کس قدر غریزی ہیں۔ میرا دل پیٹ جاتا۔ میں یقیناً مرجاتی اگر میں....."

راشد میاں نے پیار سے ذکیہ بی کا سر تھپ تھپایا۔
 "تم جی سہر کر و لو ذکا۔ آج تمہاری آنکھوں سے جتنے آنسو بہہ جائیں اچھا ہے۔"

"مگر مجھے رونا نہیں آ رہا ہے۔" انہوں نے بے بسی سے کہا
 اور بچوں کی موجودگی کا خیال کیے بغیر راشد میاں کے سینے سے لپٹ کر پھپھک پھپھک کر رونے لگیں۔

بازگشت

مرغا جو پر پھٹ پھٹا کر اڑا تو سیدھا ڈپٹی صاحب کے کندھے پر جا بیٹھا۔ انہوں نے تکیا کر پیچھے دیکھا، نیلم اور نیکی دور کھڑے ہنس ہنس کر دیکھ رہے تھے۔

”کیوں بے نامہ قولو، یہ مرغے کو کس لئے اڑایا۔؟“

”جی میں نے۔“ نیکی ذرا سا پیچھے کو ہٹ کر بولا۔

ڈپٹی صاحب کفن سچا کر چیخے۔ ”اود کم بخت بولتا بھی ہے کہ میں نے، ٹھیک تو سہی ذرا، خیر.....“

منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے وہ پیچھے پیچھے اور بچے آگے آگے۔ وہ دونوں جھلا کیا ان کے ہاتھ لگنے والے تھے۔ یہ بھناتے ہوئے بہو کے کمرے میں داخل ہوئے اور نیریا سے بولے۔

”بیم صاحبہ سنتی ہو۔ ہمتارے بچوں نے میرے انگ پر مرغ کو بٹکا دیا۔ جو کبھی گندگی کو دیتا۔؟“

نامیہ بغیر بات کی اہمیت کو سمجھ سادگی سے بولی۔
”لو آپ نہا لیتے۔“

”ہائیں! بس نہالینا اور کچھ نہ کرتا۔؟“
 ”سہلا آپ کیا کر لیتے۔؟“ وہ سادگی سے آنکھیں اٹھا کر لہا۔
 ”ارے گندگی جو کر دیتا تو اس نامراد نیکی کا گلا دوچ دیتا۔
 ”اچھا۔؟“ ناسید نے بھولپن سے پوچھا۔
 ”ہاں اور کیا سمجھ رہی ہوں۔؟ دیکھ لینا ایک نہ ایک دن میرے
 ہاتھوں کسی کا خون ہو کر رہے گا۔“

ناسید نے بے بسی سے سرے کو دیکھا، پھر جھلکا کر بولی۔
 ”پاپا آپ سے کئی بار کہا ہے کہ اپنی طرف کا دروازہ بند رکھا کریں۔
 آپ سے خود تو ہوتا نہیں، بچوں پر تہمت دھرتے ہیں۔“
 ڈپٹی صاحب نے دیدے گھا کر میو کو گھورا، پھر چلائے۔
 ”مجھ سے کچھ ہوتا نہیں۔؟ مجھ سے کیا نہیں ہوتا، ذرا نہانا تو؟“
 ”او نہہ۔! ہوتا ہوگا بابا بہت کچھ۔ مگر اس وقت تو سر اسر آپ کا
 قصور ہے۔“

”میرا۔ یعنی کہ میرا۔ یعنی کہ میں نے مرغے کو اپنے ہاتھ سے اپنے
 کندھے پر بٹھایا اور خود ہی مہتا رہے پاس شکایت لے دوڑا۔؟“
 ناسید کو سنسی آئی۔

”آف پیپا، آپ بھی غضب کرتے ہیں! میں بھلا یہ کہہ رہی تھی کہ
 آپ نے اپنے ہاتھ سے مرغے کو کندھے پر بٹھایا۔؟“
 ”پھر کیا کہہ رہی تھیں۔؟“

”اگر آپ دروازہ بند رکھا کریں تو جھگڑے کھڑے ہی کیوں
 ہو کر رہیں۔؟“

”تو مطلب تمہارا یہ ہے کہ سارے جھگڑے محض دروازہ بند کر دینے سے ہی سلجھ جائیں گے۔؟“

”یقیناً۔“ وہ سر جھٹک کر بولی۔

”اور جو تمہارے لاڈلے دروازہ دھکیلنا شروع کر دیتے ہیں۔؟“

”کون۔؟ ہنگی اور نیلم۔؟“ ناہید حیرت سے بولی۔ ”ان کی سبھلا

یہ محال کہ آپ کے دروازے پر جا کر شور مچائیں۔۱۔“

”ہاں ہاں تو پھر مطلب تمہارا یہ ہے کہ میں خود ہی دروازہ دھب دھبانا ہوں اور کہتا ہوں کہ بچے پیٹ رہے ہیں۔ کیا باتیں کرتی ہو تم سبھی۔؟“

”اف خداوند! چت بھی میری پٹ بھی میری۔ آپ نے تو پیا جینا دیکھ کر دیا ہے۔ بچوں سے یوں لڑنے ہیں جیسے ان کے دادا نہ ہوں باوجود برابر کے بچہ بھی ہوں۔“

”ہیں۔؟ میں لڑتا ہوں۔؟“

”پھر کون لڑتا ہے۔؟“

”دیکھو میم صاحب میرا منہ نہ کھلواؤ۔ پھر جب بولنے پر آتا ہوں تو کفن سچھاڑ کے بولے ہی جاتا ہوں۔“

”آپ نے بولنے میں کیا ہی کیا کی ہے۔؟ ہمیشہ ہی کفن بھاڑ کر بولتے ہیں۔ کوئی حد ہے۔؟۱۔“

ابھی دپٹی صاحب گراگرمی میں کچھ جواب دینے ہی والے تھے کہ پچھوڑے کے پیچھے کے باغیچے سے تیز تیز آدا آئی۔
”بولو مٹھو پیارے۔“

”بولو مسٹو میاں۔“

ڈپٹی صاحب کے کان ادھر ہی لگ گئے۔ ناہید بھی گردن اونچی کر کے
سننے کی کوشش کرنے لگی۔ غالباً پنکی کی آواز تھی۔

”پاپول۔ پاپول۔“

تینزی سے ڈپٹی صاحب اچھلے اور پھر بیٹھ گئے۔
”منو بیہم صاحب، منو۔ یہ کم بختے منھو کو کیا بولنا سکھا رہے ہیں
’پاپول، پاپول‘۔ یہ تمہاری تربیت ہے۔؟ بڑوں کو یوں کہا کرتے ہیں۔“
ناہید گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ ”مالی کا ڈو! پاپا میں نے ہرگز ایسی
تربیت نہیں کی۔ یہ تو آپ ہی آپ۔۔۔۔۔“

”ہاں ہاں آپ ہی آپ۔ کہہ دو نا میں نے ہی سکھایا ہے۔“

ناہید نے کچھ رک کر سرسے کو دیکھا، پھر ٹکٹ سے بولی۔
”ہو سکتا ہے آپ ہم نے سکھایا ہو۔ آپ ہی تو دن رات ہر کس و ناس
کو فول فول کرتے رہتے ہیں۔ بچوں نے سوچا ہو گا۔ پاپا تو کہتے ہیں، چلو اپن
بھی ہو۔“

خوں فوں کرتے ہوئے ڈپٹی صاحب لپکے۔

”ابھی انہیں مزہ چکھانا ہوں۔“ ان کے پیچھے پیچھے ناہید لڑی
ہائیں کرتی لپکی، مگر دتت نک چھلانگیں مارتے ہوئے صحن میں اتر چکے تھے۔
بٹر دھبڑ کی آواز سن کر ڈرائنگ روم سے سراج نکل آیا۔ ناہید
سیڑیوں کے پاس کھڑی بے بسی سے ہاتھ دھول رہی تھی۔

”کیا ہوا۔؟“ وہ قریب آ کر بولا۔

”ہوا کیا۔؟ آپ کے پیانے ناک میں دم کر دیلے۔ کوئی بات سمجھا“

بچوں سے ہمارے دادوں کا سا سلوک ہے۔“
 ”اوجھہ۔ ۱“ سراج زچ ہو کر بولا۔ ”یہ تو روز کی کہانی ہے۔ اس وقت گھر کیا ہو رہا تھا۔؟“

ناہیدہ کو ذرا سی سنسنی آئی۔ ”مجھے تو پتہ نہیں کیا ہوا۔ میں سبھی امیرانہ زندگی کر رہی تھی۔ دندناتے ہوئے آئے اور بولنے لگے، سیم صاحب تمہارے بچوں نے میرے انگ پر مرغاشت کا دیا، ابھی یہ بات نبی بھی نہ تھی کہ پچھوڑے سے نیلو اور نیکی کی آواز ان کے کان میں پڑ گئی اور ان کے مرجیں لگ گئیں۔“

”کیوں بچوں نے کیا کہا۔؟“

”منصو کو بولنا سکھا رہے ہیں۔ پاپول، پاپول۔“

ناہیدہ نے سنسن کر میاں کو دیکھا۔
 ”کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ آخر پاپا کب تک یہ دشمنی نبھائیں گے حد ہے کوئی۔“

”الگ گھر کیوں نہیں کر لیتے۔؟“ ناہیدہ تیزی سے بولی۔

”جانے کیسے پاپا ہیں، حیران کر کے رکھ دیا ہے۔“

بات کیا ہوتی، سراج میاں ماں کے بعد باپ کے ہی ہاتھوں لے۔ جب باپ نے بیک وقت ماں اور باپ منکر پالا ہو تو مجبوت کا کیا پوچھنا۔ بالشت برابر کے کپڑے تھے، تب سے ہو کا ارمان تھا۔ پڑھایا، لکھایا۔ پالا پوسا اور بیٹے کو شیرجیا بنا دیا۔ ڈپٹی تھے، سرخ سے کام لیا، کچھ دیا کچھ دیا اور بیٹے کو پانچ سو کی سرس پر چڑھا دیا۔

باپ دورے پر تھے۔ بیٹے اپنی سر دس پر آخر کو آدم تھے، حوا کی تلاش نہ تو ہوئی ہی تھی۔ آدم نے تڑپ لگ کر اپنی پسلی سے ایک حوا برآمد کر لی تھی، انہوں نے پسلی کو چیرنے بھاڑنے کی فردرت نہ سمجھی، اوپر والے صاحب کی نیز طرار کا فونٹ کی پڑھی لکھی۔ فار در دینا ناہید سے گئے چھپے شادی رچا ڈالی۔

ہر بار باپ بیٹے سے ملنے آیا کرتے تو گھر میں وہی اکیلے مردوں کا سونا پن ہوا کرتا۔ کمرے میں ادھر ادھر، یہاں وہاں سگر ٹوں کے ٹوٹے، ماچس کی تیلیاں، راکھ۔ پیٹے ہوئے کاغذ۔ کھونٹیوں سے لٹکے کپڑے، کچھ بیٹے۔ کچھ اچلے۔ ٹائیاں میز پر، جوتے کرسیوں پر اور وہ اس کے عادی ہو چکے تھے۔ اب کے سے جو بیٹے تو کیا ہی کلب دیکھی۔ سب سے پہلے جو پھانگ سے داخل ہوئے تو انگن اور دربانے صحن کو ملانے والے دروازے میں ہرے رنگ کا پردہ اڑ رہا تھا چونک کر دیدے جھپکا جھپکا کر دیکھا۔ پھر نظر اٹھی تو سامنے بیٹے کا کرہ پڑا تھا داخل ہوئے تو سارا سامان سیلجے فرجنے سے سمجھا سمجھایا۔ اب وہ جوتے کہاں تھے جو کرسیوں پر دلتے ہوتے تھے۔ میزوں پر ٹپری رہنے والی ٹائیاں سینگر میں ٹنک رہی تھیں۔ سگر ٹوں کے ٹوٹے جمع کرنے کی جھلس کر لی ایشیڑے میز کے بیچ رکھی ہوئی تھی۔ اور ایشیڑے کے نیچے ہلکے کریم کمر کا ٹیبل کلا تھا۔ جس پر بہترین اور نفیس امبراڈری اور پیر تو نظر اٹھانے کی بھی کیا فردرت رہ گئی۔ وہ تو آپی آپ، اپنے آپ اٹھتی ہی چلی گئی۔ وہ کپڑے جو سدا یہاں وہاں جھولتے رہتے تھے۔ اب اپنے جائز مقام پر پہنچ چکے تھے۔ نادل رسالے، جو ادھر ادھر بکھرے ہوئے

تھے، کولے میں شیلٹ میں رکھے ہوئے تھے۔ وہ یوں حیران حیران نگاہوں سے ماحول کا جائزہ لے رہے تھے کہ پردہ ہلا۔ پردہ ہلتا تو یہ دیکھتے بھی نہ مگر وہ نہری چیلے، جن میں پردہ اٹکا ہوا تھا، کھن کھنائے اور انہیں تو چونک ہی جانا پڑا۔ اس جنت کی سیر لوہری ہوئی کبھی، مٹی کی گاہیں اٹھیں اور جیسے جنت کی حور نکل آئی پردے کے پیچھے۔

”لو سبھی جنت تھی تو سبھی ہی، حمد بھی آپسکی۔“ انہوں نے دل ہی دل میں سوچا۔ آتے ہی پٹ سے بولی۔

”اے پیسا آپ۔ ارے بیٹھے سنا۔ سراج نے مجھ سے آپ کا بار بار ذکر کیا ہے۔ آپ کی تصویریں بھی بنائی ہیں اور دیکھئے ہم نے آپ کی بڑی تصویر یہاں لگا بھی رکھی ہے نا۔“

اس کی اگلی کی گردغس کے ساتھ ان کی آنکھ بھی گردش میں آئی اور یوں اور پر دیکھا کہ وہ دوبرا جان ہیں۔ بیٹھے ہوئے، بھنا کر انہوں نے خود کو دیکھا۔ جھلا وہ کب ہنس رہے تھے۔

”آپ بیٹھے تو، میں اتنے میں آپ کے نہانے کا انتظام کر دالوں گا۔“

بد سراج میاں کہہ رہا تھا۔ یہ تو آپ سب مرحلے لے گئے جا رہا تھا۔ ہونہ اپنا۔ یہی کب اس کا باپ ہوں؟ اور یہ تیسرے کے گھر میں یوں رانی بڑکیوں گھوم رہی ہے۔؟ لا حول دلا قوۃ اللہ کل کی لڑکیوں کو شرم چھا ہے کہ نہیں۔؟ آخر سہاری بھی مائیں بہنیں تھیں۔ لکڑی ڈھری تھی، باہری دنیا بھی دیکھی تھی، مگر لیلہ نیر امیر اگر جانتی ہوتی تھیں۔ آنے دو بچہ کو، ابھی خیر لاتی ہوں۔ ہونہ، یہ سر دوس

ہو رہی ہے۔!“

اسی غلطاً، پچھائی ہی تھی کہ کچھ پر وہ چمن چھنایا اور سچرہ پر پیسکر نمودار ہوئی۔

”مائی گڈ لنس! سینے پر ہاتھ لے جا کر بولی، ”آپ ابھی تک بیٹھے ہی نہیں۔“ میں تو آپ کے لئے پانی بھی لگو آئی۔ سراج آتے ہوں گے۔ پیچھے شیو کر رہے تھے، اچھلا آپ کے سامنے یوں کیسے چلے آئے۔“ واہ، بے باکی سے ہنسنا تو دیکھو۔ اور سراج کا ذکر یوں کرتی ہے جیسے ساتھ کا کھیلا ہو۔ اسے بھٹی کرنا ہے عمر بھر شیو، تمہیں کیوں لگ رہی ہے۔“

بیٹھے بیچ دتا ب کھاتے رہے کہ ذرا کم بخت کوادھرتے تو وہ۔ پھر دیکھتا ہوں۔ کم بخت آیا تو اس ہیبت کے ساتھ کہ نگاہ نیچے ہے اور پر نہ ہوتی تھی، اور پہلے تو آنے کی خبر پاتے ہی پکا چلا آتا تھا۔ سلام دعا تو ”در رہی، دیکھتے ہی لٹکا رہے۔“

”کیوں میاں کس کنکار کو پکڑ لائے۔“
”کنکار۔“ ”بیٹے کے دیدے لٹے سیدھے گھوڑے، حلق کا شوک بشکل اندر گیا، کھٹکارے اور بولے۔“
”وہ۔ وہ توجی۔ آپ کی جہو ہے۔“

”ہائیں! مہو۔“
بس یہی دو الفاظ ان کے منہ سے نکلے اور پھر جو پکی لگی تو زبانی کھلی ہی نہیں۔ دھاں بیہوں۔ دھاں پھول کرتے سارے میل پھرا کرتے۔ وہ تو کھوڑے نے سادی رو دلا سادی کہ کیسے میان جی بیٹیا کے ”عسک“ میں سچنے، کیسے بڑے صاحب نے بیٹیا کو ”آجادی“ دے رکھی

ہے کہ جو چاہے کرتی پھرے۔ رہا ڈیٹی صاحب کا معاملہ، تو دوسری بات تھی۔ بیٹیا تو اچھی تھیں ہی، مگر چراغ لے کر ڈھونڈتے نہ تھے بھی ایسا داماد نہ ملتا۔ اگر داماد مل بھی جاتا تو ایسا نہ ملتا جو بیٹیا کو اتنی چاہت سے بہا لے جاتا۔ اکلوتی اولاد کو اکلوتے باپ کی ذرا تو یاد رہی۔ اور سبھی بوڑھوں کا کیسے صرف سہرا دیکھ لینے سے ایسا کوئی ارمان پورا ہو جاتا ہے۔ اصل چیز تو گھر، زندگی ہے، سو کبھی نہ کبھی دیکھ ہی لیں گے۔ سو آج دیکھ رہے تھے۔!

کس کا بیٹا؟ کہاں کی بہو؟ جو حالات کا پتہ چلے۔ اور حالات بھی ایسے، تو کیا جی ٹھیرے؟ جیسے آئے تھے ویسے ہی چلے گئے۔ وہ تو ڈیٹی صاحب کا نانا کا تھا، اپنے زمانے میں اچھے اچھوں کے تین پانچ کر دا دیئے۔ بیٹے کو کیا خاطر میں لائے۔! مگر برا ہوتا دے کا، باپ بیٹے پھر آن لے۔ اور اب تولد نہ منڈ، بھول گولی پوتا بھی ساتھ آیا۔ جب ایک ہی شہر میں دونوں کی سروس چلے تو الگ گھر کیسے رہ سکتے ہیں۔؟ اور پھر باپ کی نشین ہو گئی تو جانے بھی کہاں۔؟ رہتے تو یہیں تھے، مگر سدا انگاروں پر جلا کرتے۔ اپنے وقتوں میں انہوں نے انگلش بھاری سننی اور صاحب لوگوں کی دنیا دیکھی سننی مگر وہ جو پرانے وقتوں کی خوب تھی تو جاتی کیسے بہو بیٹے کا کیا حال تھا کہ بس تو یہ۔!

اس طرف سرسرا کر، اس طرف بہو بیٹے کا۔ دینا نے کیا ترقی کی کہ ساری شرم جیا ہی جاتی رہی۔ بیٹے آفس کو جا رہے ہیں اور علی الاعلان میم صاحب سے کہہ رہے ہیں۔ "واہ سبھی دا۔" آج تو الوداعی دس دیا ہی نہیں۔ "اور پھر چٹاخ پٹاخ شرور ہر جاتی۔" "ارے نا معقول"

یوں پیار کرنے کو کون منع کرتا ہے۔ مگر ذرا یہ تو سوچ لو کہ دیوار آدھی
بڑھے باپ کا کردہ ہے۔ لا حول ولا۔!

ڈپٹی صاحب کا دل کبھی بہو بیٹے سے مل سکا۔ پوتا تھا وہ الگ
گنوں کا نور۔ ایک کیا سدا اس کے ساتھ لگی رہتی، مگر وہ جب دیکھو تب
دادا کے کمرے کو گھاتا۔ ماں باپ پیپا پیپا کرتے تھے سو آپ بھی
دادا کو پیپا کہنے لگ گیا۔ ان کی ناز کی جگہ، قرآن منزلیں، جاہ نماز،
سب الگ تھلگ کونے میں ہوتی۔ یہ جاتا اور وہیں جگہ دوت کرتا جاتا۔
بہو سے تو باپ مارے گا یہ تھا۔ نام تو کبھی لیا ہی نہیں، نرمی پسند
گھرانے کی بیٹیا کو سوائے میم صاحب کے اور کیا کہہ کر بچا را جا سکتا ہے۔
پہننے کی خطا پر بہو یاد آتی۔

”دیکھو میم صاحب تمہارے بچے نے جاو نماز پر چٹاپ کر دیا۔“
”پپا،“ وہ بڑی منٹائی آواز سے بولتی، ”میں نے سکھا تو نہ دیا
ہو گا۔“

”اور کہا میں نے سکھا یا ہے۔“ الٹ کر وہ ہر بار یوں ہی جواب
دیا کرتے۔

بہو بیٹے تو جیسے تھے سو تھے۔ پونے سال کا کیا حق چلا۔
مسلمانوں کا گھرانا اور نام دیکھو کیا الٹ پلٹ رکھ چھوڑے تھے۔ الیا
کیا اب سوائے منکی کے دینا بھر میں کوئی نام ہی نہ ملا۔

اور تو اور عیب وہ کسی کی گڑیا جیسی بھی پیدا ہوئی تھی کلو کے
ہاتھوں کی کہلوایا کہ مریم نام رکھیں۔ مہیں صاحب وہاں تو
دیہی ہو گا جو جی میں آئے گا۔

”اے کلہوے تو کیا جانے رے نام دام؟ (یہ بیٹے صاحب فرما رہے تھے) اس کی آنکھیں تو دیکھ کیسی نیلی نیلی ہیں۔ بس اس کا نام تو سلیم ہی ہوگا۔“

دادا نے مارے غصے کے کبھی تسلیم پر ہی سے ہٹ کر کچھ نہ کہا۔ یوں بات ہی کیا کرتے۔ جو کبھی شکایت کا موقع آتا تو بس تسلیم پر ہی ہی بول جاتے۔

اپنے کام میں مگن رہتے۔ دن بھی گزر جاتا پڑھنے لکھنے میں، رات بھی۔ اب جو پیش ملی تو گویا مرنے کا پروانہ آ گیا۔ اب تو سارا سارا دن گھر پر ہی پڑے رہتے کبھی یہ کتاب الٹ رہے ہیں، کبھی وہ رسالہ کبھی پرائے پرانے دوستوں کے خط نکال نکال کر پڑھتے تو کبھی مالاب علمی کے زمانے کی تصاویر لے کر بیٹھ جاتے۔ کھوا بار بار یاد کیا جاتا۔

”اے دیکھ، یہ جب کی تصویر ہے کہ میں بیس سال کا تھا۔“
 ”تو نے سچا یا یہ کون ہے۔؟ اے میں ہی تو ہوں۔ ڈرامے میں میں بادشاہ بنا تھا۔“

یوں ڈھیر سارا الم غلم آس پاس دکھائی پڑے تو بھلا بچوں کو چین کیسے آئے۔؟ ادھر سے نیکی، ادھر سے تسلیم کبھی یہ اٹھائیں، کبھی وہ پٹخ دیں۔

”میم صاحب سے بولوا اپنے بچوں کو بلوائیں۔ میں اٹے ہاتھ کی جھاڑ دوں گا۔ ہاں۔“

”میم صاحب سے کہہ دو، رونے چلانے کی آواز آئے تو پھر درٹی نہ آئیں، ہاں۔“

اور کبھی ایسا ہو جاتا کہ دادا جی نے دانت پیس کر ایک آدھ جھا
ہی دی، ادھر سے سراج دوڑا آتا، ادھر سے ناہید بیلانی ہوتی نمودار
ہوتی۔ سراج تو بگڑے تیور دیکھ پونہی شک جاتا، ناہید ماں کا دل لئے
لے کانپ جاتی۔

”پیا، کوئی حد ہے، بگال تو دیکھیے کس قدر لال ہو رہا ہے۔“
یہ ایسا طعنہ چھوڑنے۔ ”باپ گورے، ماں گوری، اولاد کیوں ڈھیٹ
کے ایسی آئے۔؟ وہ تو کال ہی خود بخود لال ہیں۔“
ناہید پاؤں پیختی چلی جاتی تو یہ ہاتھ جھلا کر وارنگ تہ
دیتے۔

”بچو! جواب کے آئے تو یاد رکھنا، ہاں، خون نکل پڑے گا منہ سے۔“
چیلیں جوں گوشت پر منڈلاتی ہیں یہ دادا پر منڈلاتے۔ ادھر
ان کا پنکی ٹپا رہ کھلا کہ دونوں موجود۔ دادا کی جھڑکی گھر کی سن ہی
رہے ہیں اور شرارتیہا کر رہے ہیں۔ اور بڑے میاں آجا کے نیم
صاحب، میم صاحب، کرتے دوڑے جا رہے ہیں۔

”میم صاحب تمہیں اپنے کام دھام سے فرصت ہو تو ذرا دیکھ
جاؤ کہ ان نامعقولوں نے میری ڈاڑھی کی کیا گت بنا رکھی ہے۔“
دادا کو تو ڈاڑھی رکھنی قیامت ہو گئی۔ آجا کے کم بخت ڈاڑھی
کی شامت۔ سلیم تو اسے چھوٹی موٹی جھلاڑ ہی سمجھتی کئی بار اصرار کر چکا
تھا کہ وہ سفید کالی جھلاڑوان کے استعمال کو دسے دی جانے، مگر
پپا سنتے کب سنتے۔؟

”سننا میم صاحب تمہاری سلیم پر میں نے میری ڈاڑھی مٹھی میں پکڑ لی۔“

آخر تہارے ہاں تہذیب، تربیت سکھائی جاتی تھی۔ کہ نہیں؟
 ”ہاں؟ ہائی گاڈ ہیں آپ کی شکایتیں سننے سننے بور ہو چکی ہوں۔
 دیکھ لیجئے ایک آدھ دن میں خود کشتی کر لوں گی۔“

”تم سے پہلے میں کیوں نہ کر لوں؟“ اور جب وہ تیز تیز قدموں
 سے صحن میں کھدے کنوئیں کو دوڑنے تو خیال آتا کہ پہلے اپنی کتابیں تو
 سمیٹ لوں۔ کون جانے میرے مرے بعد پوتا پوتی کیا حشر کر دیں ان کا۔؟
 کتابیں سمیٹتے، رکھتے، قفل لگانے تک مرنے کا خیال اچھا خاصا دور
 ہو چکا ہوتا اور پھر ایسے شیطا نوں کے چھپر مرنے اور وہ بھی خود کشتی کرنا،
 کس قدر ویسی بات تھی۔ ان سے نوگن گن کر بدلے لینے کو کئی سو سال زندہ
 رہنا چاہیے۔ ہاں، یہ ہوئی نہ کوئی بات۔

دو چار مہینے میں ہی تپہ چل گیا کہ پوتا پوتی سے تو دل ملتا نہیں،
 اور وقت تو کاٹے سے کٹتا نہیں بیٹے بہو سے تو آگے ہی دلی میلا تھا۔
 کم بخت نیش بھی کیا موقع سے ملی تھی۔ اس دن ٹہلے ٹہلے صدر گئے آنے
 آنے دائیں ہاتھ میں پتھر لٹکا لائے۔ پتھر کے اندر میاں مٹھو براہِ حال
 ہرے ہرے پر، لال لال چونچ، چونچ میں لگی بیج پر ادھر سے ادھر،
 ادھر سے ادھر صمد کے جا رہے تھے۔ ابھی بھی تک کے اندر داخل
 ہوئے بھی نہ تھے کہ تین ٹیپ، ٹاٹیں ٹاٹیں کی آواز سارے میں مچ گئی۔
 ناہید نے سو بیٹے بیٹے سلاٹھا کر دیکھا۔ کھڑکی میں پردہ جھول رہا تھا۔
 اٹھ کر آئی۔ دیکھا تو سر سے مٹھو سنبھالے چلے آ رہے ہیں

”ہو نہ، اب مٹھو سے دل بہلا بیٹے گے۔“ اس نے جلا کر
 سوچا اور پھر سے آکر صوفے میں دھنس گئی۔ نیلم پر لادہ نیکی کسی مور کے

کو سر کرنے میں جتنے ہوئے تھے۔ نئی نواڑی آواز جوسی تو ادھر ہی لپکے آئے۔

”ارے پیارے کیا ہے؟“

”پیارے کیا بولتے ہیں؟“

”ارے پیارے۔۔۔۔۔“

”تمہارا سر۔؟“ وہ جل کر بولے۔

”ہمارا سر۔؟“ پھر ہمارے سر کو کیا بولتے ہیں۔؟“

کلوا گپڑی سے ہاتھ پونچھتا برا مرد ہوا۔

”ارے مالک یہ مٹھو کا ہے خرید لائے۔؟“

”ہوں تو مٹھو نام ہے اس چرم یا کا۔؟“

دونوں آگے پیچھے ڈرائینگ روم کو دوڑ گئے۔

”ڈیڈی، مئی، پیارے مٹھو لائے ہیں۔!“

”پیارے مٹھو لائے ہیں۔!“

اب ڈیڈی صاحب خالی وقت میں مزے سے مٹھو کو بانٹیں کرنا کھاتے

ہوتے۔

”مٹھو میاں کو روٹی چاہیے۔“

”مٹھو میاں کو غصہ آ گیا۔“

”ڈیڈی صاحب، مٹھو کو پانی پلائیے۔“

بیج بیج میں نیکی اور نیل گھس گھس کر انٹی مانگ اڑاتے۔

”نیل بی بی مٹھو کو روٹی کھلاؤ۔“

”نیکی صاحب، مٹھو میاں کو غصہ نہ دلائیے۔“

”اؤ میں آکر ڈپٹی صاحب نے مٹھو کو سکھا دیا۔

”نیکسی فول، نیلم پری نامعقول۔“

نیکسی نے جوابی کارروائی شروع کر دی۔

”مٹھو پیارے بولو، ’پپا فول، پپا فول۔“

آدھی بات مٹھو کے منہ میں، آدھی بات نیکسی کے منہ میں تھی کہ پپا اٹھ اور پوتے پر پک پڑے پوتا بھی ڈپٹی صاحب کا سٹھا۔ آگے آئے نیکسی، چھپے چھپے پپا۔

دونوں بھاگتے بھاگتے سراج کے کمرے کے سلنے سے گزرے تو اسے قہقہہ مگاتے ہیں پڑی۔ بیٹے کے ہنسنے پر ذرا انہی پوزیشن کا خیال آیا تو دھیرے سے چھڑی بٹخ اپنے کمرے کو ہوئے۔

”نامعقول کہیں کے۔“ انہوں نے دروازہ اپنے پیچھے بند کرتے ہوئے دل کی جھان زنا ری۔

ایسے بیہودہ بچے تھے کہ مٹھو کو جینا نہ لینے دیتے۔ اچھا یہ بات دیکھوں گا بچو جی۔! جو ادھر آئے تو مانگ ہی توڑ ڈالو گا۔“

کلواتا شتے کے لئے انڈے خرید کر لایا تو ڈپٹی صاحب کی نیت میں فتور آ گیا۔ ایسے بڑے بڑے انڈے! داد بھی واہ ایسے نکالنے چاہئیں۔ ایسے انڈے تو بس لنگھارن مرغیاں ہی دے سکتی ہیں۔ یا سپر مارکا۔

”چلو انڈے بجاتے ہیں۔“

بیکار آدمی کا دماغ تو یوں ہی شیطان کی دوکان ہوتا ہے۔ انہیں کام تھا بھی کیا! پتہ پوچھو خود ہی انڈے خریدنے چلے۔

اکیس انڈے، ان پر بٹھانے کو ایک کر دی مرغی۔ اب نکلیں گے پچھلے تریسٹیں گے وہ بے ہودے سراج زادے۔

مرغی کی وہ وہ خاطر ہا ہوتیں کہ بس اپنی بیگم کی ہی کی ہوں گی۔ جب کہ وہ خود بچہ دینے والی رہی ہوں گی۔ روزانہ انڈوں کی گنتی ہوتی ہے۔ کھانے پینے کا خیال رہتا۔ چپ تنگ یہ دانہ چھوٹے انڈوں کی رکھوالی کرتے کہ نیکی اور نیلیم پر ہی انڈوں کو خرد ہونہ کر دیں۔ کان لگا کر سننے کی کوشش کرتے رہتے کہ انڈے چوں تو نہیں ہو رہی ہے۔

اکیسویں دن تو سچے پچ ہی چوں چوں، چلیں چلیں کی آواز سنائی دینے لگی۔ بس خوشی کا عین عین وہی حال تھا کہ جیسے سراج میاں پیدا ہوئے ہوں۔ مرغی تو خود ہی اپنے چوں کے حق میں شیرف ہوئی ہے۔ مگر یہ کیا کم تھے۔ پیل اٹھا کر نہ لے جائے، اس مارے آگے پیچھے ہی رہا کرتے۔ یہ چلی کے سببانے شکر اہو کر رہ گئے۔

”اب جلیں کچھت چوزے دیکھ دیکھ کر۔“ وہ دانہ چکاتے چکاتے مزے سے سوچتے۔ بچہ کس کی ماننے والے تھے۔ ڈیڑھی مٹی ناں ناں کرتے ہی رہتے اور یہ دادا کی گود میں گھسے ہی جاتے کسی چوزے کی دم پکڑ کر اچھال دی، کسی کو ایٹ دے دی۔ دادا کو دق کرنے لگی کھینچنے سے باہر نکال کر دیا کسی کو باغ کی راہ تبادی کہ کھودتے رہو اور دادا جی کو جلاتے رہو۔

ایسی بے ہودہی ماں تھی۔ یہ مرغی بھی۔ اسارے بچوں کو لے کر باغ میں گھس جاتی اور نیچوں سے ساری زمین کھودنی شروع کر دیتی۔ ماں

کی قیادت میں بچے بھی کھودا کھادی شروع کر دیتے اور ارد گرد بھی صاف
کاناک میں دم آجاتا، ہنکالتے ہنکالتے۔

مرغیوں کو بند کرتے تو اکھڑے اکھڑے پودے اور ننھی ننھی
گھاس دعوت دیتی کہ آؤ میاں ملیا فریبہ دو۔ پانچے کھوس، آستینیں
چڑھا یہ لوگ سکارڈننگ پر تل جاتے۔ بیچ بیچ میں پنکی اور نیلم پر سی
اپنی خدمات پیش کئے جاتے۔

”پیا، لایے گڑھا ہم کھودیں۔“

”لایے زمین کھرپ دیں۔“

باپ کی طرف سے ایسا غصہ دل میں بیٹھا تھا کہ کسی بات کا ٹھیک،
سے جواب نہ دیتے۔ وہ وہ کے ممی کو طعنے پڑتے اور خود بچوں پر گالیاں
مٹی میں سے ہوئے ہاتھ جھاڑتے ہوئے اٹھتے تو پامسٹری کی کتابیں
لے کر بیٹھ جاتے۔ اب بڑھاپے میں پامسٹری بننے کا شوق چرایا تھا۔

ایک دن کتابیں الٹے پلٹے بیٹھے تھے کہ دونوں جان پر مار دیے گئے۔
”پیا یہ آپ دن بھر کیا پڑھتے رہتے ہیں؟“ پنکی بولا۔

”اور جھبک جھبک کر تفصیلی میں کیا دیکھتے رہتے ہیں۔“

نیلم پر سی تو بس پنکی کے نقش قدم پر چلتی تھی۔

”تمہارا سر۔ ا۔“ ان کا سدا ایک ہی جواب ہوتا۔

”واہ، آپ کی تفصیل میں ہمارے سر کہاں سے آئے سہلا۔“

پنکی حیرت سے بولا۔

”پیا جھوٹ بولتے ہیں۔“ نیلم نفرت سے بولی۔

اور جیسے انہیں قائل کرنے کو پنکی بولا۔ ”سعید اٹکل سے

آپ کہہ رہے تھے کہ نہیں کرنا تھو دیکھ کر آگے کا حال تباہتے ہیں۔
اس نے شرارت سے اپنی تھیلی بڑھا کر کہا۔ ”پاپا کل میں کیا
کر ونگا۔؟ تباہیے تو۔“
دادا نے گھور کر مستحیسی کو دیکھا اور بولے۔ ”ڈنڈے کھانے کی

آرہی ہے کیا۔؟“
نپکی تھیلی بڑھائے ہی تھا تو دانت آچکا کر بولے۔ ”کل تو آپا
مٹھائی کھائیں گے جناب، اما اما۔“
دوسرے دن نپکی اور نیلم صبح ہی صبح اٹھ بیٹھے۔ دادا کی کہی بات
تو پروری ہوئی ہی تھی۔ دونوں ان کے کمرے میں گھس گئے۔ دادا جان
ناشتے کے لئے اڈولٹین، بسکٹ اور مسکہ سلائس لا کر رکھتے ہی
تھے، دونوں نے انہیں باکل سچا پامسٹ بنا دیا اور سچوٹی جتانے
کو ان کے پاس پہنچ بھی گئے۔

”بپا آپ تو سچ مجھے ہی سچا سچا حال بتاتے ہیں۔“
انہوں نے جیسے میں سے گھورا۔ نیلم نے بات کی وفاحت کر دی۔
”کل آپ نے کہا تھا نیس کہ مٹھائی کھائیں گے۔؟ آج تو سچ بچ
کہا۔ وہ آپ کے کمرے میں کریم بسکٹ۔ جیلی اور مکھن تھا کہ نہیں؟“
پاپا لپک کر اٹھے اور جا کر الماری کا جائزہ لیا تو نہ چلا کہ قسمت
کا حال کتنا سچا بتایا تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ ڈرائیونگ روم کے
دروازے میں سرخ سرخ آنکھیں لئے جٹکھاڑ رہے تھے۔

”بیم صاحب ہمارے صاحب کی ننھا پورے ساڑھے سات
سوے۔ اپنے لاڈلوں سے کہو اپنے باپ کا کھائیں۔ باپ کے باپ کا کیوں

کھا جاتے ہیں۔ ؟

”کیا ہوا پیا۔ ؟“ وہ پوچھتا ہوا ہوتی ہوئی۔

”ہننا راسر۔ ! ایک سرے سے سارا خانوادہ ہی اوندھا ہے۔
شوہر دیکھو تو اس رنگ کے۔ بیوی دیکھو تو اس رنگ کی، اور بچے دیکھو
تو ایسے۔ آخر تم لوگ مجھے جینے دے گئے کہ نیٹیں۔ ؟“

”ہم نے سہلا کیا منہ کیا ہے آپ کو جینے سے۔ ؟“

”ہاں ہاں تو میں خود ہی گویا مرنا چاہتا ہوں نا۔“ ان کی اس
طرح کی الٹ پٹ باتوں سے ناہید زچ آچکی تھی۔

”میری کسی چیز کو چین نہیں۔ مگر وہ دیکھو تو کباڑ خانہ۔ ؟ باغ
دیکھو تو اگسل کھل۔ ؟ مرغیاں دیکھو تو پر کھی۔ ؟ سب دیکھو تو کائیاں
سکھا رکھی ہیں بے ہودوں نے۔ ؟ ملی دیکھو تو لٹری۔ ؟ آخر یہ سب کیا ہے ؟
وہ چیخ کر لوٹے۔

ناہید نے کچھ جواب نہ دیا تو سہلا کر لوٹے ”یہ تعلیم یافتہ گھرانے کی بات ہے۔
ہونہ۔ ! بچوں سے بینک نہیں سکھایا کہ بڑوں سے کیسا سلوک کرتے
ہیں۔ نا معذولی کہیں گے۔“

• مراج ان کے پیچھے ہنستا ہوا نکلا اور بیوی سے بولا۔

”کیوں برس رہے تھے پیا۔ ؟“

ناہید الجھ گئی۔ ”خوب ہیں آپ کے پیابھی۔ کوئی بات سی بات ہو۔

جانے کیوں گرم رہتے ہیں ہر دم۔ ؟“

”ارے ڈارنگ میں نے ستر بار تم سے کہا ہے کہ بوڑھے آدمی ہیں۔

ان کی بات کا نوٹش نہ لیا کرو۔ دراصل میں نے تو میرج کر کے اسہیں مستقل

ناراض کر دیا۔ دلچسپ برے آدمی نہیں ہیں۔ یقین کرو۔“
 ”بڑے اچھے آدمی ہیں۔ کیجیے چھلنی کر دیا ہے میرا تو۔“ سراج ہنس دیا۔
 ”چپ اور پے تہلے کو ابھا کرتے ہیں۔ بیچ بچھوڑا ہی کرتے ہیں۔“
 ”ہاں آپ تو اپنے پیانے کی سائیڈ لیں گے ہی۔ تہلے کو کبھی کوئی اتنے
 سالوں تک غصہ نہ کیا کرتا ہے۔ شاد کا ہو گئی، بچے ہو گئے۔ بچے ہاتھ
 کرنے لگ گئے اور حنا ب کا غصہ ہی نہیں اتر چکتا۔ اپنی تو جان ضیق
 میں ہے۔ آپ تو بھیرے ہا ہر کے آدمی، دن بھر گھر میں وہ ہم بچا رہتا ہے
 ادھر مرغیاں کڑکڑا رہی ہیں، ادھر سے مٹھوٹے، مٹھو پیارے، کی
 رتہ رتہ رکھی ہے۔ بلی مبادی میاؤں کرتی لپک رہی ہے تو مرغی دقت
 ہے، وقت اذانیں دے رہے ہیں۔ اچھا خا خا۔ انیل فارم کھول رکھا ہے
 آپ کے پیانے تو۔“

سراج ہنستے ہنستے دوہرا ہو گیا۔ ادھر کچھ چھوڑے سے ابھی تک۔
 ڈپٹی صاحب کے کڑکڑانے کا آواز ہی آرہی تھیں۔

اب کبھی نیکی اور نیلیم پر می ڈپٹی صاحب کو تانے آنا سکتے تو وہ
 بھی مہرے بن جاتے، مزے سے منگن رہتے۔ باجری اور حواری کی کون
 مرغیوں کو چکانے رہتے۔ دونوں پیچھے سے مرغیوں کو ایسے ہشکانے کہ
 کبھی تو پیالے کندھے پر کبھی سر پر۔ اس وحشت میں کسی نہ کسی مرغی
 سے خطا ہو جاتی اور پیالے چارے گویں نہا جاتے۔ ویدے سرخ کر کے
 پیچھے لپکتے، تباہک دونوں اٹھ بچھو ہو جاتے۔ باغبانی کرنے کو کیا ری
 میں پیچھے تو حجارے سے جا بے جا پانی اندھیل دیتے۔ مٹھو کو ہاتھ
 کرنی سکھاتے تو دونوں گالیاں سکھانے تیار ہو جاتے۔ کتابیں لے کر

بیٹھتے تو پیچھے سے کرسی کو دھکے دیتے کہ بس کتابیں رکھتے ہی بن پڑتی۔
کبھی بی بی کو پیار کرنے کا موڈ سوار ہوتا تو نامراد اس کی دم کھینچ کر ہنگامہ
کھڑا کر دیتے۔ ڈپٹی صاحب کی جان زچ آجکی تھی۔

اس دن سہ پہری کو نامہید اپنے کمرے میں لیٹی ہوئی تھی۔ سراج
آفس کا کوئی اہم کام کر رہا تھا۔ ڈپٹی صاحب حسب معمول اپنی اسٹیشن
میں جتے ہوئے تھے اور بیچی اور نیلم باغ میں روندن بچارہے تھے۔
ہوا یہ تھا کہ کوئی مرغی ان کی مٹی کی کیا ری کے گلاب کو بھی جگ گئی
تھی۔ اس سے بدلہ لینا ضرور تھا۔ وہ جدھر جدھر جاتی دونوں بھی
پیچھے پیچھے ہی جاتے۔ اس مقابلہ بازی میں باغ کی وہ گت بن گئی کہ پاپا
کا بھلا نہ انا صاحب باغ کھنڈیرا بن گیا۔ ڈپٹی صاحب کا وہ حالت کہ بس
انگوروں پر بیٹھے ہوں جیسے تنک تنک چلتے ہوئے مہو کے کمرے پر وارد
دونوں کو دیکھ دیکھ ایک تو ان کے یوں ہی آگ لگا کرتی۔ بہنو بھی تو
تھی، بیٹا بھی اس کے رنگ میں رنگ گیا کم نجت۔ اسیر پائے کو جاتے
وقت جب گھر سے باہر نکلتے تو ہانپتوں میں ہاتھ اور آنکھوں میں آنکھیں
لا حول ولا۔ اور جرمیاں کو پیار آتا تو وہ کاغذی پنچہ اپنے منہ تک
لے جاتا اور۔ کوئی بے شرمی سی بے شرمی ہے۔ اسے یوں مجب کر کے
کاغذی ہی ہے تو شوق سے کر د۔ مگر یہ تو سوچو کہ گھر میں بددعا باپ بھی
ہے۔ ہر پتھر کردہ یہی سوچے جانے۔ آخر ہمارے بھی شادی ہوئی تھی۔ ہم
بھی تو ہائی سوسائٹی میں مود (Mod) کرتے تھے، مگر اس بے ڈھنگے
پن سے اس ماں باپ کے کار بن گئے یہ درو تو ہو۔ ذرا جو کوئی کام یہ
ڈھنگ ہو۔

”سیم صاحب میرے کہہ دیا۔ اپنے بچوں کو دیکھو، ورنہ...“
 نامید سونے کے قریب تھی، یوں کفن پہاڑ کے وہ چلائے تو اس کی
 آنکھ چٹ سے کھل گئی۔ گھبرا کر بولی۔

”کیا ہے پیہ؟“

”دونوں نے میرا سارا باغ روند ڈالا۔ کیا تمہارا یہ کام نہیں

ہے کہ انہیں تنبیہ کر دو۔“

”آپ ہی نے انہیں سرچڑھایا ہے تو میں بھی کیا کروں۔؟“ جھجکا گئی۔

”میں نے؟“ وہ چیخ کر بولے۔ ”ارے میں نے یا تم نے اور تمہارے

صاحب بہادر نے۔؟“

”آپ نے۔ آپ نے۔ آپ نے اگر پہلے سے ہی آپ یوں محبت

نہ کرتے تو ان کی کیا مجال تھی کہ آپ کے منہ آئے۔؟“

”ڈپٹی صاحب کو بھجھو کاٹ بھاگنا۔“ محبت؟ ارے میں ان حرام

زادوں سے محبت کرتا ہوں۔؟ تنھو۔ لا حول ولا۔! یہ لکھے محبت

کے قابل ہیں سبھلا۔؟“

حرام زادے! کیا یہ حرامی پلے تھے۔؟ باقاعدہ شادی ہوئی

تھی تب پیدا ہوئے تھے۔ پھر یہ پیا کیا کہہ رہے ہیں۔؟

نامید کا چہرہ بھبھوک گیا۔

”پیا آپ کی ہر برسی سبھی بات برداشت کر لی۔ مگر آپ یہ گالی

سبھی دینے لگے۔؟“

”ہاں ہاں دونگا۔۔۔ دونگا۔۔۔ پھر وہ بالکل بچوں

کے انداز میں چلائے۔۔۔ اسی۔ اسی۔ اسی۔“

کوئی دوسرا موقع ہوتا تو ناہید کو یوں بوڑھے سارے آدمی کو زبان چڑاتا دیکھ سنہی کا دورہ پڑ جاتا، مگر اس سے تو وہ ادور ہو رہی تھی۔ اس نے وہ ہتھیار استعمال کرنا شروع کر دیا جو پولین کے پاس بھی نہ تھا۔ آئسو۔ !

پہلے تو ڈپٹی صاحب نے دیدے بھاڑ کر دیکھا کہ یہ کیا ہو گیا، پھر خود کو ڈھکیٹ نہا کر بولے۔ "ہونہ، آئسو۔ !"

سراج فونٹین ہاتھ میں تھامے تھامے سیزاری سے بانہ بکلی آیا۔
"پا، آخر آپ گھر میں سدا طوفان کیوں اٹھائے رہتے ہیں۔؟"
اس کے لہجے میں حد درجہ ناگواری اور سیزاری جھلک رہی تھی۔

کبھی کبھار جواب دینے سے بہتر یہ ہوتا ہے کہ صرف گھوڑی لیا جائے، سوڈ ڈپٹی صاحب بھی محض گھوڑ کر رہ گئے۔

سراج اپنی ہی کہے گیا۔ "اور حیرت اس بات پر ہے کہ بچوں سے آپ یوں کھینٹے کھاتے ہیں جیسے کوئی برابری والے ہوں۔"

"پھر کیا ہاتھ لیے کر کے عورتوں کی طرح تمہاری میم صاحب سے لڑا کروں۔؟"

"کیوں، میم صاحب سے لڑنا الیا کیا فروری ہے۔؟" وہ
تکیا ہو گیا۔

"اس لئے کہ وہ مجھے پسند نہیں۔"

ناہید نے میاں کو دیکھا، جیسے۔ "اب کہیے نا۔؟"
سراج فونٹین گلے میں اٹھا کر، اکھاڑے میں اتارنے کے سے
انداز سے بولا۔

”سجھلایہ تو بتائیے کہ اس کی کون سی بات پسند نہیں؟ اس میں کیا کمی ہے۔“

”تم نے اتنی فارورڈیوی کر کے کوئی اچھا کام نہیں کیا۔“ وہ بغیر جھجھک کر بولے۔

”فارورڈ ہے اسی لئے ٹپکی ہوئی بھی ہے۔ ورنہ آپ کی نفیحتی سے تنگ آکر تو کبھی کی رفوچکر ہو گئی ہوتی۔“

”یہ۔“ وہ چیخے، ”میں نکا نفیحتی کرتا ہوں۔“

”اور کون کرتا ہے پھر۔“ سراج تیز سے بولا۔ ”میں آپ سے صرف اتنا پوچھنا چاہتا ہوں کہ آخر ناپید سے آپ کو کیا شکایت ہے؟ آپ کا کون کام پورا نہیں ہوتا؟ ناستے میں دیر ہوتی ہے یا کھانا نہیں ملتا۔ یا نہانے کو گرم پانی نہیں میسر؟ یا پھر اور کوئی شکایت ہے؟“

”خوشخبری دیر بڑے میاں سوچتے رہے۔ پھر رسان سے بولے۔

”ایسی تو کوئی شکایت نہیں۔“

”تو پھر پرسوں سے یہ جھگڑے رگڑے کیوں چل رہے ہیں۔“

”ڈپٹی صاحب تیزی سے پیچھے پلٹے اور صفائی دینے کے انداز سے بولے۔ ان مردوں کی وجہ سے۔ ان دو کمینوں کی وجہ سے۔ اگر اکیلی میم صاحب کا واسطہ ہوتا تو شاید میرا غصہ اتنی بھی چکا ہوتا مگر انہوں نے۔ ان نامعقولوں نے میرا بھیجا آؤٹ کر رکھا ہے۔“

”کبھی ماں پر غصہ، کبھی بچوں پر۔ بات ایک ہی ہے۔ دراصل آپ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کے گھر سے چلے جائیں۔“ ناپید بہت دلوں سے یہ بات کہنی چاہتی تھی تو ج بول ہی گئی۔

”ہاں ہاں تمہارے باپ کا گھر نہیں میرا گھر ہے، چلی جاؤ۔
چلی جاؤ ابھی اسی وقت، کون روکتا ہے۔“ شہر میں بہت سے
فلیٹ خالی ہیں۔“

سراج نے ناہیدہ کو دیکھا، ناہیدہ نے سراج کو۔
تھوڑی دیر عجیب ہینٹیاک خاموشی طاری رہی، پھر سراج
رسان سے بولا۔

”تو یہ بات تھی پیا۔! ہمیں پہلے اندازہ ہی نہ ہوسکا کہ ہم یوں
آپ کی نگاہوں میں کھٹکتے ہیں، ورنہ آج سے سالوں پہلے گھر خالی کرچکے
ہوتے۔“ تھوڑی دیر رک کر وہ دھڑ سے بولا۔

”ہم کل یا پیرسوں یہاں سے چلے جائیں گے۔!“
کئی سالوں بعد آج وہ دن طلوع ہوا کہ ڈپٹی صاحب کو سکون
ملا۔ روزانہ تو صبح ہی سوہرے دونوں پوتا پوتی ہلور چلنے آں موجود
ہوتے تھے۔ آج ناہیدہ کی دکھتی رگ پر ہاتھ پڑا تھا اس لئے اس
نے دونوں کو کمرے میں بند کر رکھا تھا۔

”جو کمرے سے باہر قدم رکھا تو پیرس کاٹ ڈالوں گی۔“
دونوں مرے مرے ہاتھوں سے سایاں بیک کرنے لگے۔ ڈپٹی
صاحب مزے سے فخر سے اپنے کاموں میں لگن رہے۔ گردن اونچا کر کرکے
فاتحانہ انداز سے دیکھے جانے، جلیے۔

”دیکھا کیسے سب گایا کم بختوں کو۔!“
دھیر کے کھانے کے لئے میز پر داؤد کھلوا یا تو دونوں کو
جھپٹی سی مل گئی۔ پھر دادا کے آگے چھپے ہوئے لگے نیچا تال پیش کر دیا۔

”اباجی، ہم تو نئے گھر کو جا رہے ہیں۔“
 ”اے دہاں آپ تو ہوں گے بھی نہیں۔“ نیلم نے لقمہ دیا۔
 ڈپٹی صاحب کا پارہ چڑھ گیا۔ ”میں کون مرا جاتا ہوں تمہاری
 قربت کو۔“

غصے غصے میں سراج فلیٹ ڈھونڈ آیا۔ نوکروں اور مالکن نے
 مل کر پکینگ ختم کی۔ دن بھر سارا اثاثہ اٹھانے میں ٹوٹ گیا۔ دونوں
 ردہ کر، مٹر مٹر کر دیکھتے کہ اب پیپا آئیں گے، تب پیپا آئیں۔ اور
 ہاتھ پکڑ کر لو لیں گے۔

”ارے تم دونوں بھی بس بچے سے ہی نکلے۔ کیا یوں گھر چھوڑ دیا
 کرتے ہیں؟“

نگر وہ تو وہیں کہ کسی پر دھرنا دیے بیٹھے رہے۔ بس نماز ادا
 کرنے کو اٹھے، پھر کسی پر برا جانا۔ ایک ایک کر کے سارا سامان
 بندھ گیا مگر ڈپٹی صاحب اس سے مس نہ ہوئے۔
 ٹرک میں سامان لاد گیا۔ پھر اسکوٹر بھاگ میں داخل ہوا تب
 بھی وہ وہیں جھے رہے۔ بیٹا دیدے گھاگھا کر دیکھتا رہا مگر وہ بے
 نیگ نہیں۔

سب مرحلے طے ہو گئے تو بچے، بیٹیا، بہو ملنے کو آئے۔ دور ہی
 سے رکھائی سے بولے۔

”جاؤ اللہ خوش رکھے، اور خوش کیوں نہ رکھے گا۔؟“
 اسکوٹر میں بیٹھے بیٹھے تو سچ بچے تا سید کی آنکھیں چمک پڑیں۔
 ”یوں گھر چھوڑنا کتنا برا لگا رہا ہے تا سبجو۔“ وہ دیکھ بولی۔

”جیہاں ہم نے کتنے خوشگوار دن گزارے۔“
 سراج کی خود حالت غیر ہو رہی تھی۔ مگر وہ بھرم قائم رکھنے کو بولا۔
 ”کاپے کے خوشگوار دن تھے۔ دن رات تو کل کل میں گزرتے تھے۔“
 مگر اس کی آنکھیں ہر سنے لگیں۔ ”بائے بے چارے پیا اکیلے کیسے
 رہیں گے۔ ان کے کھانے پینے کی کیا برابری ہوگی۔ جانے کیوں مجھ
 کم بخت کے منہ سے گھر چھوڑ دینے کی بات نکل گئی۔ سارا قصور میرا ہی
 تو ہے۔“ وہ پھچک پڑی۔

سراج جھلا گیا۔ کیسی عورت ہے یہ۔ خواد مخواد اپنے سرقصور
 منہ رہی ہے۔ تیزی سے بولا۔

”یہ خیال تو انہیں آنا چاہیے تھا۔ کمال کرتی ہو۔“
 اسکوڑ بھاگلہ سے نکلنے لگا تو اس نے جھک کر دیکھا۔ شاید باپ
 روک ہی لیں، شاید ان کے چہرے پر غم کی چھاپ ہو۔ مگر اسکوڑ زن
 سے باہر نکل گیا۔

دوسرا دن تو ڈپٹی صاحب کے لئے عید بن کر آیا۔ صبح ہی صبح اٹھ
 مگر یہ کیا۔ پانچ منٹ، دس منٹ، بیس منٹ، آدھا چھوڑ پورا
 گھنٹہ گزر گیا مگر بیڈی اب آتی ہے نہ جب۔
 ”ہونہہ اہم کب کسی کی پروا کرتے ہیں۔“ جھلا کر اٹھے اور باڈ
 خلعے کو چلے۔ اما کو پٹسکار بنائی۔ مگر وہ قطعی بے خیر تھی۔ یہ سارا
 کام دھام تو کلوے کے ذمہ تھا۔ جو اچھا خاصہ صاحب لوگوں کا بیر
 بن گیا تھا۔

دھوپ تیز ہوئی تو انگنائی میں نکل آئے۔ کتابیں ٹولنی شروع

کہیں۔ ایک دو منٹ تو بڑی مستعدی سے پڑھتے رہے۔ پھر طبیعت
سین بھن کرنے لگی۔ آدھ گھنٹے میں کتاب شریف پر پہنچ چکی تھی اور
یہ خود چلا چلا کر ماما کو آواز دے رہے تھے کہ ناشتہ میں کیا دیر باقی ہے؟
”آج کس قدر سکون ہے۔“ انہوں نے بشارت سے سوچا۔
چلو ذرا مرغیوں کی خبر لے آئیں۔ باجر ہا، جواری کی کوٹن لے کو ڈر بے
کے پاس پہنچے۔ بڑے سکون سے مرغیوں نے دانہ چگا۔ پھر مٹھو کی
باری آئی۔ کٹوری کا پانی بدلا۔ ہری مرچیں کھلائیں۔ کچھ باتیں کیں۔
چلنے کو ہوئے تو وہ تیزی سے بولا۔

”پاپول، پاپول۔“

یہ سبنا کر مٹھے اور بری طرح چلائے۔ ”اے بول، پنکی فول،
پنکی فول، یہ نکالی اس کم بخت نے ہی سکھائی تھی نا۔؟ اور پھر نامراد
نیلیم پر۔!“

مٹھو اچھل اچھل کر بولنے لگا۔

”پنکی فول، پنکی فول۔“

پھر وہ بڑے اطمینان کے ساتھ باغ کو چل دیئے جہاں اسٹاکر
پانی دیا۔ پودوں کی کانٹ چھانٹ کی۔ پھر ملی کی خبر گیری پر جھٹ گئے
سارے مرحلوں سے نہٹ کر وہ مزے سے آرام کر رہا ہو کر باٹری
پر پہنچ گئے۔

پھر رات بھی وہی سکون اور اطمینان لے کر طلوع ہوا۔ باجری
کھلتے ہیں کوئی مرغی گھبرا کر نہ اچھلی، اور اچھل کر ان کے کندھوں
پر نہ بیٹھی۔ پانی پہا پانی دینے کا جھار لپونہی رکھا ہوا تھا۔ مٹھو سیدھے

سادے سجاؤ میں کہہ رہا تھا۔

”ڈپٹی صاحب مٹھو پیارے کو روٹی دیجئے۔“

کتا بلی پیچھے سے دھکے دے دے کر گرائی حمار ہی تھیں نہ اچھالی
جاری تھیں۔ انہوں نے دو چار صفحے الٹ کر کتابیں والپس رکھ دیں
اور بلی کو گود میں لے کر اس کی نرم نرم پشت پر ہاتھ پھرنے لگے۔

تیسرا دن تو اس سے بھی زیادہ پرسکون نکلا۔ مرغیاں خاموشی
سے دانہ چبکتی ہی رہیں تو انہیں تنگ کر غصہ آگیا: ”سہلا ایسی صلاحیت
سبھی کس کام کی؟ مگر وہ کیا سنتا؟ ہرے سے چبکتی رہیں۔ پودے انہی جگہ
جھوٹے جارہے تھے، نپتے نچے ہوئے نہ سپول ٹوٹے ہوئے۔ مٹھو بھی ادھر
ادھر اچپک کر داتی انداز سے مٹھو پیارے مٹھو پیارے، لی رٹ
لگائے حمار ہاتھ۔ بلی لنگڑا کر چل رہی تھی نہ دادا کی کرسی پیچھے سے
گھسیٹی حمار ہی تھی۔ سارے میں ایسی خاموشی کہ سولی گرنے تو آواز سن
لو۔ مرغیاں عقبوں سو پر لی طرف، بلی سو رہی تھی۔ پودے خاموش، کتابیں
سوئی سوئی مٹھو۔ وہ الگ پردوں میں سرد بائے اور نگہ رہا تھا۔

اک دم پچھٹی صاحب نیڑی سے اٹھے۔ پہلے تو مرغیوں کے پیچھے
خوب دوڑنے پھرانے کے ساتھ ساتھ الٹ گئی۔ پھر حمار نے میں پانی بھر کر کپا ریا
سجھانے لگے۔ اپنے ہاتھوں پودوں کو کھسکا۔ پھر بلی کی شامت آگئی۔
اس مٹی دم بک کر ایسے کھینچ دیئے کہ وہ بلبلا گئی۔ شایف سے کتا میرا جان
جان کر گرائی شروع کر دیں۔ سارا گھر درہم برہم ہو گیا۔ اک دم وہ لپک
کر مٹھو کے پاس پہنچے اور پیچھے سے عجلت سے دیا۔ سہا سہا یا مٹھو
برای طرح جاگ پٹا اور ڈپٹی صاحب کی صورت دیکھ کر چپخنے لگا۔

”پنکی فول، نیلم فول۔“

دونوں ہاتھوں سے انہوں نے پیچھے کی سلاخیں تھام لیں اور مٹھو
کے کان میں چبیے۔ ”پول، پیپا فول، پیپا فول۔“ مٹھو نے کہنا کر انہیں دیکھا
اور سپردہ نوں مل کر زور زور سے چلانے لگے۔

”پیپا فول، پیپا فول۔“

اور ٹپ ٹپ موتی ان کی آنکھوں سے نکل نکل کر ڈارھی میں جذب
ہونے لگے۔



کانچ کا دل

رائی دلہن پورے دنوں سے تھی۔

بی ساس کا سلیجہ ہاتھ بھرکا ہو گیا تھا۔ بڑے گھر میں یہ کوئی پہلا نہ جگایا جاتا تو تھا منہیں جو یوں سیاہی بھول کی طرح کھلی پڑتی، مگر یہ بھی تو قسمت کی خوبی ہی تھی تاکہ اوپر تلے کے چار بیٹوں میں سے کسی نے تو اس بیگم کو پونے کی داوی نہ بنایا۔ لے دے کے انگنائی، معنائی اور گھر بھرے میں لڑکیاں ہی لڑکیاں پھرا کر تیں۔ اماں تو رہ کر سوچتی۔ ”ہے، جس بہو کو دیکھو شاپ بیلوں کی طرح بیٹیاں جنے جا رہی ہیں۔ آخر ان کا کیا ہو گا۔ اور خاندان کا نام کیسے چلے گا۔“ مگر وہ صرف سوچ تو سکتی تھیں۔ لیکن لڑکیوں کو پیدا ہونے سے روک کہاں سکتی تھیں۔

دھنیا دائی محلہ چھوڑ پورے گاؤں میں مشہور تھی۔ جہاں کسی نئی نور ملی پر اس کی نظر پڑی اس نے جھٹ وپس بنا دیا۔

”میں کہوں بہو ہوتا جنے گی۔“

اگر کسی کو بیٹی ہونے کی بات سادی تو کیا مجال جو بیٹیاں سراشار چلے۔ وہ تو چال دیکھ کر بات میچا نئی تھی۔ خود اس کی اپنی بہو نے ایک کے بعد ایک، چھ بیٹے پیدا کر ڈالے تھے۔ ميا کو بیٹا رانی کا وہ ارمان

خفا کہ نچلے والے بیٹے کو سدا رنگین کپڑے پہنا کر زیور سے لادے رکھا
 ہاتھوں میں سونے کی چوڑیاں، اور تو اور چین چین کرتی جیباں بھیجیں بھی
 پیروں میں ڈال دیں۔ بڑی بوڑھیاں تو کہتی بھی تھیں کہ اس کی تو عقل
 الٹ گئی ہے، بچپتے ہی سے اسے بیٹی کا سوانگ دے رکھا ہے، بھلا اس
 پر کیا اثر پڑے گا؟ ساری عمر ماں کے کولہ سے لگا ہنڈیاں دھوتا اور روٹیاں
 بیٹا رہے گا۔ بیواؤں کے طعنے جب سمجھتی تھی، مگر ماتائے مارے جی کو مہنی
 سنی سنی کھلی کی لگن تھی تو پوری بھی کیسے پڑتی؟ مگر اگلے برس جب بہو کو حمل
 ٹھہرا اور وہ سہم سہم کو قدم اٹھانے لگی اور اہلی گہلی پھر سچے کر کچے بچے پر چلنے
 لگی تو ساس نے ایک دن اس کے چہرے کا رنگ دیکھ کر کہہ دیا۔

”میں کہوں اب نہنے کے انگ پر سے ریشم اور زیور اُتار لے۔“

ہونے چکا کہ ساس کو دیکھا تو ساس سنہی اور بولی۔ ”اور کیا
 یہ دیکھ، رات کو نیند میں میں نے زبرے گھلے سے گھسنا رسی اور نوکسمائی
 تک نہیں۔ نیند ایسی ٹوٹ کر آئے تو بیٹی کو ساتھ لاتی ہے۔ ادھر تیرا
 پیٹ تو دیکھ، ابھی سے پھیلا پھیلا سا ہے۔ بیٹیا پیٹ میں رہے تو پیٹ
 ادھنچا رہتا ہے نا، اس لئے۔“

”اچھا۔“ بہو ذرا خفگی اور ذرا بشارت سے بولی۔ ”تو اس
 کا مطلب تو یہ ہوا کہ بیٹی ماں باپ کی ناک کشائی آتی ہے تو پیٹ بھی
 چٹپٹا چٹپٹا ہوتا ہے۔ یہی مطلب ہے نا تیرا۔؟“
 ساس تو اپنے چھ پتوں کی داہی کہلائے جانے پر نازاں رہتی تھی۔
 مہنس کر، برا منائے بغیر بولی۔

”اور تبا تو سہی، کون بیٹی نے ماں باپ کا مان رکھا ہے۔؟ آئی

بھی ہے تو مہمان کے سامان . جاتے جاتے آنکھ میں آنسو اور دل میں درد
ہی تو دے کر گئی ہے نا۔ بول جھوٹ کہتی ہوں۔ ۹۔“

بھوکھ نہ بول پائی۔ مگر جب سہا پے کے دن قریب آئے تو اس کو
ساس کی بات رہ رہ کر یاد آتی رہی۔ اور جب کچے بکے دردوں سے
گزر کر اس نے سکون کا سانس لیا تو دادی ہنس ہنس کر محلے والوں
سے کہہ رہی تھی۔

”اے میں کہوں چوری والی کو بلاؤری، گھر میں سہاگن براجمی ہے۔“
مگر رانی دہن کے حق میں تو دھنیا دائی کی سپٹی گوئی بھی اٹھی
ہی پرسی پیٹ دیکھو تو آسمان سے پائیں کرنا تھا اور جہنم دیا بیٹی
کو۔ ایک بار نہیں، دو بار نہیں، تین بار میپی ہوا۔ گھر میں لڑکیوں
کی فوج کی فوج تیار ہو رہی تھیں۔ جھٹا نیاں، دیورا نیاں سبھی
لڑکیوں والی تھیں۔ اس خاندان میں ہی بیٹیوں کا کمال تھا۔ ہاتھ
کی بات تھی نہیں۔ پامین درود پڑھ پڑھ کر بیٹوں کی پیدائش کی
دعا کرتا مانگیں بھی، مگر اجر پڑے گھر میں کبھی تو دیا نہ جلا۔

اب کے پھر رانی دہن پورے دنوں سے تنہی اور ساس کا دل
پھر ادھر پہنچے ہو رہا تھا۔ دھنیا دائی کی بات پر یقین تھا نہ پیٹ
کے اسمار نے انہیں امید بندھائی تھی۔ بس ان کا دل رہ رہ کر آپ ہی
آپ کہتا تھا کہ کچھ بھی ہو اب کے پوتا ہو گا ہی۔ مگر رانی کے دل پر
تو ایسے سیاد بادل چھائے ہوئے تھے کہ سورج کی کرن بھی انہیں چرتی
تو اجالانہ ہو پاتا۔ اور اسے اطمینان یوں بھی تھا کہ کچھ دس ایک تو
بیٹیوں والی ماں نہ تھی، یہاں تو سارے کے ایک ہی ٹکسالی سے دھل

دھل کر چلے آ رہے تھے۔ نہ سانس لے کبھی رانی سے اپنی امید اور دل کی بات بتائی، نہ رانی نے ہی سوچا۔ ہاں مگر یہ ضرور ہو کہ جب ایک رات سونے سوتے رانی جاگی تو گہرا کر سہی کہنے لگی۔

”ہائے اماں یہ کیسا درد ہے۔ پیٹھ سے اٹھ اٹھ کر لہریں سارے جسم کو بچرٹ لے رہی ہیں۔ ایسا پہلے تو کبھی نہ ہوا۔“

”ایسا پہلے کبھی تو نہ ہوا۔“ اماں کے سارے جسم نے کان بن کر بس اتنی ہی بات سنی اور وہ بستر پہ کل کے کھلونے کی طرح پھرتی سے اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

گرمے میں اجوائن، عود اور دھوئیں کے غبار میں ملی جلی گرم گرم خون کی بوٹھمی اور رانی کی ڈوٹی اچھرتی سانسوں کی لہریں۔ دانی نے اندھیرے سے اٹھا کر ہاتھوں کو اونچا کیا اور جیسے آپ ہی آپ اس کی چیخِ حلق سے یوں چھوٹی کہ رانی کا سارا جسم کانپ کانپ گیا۔

”اے دہن میں کہوں بیٹیا ہے۔ پورا کا پورا جنتیا جاگتا بیٹیا۔“ اور سچر، مہیاں، یا ہاں، ہاؤں، ہاؤں ہاں، کی خوشگوار آواز سچ پچ بیٹے کی آواز ”میں آگیا ہوں۔ میں آگیا ہوں اجالے لے کر اور خوشیاں لے کر۔ ناک اونچی کرنے والا۔ خاندان کا نام چلانے والا۔ دانی پھرتائی سے باہر نکلی اور چپختی ہوئی اماں کے پاس پہنچی۔

”اری بی بی، ساتم نے؟ بیٹیا ہے بیٹیا! چاندی کے کنگن پہنوں گی، ہاں۔“

”اری دھیرے بول نامرادہ ساری عمر بچے جتانے گزری، اتنا

مہنیں معلوم زچہ زیادہ خوش ہو جائے تو دم چھوٹنے لگتا ہے۔ وہاں تو آگے ہی ندیاں بہہ گئی ہیں۔ اتنی خوشی کی خبر سنے کی توجہ کیا بولے گا۔ کتنے برسوں بعد تو آج اندھیرے میں چاند چمکا ہے۔

اماں دھیرے دھیرے کرے میں داخل ہوئیں۔ رانی ششدر بنی پر کر دیا لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے، ایک ہاتھ نہ میں پر دوسرا کو لیے پر رکھا ہوا تھا۔ اس کا منہ دیوار کی طرف تھا۔ شاید وہ سمجھ رہی تھی کہ اب کے سے پھر لڑکی ہوئی ہے۔ "منہ منہ کی اور غم کے مارے اس نے منہ پھیر رکھا ہے۔ اب اسے میں پہلے تو یہ کہو نیکی کر دیتی ہوئی ہے۔ اور جب وہ رو لے پر آئے گی تو بتاؤں گی کہ وہ تو آج خاندان کی سب سے قابل عزت اور قابل احترام شخصیت بن چکی ہے بنا رانی تم نے۔؟ سنا۔!"

ساس نے، جو پہلے ایک ماں تھیں اور اب ایک پوتے کی دادی، دھیرے سے یہو کا شانہ ہلا کر اپنی طرف کھینچا۔ مگر رانی نے ساس کی طرف نہیں دیکھا۔ بیٹے کی طرف نہیں دیکھا، کسی کی طرف نہ دیکھا۔ اتنی ڈھیر ساری خوشی ملنے کے بعد وہ اور کچھ نہیں سوچ سکتی تھی۔ سوائے اس کے کہ خود ہی خدا کے حضور شکر یہ پیش کر لے چل دے۔!

رات کی سیاہی صبح سے بدلی، صبح کی روشنی پھر تاریکی میں روپلو ہوئی، مگر اماں اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ آنکھیں چھٹی ہوئیں اور سانس رکی ہوئی۔ وہ ساروں کی باتیں سن رہی تھیں، سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔ مگر یوں کہ کسی بات کی خبر نہ تھی۔ ایک ایک نے آکر ہلایا۔ پکارا۔

پہچتا دے دلائے، مگر نہ ان کی آنکھ سے آنسو نکلا، نہ کھلی ٹوٹی۔
 جس جگر رانی نے صبح کا سحر پورا جالا بکیر دیا تھا اب وہاں تاریکی
 کے سوا کچھ نہ تھا۔ بچیاں ڈھانپیں ڈھانپیں سپر رہی تھیں اور بچہ
 پالنے میں پڑا روئے جا رہا تھا۔ ”ہیاں - ہیاں - می ہیاں - میں
 یہاں ہوں - میں - میں یہاں ہوں - تم کہاں چلی گئیں؟ تم نے
 میرے لئے دعا میں مانگیں، منتیں مانیں اور دعا میں کا سہارا لیا۔
 اور اب جب میں تم تک چل کر آیا تو تم مجھے چھوڑ کر چلی گئیں۔ اب میں
 کس کے پاس رہوں گا؟ کون مجھے منہ سے پلائیگا؟ سب مجھ سے
 دور دور سبھاگ رہے ہیں۔ کسی نے میرے منہ میں کل سے دودھ کا قطرہ
 بھی نہیں پیکا یا ہے اسی۔ میں روتا ہوا آیا تھا کہ منہ میں اور مسکراؤں
 کی گود میں پلوں گا۔ مگر میرے آگے پیچھے، یہاں وہاں، ادھر ادھر، اس
 پاس آنسو ہی آنسو ہیں، چھینچھیں ہیں، آہیں ہیں۔ بے نور آنکھیں ہیں اور
 تاریکیاں ہیں۔ لوگ کہہ رہے ہیں میں منحوس ہوں۔ میں نے اپنی ماں
 کو کھالیا ہے، تائیاں، چھپیاں مجھ سے دور دور سبھاگ رہی ہیں۔
 ایک دودن کی بات تو نہیں، عمر بھر کا ساتھ ہے، کون دیگا؟ کون
 مجھے پیار سے گلے لگائے گا۔ اُمادادی اماں مجھ سے بات نہیں کرتی
 اب مجھے صرف دیکھ سکتے ہیں، سنبھال نہیں سکتے۔ سپر میں کہاں جاؤں؟
 کہاں جاؤں؟ ہیاں - ہیاں - می ہیاؤں۔“
 رانی مسکرائی۔ دودھ ہاتھ، سوکھے مارے مگر محبت کی آگ سے
 تپتے ہوئے ہاتھ جن میں خون کی دھن بھی نہ تھی، جن میں چوڑیوں کی چھنک
 نہ تھی۔ پالنے کی طرف بڑھے اور انہوں نے ایک ننھے سے گیلے گیلے وجود

کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔
 "مجھے تم سے یہی امید تھی منجھلی سچو سچی۔" رانی جیسے سرگوشی
 میں بولی۔

سچو سچی نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ یہ کیسی آواز تھی۔ یہ
 کیسی سرگوشی تھی۔ یہ کون ان سے اس قدر قریب ہو کر گزارا تھا۔
 انہوں نے کانپ کر بچے کو گلے سے لگا لیا۔

"میرے بچے! میرے بچے! میری جان!" ان کی آواز کانپ
 رہی تھی اور ہونٹ لہڑ رہے تھے۔

منجھلی سچو سچی اماں کی سب سے چھوٹی نند تھیں۔ جب اماں
 بیاد کر آئی تھیں تب تو وہ پیدا بھی نہ ہوئی تھیں۔ عمر میں وہ اپنے بڑے
 بھتیجے سے بھی دو چار برس چھوٹی ہی تھیں۔ بھتیجیوں کے بیچ وہ ٹھیک
 سی بہن نظر آیا کرتی۔ سمجھنے والے انہیں بھی اماں کی بیٹی ہی سمجھتے
 اماں تو نپہ نہیں کون سا خون، کون سا اثر لائی تھیں کہ چھو سات بیٹیوں
 کے ساتھ ساتھ چار بیٹیوں کی بھی ماں بن بیٹھیں، ورنہ یہاں تو نسل
 در نسل یہی ہو رہا تھا کہ ایک آدمہ لڑکا ہو گیا جس سے خاندان چلتا
 رہا۔ جب اماں کی ساس مری اس وقت تک سب اولادیں اپنے اپنے
 گھروں کی ہو چکی تھیں۔ بس ایک منجھلی نند ہی باقی رہی تھیں۔ ساس
 نے اے جیسے بہو کی گود میں ڈال دیا تھا۔ کچھ یہ نہ سمجھا کہ وہ ان کی بیٹی
 ہے۔ وہ سبھی سدا بھائی سدا وچ ہی میں گھلی ملی رہی۔ دن بیتیہ اور اماں نے
 بیٹے بیٹیوں کے گھر بٹانے شروع کئے تو منجھلی کو بھی ماں ہونا کر بیا ہا۔ مگر
 رنو کو سدا وچ کا ساتھ کچھ ایسا سجایا تھا کہ دد رہہ ہی نہ سکی۔ جاڑوں

کا ایک رات اس کے میاں نہا کر نیکھنے کی ہوا میں سوئے اور صبح اٹھے تو سارا جوڑ جوڑ جکڑا ہوا تھا۔ تین چار دنوں میں دنو کیلے کیا ہو گئی۔ بھادو ج نے لال کپڑوں سے دداغ کیا تھا اور بھائی جب لئے ہیں تو سر سے پاؤں تک سفید برف کی کلائی ہوئی تھی۔ جی کھول کر نہنا دنو کو داس دایا۔ اس کے ہونٹ سل گئے، ارمان گھٹ گئے اور وہ جلی شاخ کی طرح جہاں کی نہاں رہ گئی۔ تاروں بھر آسمان سر پہ جکڑا تا اور وہ دل میں اندھیرے لئے سسکتی رہی۔ جاڑے، گرمی، برساتیں، خزاں بہار، سب اس کے لئے ایک جیسی بات تھی۔ اور جیسے جیسے دن بیتے وہ بھتیجیوں، بھتیجیوں کے بچوں کی دیکھ دیکھ کرنے کو جیتی گئی۔ کوئی تصور نہ ہونے پر بھی ڈانٹ دیتا اور وہ خاموش اور معصوم آنکھوں سے دیکھ کر گویا اپنے ناکرہ گناہ کا اعتراف کر لیتی۔ میاں اچھی خاصی جائیداد چھوڑ کر مرے تھے۔ سارا پیسہ اسی کے حصے میں آیا تھا۔ وہ چاہتی تو اپنا ایک گھر بار کر سکتی اور مرے میں جی سکتی تھی۔ مگر وہ انہی لوگوں میں جتنی آئی تھیں، وہ ان سے ہٹ کر زندگی گزارنے کا تصور بھی نہ کر سکتی تھی۔ وہ تو بھری بہار میں اجڑ کر رہ گئی تھی۔ کون اسے دیکھنے اور نہانے والا بیٹھا تھا؟ پہنتی اور ہنسی بھی تو کس کے لئے؟ سارا پیسہ انہی بچوں پر اٹھا دیا کرتی۔ دہشتیں کی طرح ہر کام انجام دیا کرتی لیکن۔ لیکن اتنے دنوں بعد اب پھر اس میں زندگی کے آثار پیدا ہو رہے تھے۔

نہا شیم ابھی دہری چار دنوں کا تو تھا۔ بے چارے نے ماں کا دودھ چکھا بھی نہ تھا۔ اس کی زندگی کا کیا بے گناہ؟ کیا یہ پھول کہلا کر

رہ جائے گا۔ رفو لے بے بسی سے ان ماؤں کی طرف دیکھا جن کی چھاتیوں
 دودھ سے لبریز تھیں اور محض دو گھونٹ اس نہیں سی جان کی زندگی کا
 سامان مہیا کر سکتے تھے۔ مگر اپنے خوں سے کسی دوسرے کے گلے پودے
 کو سینچنے کا طرف کتنی ماؤں میں ہوتا ہے۔
 منجھلی چھو بھی لے اپنے سینے کی طرف دیکھا۔ مانتا کے سوتے تو مٹ
 ہوئی وہاں خشک ہو چکے تھے۔ سہر۔ سہرا انہوں نے آسمان کی طرف
 بٹکا دی، جس کا کوئی نہیں ہوتا اس کا خدا ہوتا ہے۔ انہوں نے روئی
 کی تہی بنائی اور گائے کے دودھ میں بھگو بھگو کر ننھے لے منہ میں پیکانے لگیں۔
 زندگی کا یہ سیلا دور تھا جب وہ خوشی خوشی جنیا سیکھ رہی تھیں۔
 بچپن تو جیسا بتایا سو بقیار بڑی ہوئیں تو ماں کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ یہاں
 کہ نیکے سے سسرال آئیں تو چند ہی دنوں میں ساری خوشیاں جل کر
 خاک ہو گئیں۔ نہ وہ کسی کے لئے جی سکیں، نہ کوئی ان کے لئے زندگی
 کا سامان کر سکا۔ اب ان کی زندگی ایک نئی، پر بہار اور رنگین راہ پر
 چل پڑی تھی۔ وہ جتنی تھیں ننھے کے لئے، مسکاتی تھیں ننھے کے لئے۔ اور
 پھر تنہا تو سبھی کی خوشیوں کا مرکز تھا۔ کسی دن گزرے پر ماں جی ہنس
 میں آئیں تو دیکھا کہ شمنوند کی گود میں وہ دمک رہتا تھا اور کوئی اسے
 لے کر کوہا تھ بڑھا تا تو وہ منہ پھیر کر اس کے سینے میں منہ چھپا لیتا تینوں
 پوتیاں تو ماں ہی کی نظر شفقت کی مرہون منت تھیں۔ پوتا تو پورا
 پورا بی زندہ کا تھا۔ ایک ماں نے چار عورتوں میں بیٹھ کر کہا بھی۔
 ”اب رفو بیگم جانیں اور غمیم میاں۔ میں نے تو ان کی گود میں ڈال
 دیا۔ اب وہ ان کی ماں ہیں اور وہی اللہ کے بیٹے۔“

رفو پھوسجی کا دل جیسے اپنی جنگ چھوڑ کر کہیں آنکھوں سے محل پکوں
پر کپکپانے لگا۔ "میرا بلیا! میرا بچہ!"

قیم میاں ڈھیر ساری بہنوں کے اکلوتے سہائی تھے کوئی انہیں
پوچھتا نہ پوچھتا، ماں اور دادی کی تو آنکھوں کے تارے تھے ہی تھے۔ بس
کڑوا کر بلانیم چڑھ گیا۔ ابھی ایک برس کے بھی نہ ہوئے ہوں گے، ضد
کا وہ عالم تھا کہ کسی چیز کی پے میں پڑ جاتے تھے چل چل کر زمین آسمان
سر پر اٹھا لیتے۔ بڑے ابا ایک بار کہیں شیشے کا ایک گلدان لائے تھے
قیمتی اتنا نہ تھا جتنا خوب صورت تھا۔ اور پھر جب چیز پرانی ہو جائے
اور وہ کسی بزرگ کے ہاتھ کی لانی ہوئی ہو تو وہاں قیمت کا سوال وہ بھی
نہیں جاتا، وہ ایک قابل احترام چیز بن جاتی ہے۔ ایک دن کہیں شو
میاں نے وہ گلدان دیکھ لیا۔ ڈیڑھ پونے دو برس کے ہو رہے تھے، کھڑک
تو ہوتے ہی تھے، ذرا دور تک چل سکی لیتے تھے۔ گلدان سنگھار میز کے پر
طرف دکھا ہوا تھا۔ بچہ پھداتے ہوئے گئے اور گلدان اٹھا لیا۔ غریب
تھا کہ زمین پر سے سارے کوتاہی بی نے دیکھ لیا اور چلا کر دوڑا۔

تھے ہے ابا میاں کے ہاتھ کا لایا ہوا ہے۔"

ہاتھ سے گلدان جھپٹا تھا کہ سٹونے چیخے چیخے کہ حالت نیا ہو
کر لی۔ لاکھ کھلونے دیئے جا رہے ہیں۔ لالچ دیا جا رہا ہے، مگر بھلا
نہیں پہچانتے منجھلی سیو سچی کہیں یاد رچی خانے میں ان کے دودھ دیئے
کی برابری کر رہی تھیں، وہاں سے چیخ چاخ سن کر لپکی آئیں۔

"ہوا کیا؟" وہ تیزی سے بولیں۔ "ذرا چھوڑ کر جاؤں تو چیخے

سب اسی کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔ آخر بن ماں کا ہے۔"

”اُئی تنک کر بولیں۔“ بن ماں کا ہے تو جو چاہے کر لینے دیں۔“
 ابھی گلہ ان توڑد باہوتا۔ کوئی ایسی ویسی چیز تو ہے نہیں۔“
 چھوٹی سی کو دیکھو شواہد و رد و زور سے روٹنے لگا۔ رفو بیگم نے
 آگے بڑھ کر گلہ ان اس کے ہاتھ میں تھما دیا اور دوسرے ہی لمحے خوش
 خوشی سنوتے ترے زمین پر دے مارا۔ معصوم مسرت کا سا۔
 اسی تڑپیں پوشیدہ تھا۔

سب ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے۔ یہ تو سرے ادبچی جا رہی
 ہیں۔ ایسے نو بن ماں کے بچے کو ڈیڑھ کوڑی کا کر دیں گی۔ کیا بچے کی ضد
 ایسے ہی پوری کی جاتی ہے۔ !
 دادی اماں کے کانوں تنک تنکایت جانے سے پہلے ہی مچھلی بھجوا
 نے ایک ندو، چار گلہ ان شگوارا کر میز پر سجوا دیئے۔

یہ پہلا دفت تھا جب مچھلی بھجی سی کا دل پوری طرح ایک ماں
 کی طرح تڑپا تھا اور وہ اپنے جگر گوشے کے لئے سب سے لڑنے پر آمادہ
 ہو گئی تھیں۔ یہ ایک نہیں، بائیس ہی نہیں سی بات تھی۔ مگر جیسے جیسے
 شو بڑا ہوتا جا رہا تھا پھوسپی کی محبت دیوانگی اختیار کر رہی جا رہی
 تھی۔ ان کی زندگی نے محبت کا لفظ سنا ہی نہ سنا۔ محبت کرنے،
 چاہنے اور چاہے جانے کی اس لذت سے وہ یکسر محروم تھیں جو کبھی
 تو بیوی بن کر ملتی ہے اور کبھی ماں بن کر۔

شواہد اپنی بہنوں میں۔ گہرا ابلٹھا تھا۔ چھوٹی سی جان، نہ کسی
 بات کی سمجھ نہ اپنے پرانے کی تمیز۔ سب بچیاں کھیل رہی تھیں چھپا
 چھپائی کا کھیل ہو رہا تھا، شواہد اٹھالی بھی چل رہی تھی کسی نے سر پر

ایک دھول خبائی۔ اس نے ادھر ادھر سرگھا کر دیکھا اور سہرے لے سے پکارا۔
 ”امی۔“

رفو سچو والاں میں کرسی پر سویر بنتی بیٹھی تھیں۔ اس کے اس طرح پکارنے پر پہلے تو وہ چونکیں، پھر ان کا پورا وجود تھرا گیا۔ امی۔
 امی۔ امی۔ !

آج ایک نئے سے وجود نے اپنی زبان سے پہلی بار ایک لفظ ڈھالنا تھا، اور وہ لفظ تھا امی۔ ! اور امی کون تھی۔ ؟ سویر بھنیک کر وہ لپکیں اور قریب پہنچتے ہی رک کر بے تابانی سے شمو کو اپنے سینے میں بھر لیا۔

”میں تیری ماں ہوں۔ ہاں تیری ماں ہوں۔ ایک بار پھر امی کہہ دے۔ کہہ دے میرے بچے ! میرے بیٹے !“ سینے سے ابالی سا اٹھ رہا تھا۔ وہ سچو چمک چمک کر روئے جاتی تھیں اور شمو کو اپنے سینے سے بھیجے جاتی تھیں۔ آج ایک معصوم وجود نے انہیں فرش سے اٹھا کر عرش پر بٹھا دیا تھا۔ آج تک وہ ایک عام عورت تھیں مگر اب ان کے قدموں تلے بھی ایک جنت تھی۔ ہاں وہ ایک ماں تھی۔

ایک ماں کا نازک اور موم دل لئے اب وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھانے لگیں کہ کہیں ان کے پیروں تلے کسی کا معصوم دل کچل کر نہ رہ جائے۔ ماں بننے کی پہلی پہلی لذت سے گزر کر اب وہ اس دور سے گزر رہی تھیں جب کہ ان کی اولاد نے انہیں ماں کہہ کر پکار بھی لیا تھا۔ اب ان کے سینے میں بجائے گوشت پوست کے دل کے ’سچ کا دل‘ تھا

جو ہلکی سی ٹھیس سے بھی چور چور ہوجاتا۔
 رنہ سچھو سکتا ہے اب ناممکن تھا کہ ایک لمحے کے لئے بھی اپنے وجود
 سے، اپنے دل سے، اپنی آنکھوں سے اپنے راج دارے کو اوجھل کر نہیں۔
 ان کی سسرال سے ایک بار کسی عزیز کی شادی کا بلاوا آیا۔ اکھاڑ کر تیار
 تو کیسے؟ سسرال کا معاملہ تھا۔ اور شو کو ساتھ لے جائیں تو کیسے؟
 وہ تو انہیں امی کہتا تھا۔ اگر کوئی الٹی — — سیدھی بات منہ سے
 نکال دیتا تو چار لوگوں میں کیا عزت رہ جاتی؟ اکیلا بن کیسے برداشت
 کرتی؟ مگر مال نہ سکیں اور اکیلے ہی جانا پڑا۔ گئی تھیں کہ رات ہونے
 سے پہلے ہی آ جاؤں گی۔ مگر وہاں وداعی میں اتنی دیر تھی کہ تارے کھل گئے
 چاند چمک اٹھا۔ ان کے اپنے دل میں بھی چاند کا عکس تھا۔ اور آنکھوں
 میں تارے۔ لاکھ ناں ناں کی مگر رکنا ہی پڑا۔

صبح اٹھنے ہی سب سے پہلے چلنے کی سوچی۔ رات بھر نیند ہی کہاں
 لگی تھی جو اٹھنے نہ اٹھنے کا سوال پیدا ہوتا۔ وہ تو گھڑیاں گنتی بیٹھی
 تھیں۔ اسی جاگل نے ان کی موٹی موٹی آنکھوں میں گلابی ڈورے ڈال
 دیے تھے۔ نیند کا نشہ لگ، جاگی جاگی آنکھوں کی گلابیاں رہیں سو
 الگ۔ ان کی سوئی سوئی جیانی جیسے آج گھری منہ سے ہڑ بڑا کر جاگ اٹھی
 تھی۔ الگ الگ چٹا پڑا تھا۔ اور جس وقت وہ چار پائی سے اتریں
 اور زمین پر پاؤں رکھا ہے، ایک لمحے کو خود انہیں پچھوس ہوا جیسے چپ
 سے زمین ان کے وزن سے چٹ چٹ لول جاتے گی۔

ملجھی ساری کے آنچل سے سر کو ڈھانپے قابل آنکھوں سے ادھر
 ادھر دیکھتی، نوکر کو کھوجتی پھرتی تھیں کہ سامنے سے اشرف آتا دیکھائی

دیا۔ اس نے پہلے تو یونہی لا پرواہی سے دیکھا، مگر ایں نگاہ جو پر گئی تھی چہرے
 چپکا کر ہمارے عین۔ یہ رفو بھیا بھی تھیں۔ ۶ رفو بھیم۔ ۶ رفو دھن۔ ۶ رفو بھوہ۔
 کہتے۔ برس بیوگی کو ہو رہے تھے۔ ۶ پرانے خیالات رکھنے والے لوگوں سے
 یہ کہاں ممکن تھا کہ اس قسم کی بات کا تصور بھی کر سکتے کہ بیوہ کو ۶
 سے بیاہ لائیں۔ کیا ہوا اشرف اگر مرنے والے کا حجاز ادھیائی تھا۔ ۶ تھا
 تو ہر لحاظ سے قابل اتنے دن گزرنے تک اشراف نے بھی کہیں شادی
 نہ کی تھی۔ یہ تو نہ تھا کہ دل میں بس رفو کی یاد کا دیپ جلائے ہی بیٹھا ہو۔
 مگر سوچنا ضرور تھا کہ اگر یہ چراغ اسی کی تاریکی میں جل اٹھا تو۔
 ایک قدم۔ دوسرا قدم۔ تیسرا قدم۔ رفو عمر کے اس دور
 میں تھی جب پھل پھل کی۔ دل سے گزر کر پٹنے لگتا ہے۔ گدرا یا گدرا
 سا۔ رس بھرا۔ اور پہلے سے کہیں میٹھا۔ آنکھیں۔ آنکھیں۔ آنکھیں۔
 ایسی ہی قابل آنکھوں پر شکر کہتے ہوں گے آئین میں پلنگ ہی پلنگ
 بچے ہوئے تھے۔ سارے میں سوتا پڑا ہوا تھا۔ کوئی کر دھ لے رہا تھا۔
 کوئی کسمار ہا تھا۔ اشرف کو یہ موقع اچھا ہا تھا آیا۔ لپک کر آگے
 بڑھا اور بے چینی سے یوں بولا جیسے برسوں سے یہی ایک بات کہنے کو
 بے چین تھا۔

”رفو، اکیلی کب تک زندگی بسر کرے گی؟ یہ سفر تو بہت ہی لمبا ہے
 اور تمہارے ساتھ تو کوئی دوسرا ساتھی بھی نہیں۔“
 رفو ایک لمحے کو سر سے پاؤں تک تھوڑا سا تھکا۔ بیوگی کے اتنے
 سارے بھیانگ سال۔ روتے تھاتے، آنسو بہاتے، سسکتے ہوئے لیے
 اور اکتا دینے والے سال۔ اس کی آنکھوں کے آگے سے ایک لمحے میں

گزر گئے، سہارا - ؟

قبول کر لوں - ؟ ساتھی - بنا زندگی کشتی بھی تو نہیں، یہ ایک لمحے کی بات تھی۔ ادھر روئے سکتے اتنے سارے سہارا اور حرمیاں تھیں، جوان زندگی اور بے خواب راتوں کے جان لیوا ستم تھے اور ادھر ایک تنہا مانا چاند تھا۔ ہنستا مسکراتا - امی ! امی !

وہ چونکیں، پھر بڑے ساندے - دھیمے سروں میں بولیں -
"آپ غلط سمجھ رہے ہیں امیرن عبادی - مجھے زندگی سے اب کوئی شک نہیں - میں نے تو رانی کے بچے کو گود لے لیا ہے ۔"

ایک پھول کے نئے رنچو پھوچی سارے بچے پر بارغ کوہ ہلہلانے بارغ کوہ، ہنستے سدا تے، لہکتے مہکتے بارغ کوہ جھلکا آئیں -
اب ان کا بارغ شہو کے علاوہ اور کسی کے متعلق سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔
عورت محبت کرنے پر آتی ہے تو انہی سستی کو مٹا دیتی ہے - چاہے وہ اولاد ہو یا شوہر، اپنا ہوا پرایا - اس دل کی بات ہے - عورت نے دنیا میں شکست ہمیشہ اس محبت اور امتنا بھرے دل کے ہاتھوں ہی کھانی ہے -

دن ایسے ہی سرسبز رہے جہاں تھے - اپنی جوانی اور حسن کی ساری رعنائیاں رنچو پھوچی نے جیسے شہو کو دے ڈالیں - ابھی ابھی وہ گھنٹوں چلتا تھا، ابھی ابھی وہ پلنگ کی پیٹا کا سپارالے کر کھڑا ہونے لگا تھا، ابھی ابھی اس نے اپنے گلابی اور نرم ہونٹوں سے رنچو پھوچی کو امی کہہ کر پکارا تھا - ابھی ابھی وہ اپنی تین پہیوں والی شاکیل پر بیٹھ کر مرغیوں کے پیچھے دوڑتا پھرتا تھا، ابھی ابھی اس سے اپنا بستہ اٹھایا تھا اور قاعدہ اٹھا کر الف لے اور اے بی سہا، ٹوٹی پڑے

ننھا، ابھی ابھی اس نے کلابا چہرے اور ہنسی آنکھوں کے ساتھ آکر
اپنی امی کو سنا ہوا تھا۔ "امی، میں چھٹی سیلاس میں فرسٹ آیا ہوں۔"
ابھی ابھی اس نے سیٹ کی بیڈ فرسٹ کلاس فرسٹ آکر استادوں کو
حیرت زدہ کر دیا تھا۔ اور ابھی ابھی وہ کالج سے سائیکل پر واپس
وٹا تھا اور ٹرے پیار سے اپنی امی سے کہہ رہا تھا۔

"امی، آپ نہیں سمجھتیں، آپ کو وجہ سے مجھے کتنی فکر لگ رہی
ہے۔ بھلا کوئی بات ہی ہے کہ میں اتنا بڑا ہو کر یوں آپ سے کام لوں۔
کید میں ایکہ پائے کی پیالی بھی اپنے ہاتھوں نہیں لیا سکتا۔
رفوچھو بھی سکھائیں۔" بیٹے تو نہیں جانتا، تیرا کام کر کے تیری
ہنستی صورت دیکھ کر میرا دل اتنا بڑھ چکا ہے۔ آخر ایک ماں
اور اپنے بچے کے لئے کر ہی کیا ہوتی ہے۔"
آف دم شہو ذرا رکا اور آہستگی سے بولا۔ "امی۔ آپ کا میری امی
ہونا۔"

رفوچھو پانے سے سارے کراہ دیکھا اور لڑ لیا۔ "کیدوں اس میں مجھے
نئی شک ہے۔" دہی پڑے لیکن زہرہ، شامینہ وغیرہ مجھے سن رہی ہونگی نا؟
"نہیں امی،" شہو ہنس کر بولا، "جیسے تو سب بھاگتے رہتے
ہیں، آج کل تو نہیں بہت زور لیتے کہ آپ میری امی نہیں سمجھتی ہیں۔"
"تو اس میں کیا فرق پڑتا ہے بچہ؟ مہر حال بن میری ماں تو ہوں
۔" دیکھا اتنی بات تیرے لئے کافی نہیں ہے۔"

شہو کا چہرہ اتر سا گیا۔ وہ بات ہو کر بولی۔ "امی امی بات نہ
کچھ۔" دہی امی خانہ رہتی ہیں کہ آپ نے میرے لئے کیا کیا کیا ہے۔

رات کو رات نہیں سمجھا، دن کو دن نہ سمجھا۔ اپنی زندگی کا ہر لمحہ، ہر آنکھ میرے لئے صرف کر دیا۔ اور تو در آپ نے اپنی ساری جائیداد بھی میرے نام کر لی۔ کچھ کہیں سمجھا رہیں خود کو بے مد گناہ گناہ محسوس کرنے لگتا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔

رہو پھر بھی نئے اکدم لپک کر اپنا سوکھا، برا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔

”خدا کے لئے چپ رہ جاؤ۔ ایسی بات نہ کرنے تجھے ذرا سی شرم نہیں آتی۔ آخر میرے دل کا احساس کر۔ آخر میں تمہیں کسے لگے گا۔ اور کس کے لئے مرد لگی؟“ اس کی آنکھیں کھلیں۔ وہی تھیں۔ شہر کا اور بے بسی تہ بولا۔ ”کہتے جیسی بات تو نہیں ہے اسی لئے واقعی آپ اپنی زندگی شہر اور ہی سکتی تھیں۔ میرے وجود نے آپ کی زندگی کو جنم نہ دیا۔“

رہو پھر بھی شراب اسٹیں۔ ”شہر! ایسی بات منہ سے نہیں نکالتے۔“ اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکیں۔ ان کا منہ بنا رہا تھا اور زندگی کا ہر لمحہ جیسے ٹھٹھک گیا تھا، رک کر، چپکار چپکار کر کہہ رہا تھا۔ ”بدمعہ کہنا، کیا ابھی نہیں بیٹے دنوں پہ انیسویں نہیں ہوتا؟ کیا اپنی بچھو لوں بھری جراتی کڑیوں پر باد کر کے تمہیں کوئی کڑا ہن نہیں ہوتی؟“ اس رات شہر نے جب جب بھی پڑھتے پڑھتے سراٹھا کر اسی کے پلنگ کی طرف دیکھا، پلنگ کو ہنسی نہیں سسکیوں سے لرزتا پایا۔

شہر میاں ایم، بی بی، ایس کے شہر ڈاؤن میں تھے کہ ان کی پسی پھوٹی۔ اڑتے اڑتے یہ بات رہو پھر بھی کے کانوں تک بھی آئی۔ رہو پھر بھی

کے دل کو کیا کیا ارمان لگے ہوئے تھے۔ انہوں نے تو طے کر رکھا تھا کہ کسی اچھے شریف خاندان کا بے حد پڑھی لکھی اور سنگھڑ لوٹ کی کو اپنی بہو بنائیں گی۔ زندگی نے جو ستم ان کے ساتھ کئے تھے۔ گن گن کر ان ظلم و ستم کا بدلہ لیں گی اور ہو بیٹے اور پوتے پوتیوں سے بھرے پرے انگن میں بیٹھ کر ہنستی ہنستی ہی اس دنیا سے دوسری دنیا کو جائیں گی۔ مگر لکھا تھا کہ ان کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکے گی، کیونکہ سٹو میاں نے جس جگہ دل لگایا تھا وہاں کسی کی مرضی نہ تھی۔ تپہ نہیں اپنے کون سے پردیس کی لڑکے پر بیٹھ گئے تھے۔ خاندان کی بات تو جانے ہی دو۔ بیارانی اچھی مہرگ بھی نہ کر سکی تھیں اور مزے سے سائیکل پر دوپٹہ اڑاتی اسکول آیا پایا کرتی تھیں۔

اگر صرف رفوچھو سچی کا واسطہ ہوتا تو سٹو میاں کو اتنی لگ بھگ بھی نہ ہوتی، مگر میاں تو پردے خاندان سے فکر لینے کا سوال سمجھا اور پھر اچھی تعلیم بھی اور عورتی بھی اور نوکری کا کوئی ٹھکانہ تھا ہی نہ تھا۔ یوں پیسہ تو انسا تھا کہ چاہتے تو چار لوگوں کو کھلانے تک بھی عمر بھر کھریٹے کھا سکتے تھے۔ مگر گھر میں بیٹھا مرد بھی کیوں بھلا دکا ہے۔

رفوچھو سچی لاکھ بے خبر تھیں۔ نگر چہرے کی آڑی آڑی رنگت اور ہلکی ہلکی چال ڈھال سے کہا نہپ گئیں کہ سٹو میاں نے ضرور کہیں جی اکالیا ہے۔ ادھر ادھر سے پوچھنا چھو کی، ان کا خیال غلط نہ تھا۔ اماں بیگم کی سرکار میں جب پیشی ہوئی تو وہ کشن پھارٹ کر چلا آئیں۔ اور اٹے جب رفوچھو سچی نے ہی بیٹے کی پشت نباہی کی تو وہ چلا آئیں۔ "جا بڑا دکا جہ جہ سچی آگے ہی اس کے نام کر دی ہے اور اوپر

سے بیوی بھی وہاں چھوڑنا نہ ان کی لار ہی ہے۔ اری دیکھنا، تجھے دانے دانے کو تیرا دیں گے۔ تیرے پاس اس کی عقل کو کیا ہو گیا ہے۔ بیچ ادب سمجھتی ہی نہیں ہے۔ عمر بچی عمر ایسی ہی نا سمجھی میں گزرا رہی ہے۔

مگر تو سوچو پھر یہی سے نہ بیٹھ سکیں رشتہ تو شرمیاں نے کیا تھا۔ بھروسہ ان کے سے اثرات ان کی صورت سے ہو پڑا تھا۔ رنگ پیلا۔ ایک سلیس بال، ہر وقت پہرہ کوئی دیکھتا تو یہی کہتا اب شب ہو رہی ہیں۔ اس قدر نہ میں ہی سالی سبز کل گیا، مگر شرمیاں کا جی اپنی جگہ سے نہ ہٹا۔ وہی ایک لٹن تھی، وہی ایک رٹ۔ تھک مار کے بڑے بڑے بھی چپ ہو رہے۔ تیرا ہوا کے جھکڑ کے آگے گھاس پھوس نکلتا بھی کب ہے؟

تو پھر پھر تیرے اپنے بہن اور چڑھا دے کے سارے جوڑے اور پورا زور یوں ہٹا کر رکھ دیا تھا۔ اب وہ بڑے جنن سے تمام چیزوں کا جائزہ لے رہا تھیں۔ گوتے کناری برنیا کیرا لگو اور ہی تھیں اور زور کے نشین بدل چپے تھے تو ڈیزائن بدلوانے پر مصرتھیں۔ رہی ہی ماری اپنی انہوں نے شادی کے بندھنوں پر لگا دی۔ وہ بچ بچ کی ماں نہیں تھیں تو کیا ہوا؟ ان کے سینے میں ماں کادل تو دھڑکتا تھا۔ یہ وہی تو تھیں نا جنہوں نے رات رات بھر جاگ کر، ردی کی بتی بنا کر اپنے شمو کو دودھ پلایا تھا، اس کی دیکھ دیکھ کی تھی۔ تو رونا کی فوج ہونے کے باوجود ارماتوں کے ساتھ خود ہی تو موت کے بھرے پوترے۔ رمالیاں دھوئی تھیں۔ یہ وہی تو تھیں نا جنہوں نے شمو کی ہلکی سی بیماری پر اپنے آپ پر رات رات بھر کی نیند حرام کر لی تھی۔ یہ

وہی تو تھیں نا جنہوں نے انہیں زندگی کا ہر ہر خوشی، ہر ہر سکھ، ہر ہر سچا
بھرا لمحہ شہو پر قربان کر دیا تھا۔ کیا ایک ماں اس وقت پاں ہو سکتی ہے
کہ وہ اپنے سینے سے ایک بچے کو دودھ پلا دے۔ کیا عھن اپنے بطن سے
خیم دینے والی ہی ماں کہلا سکتی ہے۔ زندگی کی ساری خوشیاں
نثار کر دینے والی دکھی روح کو پھر ادر کیا نام دیا جاسکتا ہے۔ کیا رست
آسانوں کے اوپر رہنے والا اتنا نا انصاف تھا کہ وہ انہیں ماں پن
کی لذت سے محروم کر دیتا۔ ؟

شادی کے دن روفو پھوپھی کی خوشی دکھی نہ جاتی تھی۔ اپنے
ہاتھوں انہوں نے ہر ہر کام نبٹایا تھا۔ مہانوں، رشتہ داروں
دوستوں، نوکروں سے گھر بھر اڑا تھا مگر وہ ہر ہر جھوٹا کام اپنے
ہاتھ سے، اپنی خوشی سے کرنا چاہتی تھیں۔ کیا ہوا جو شہو نے ان کی
پسند سے شادی نہ کی، زندگی کسے گزارنی تھی۔ شو کو یا انہیں۔ یہ
تو اچھا ہی تھا نا کہ میاں بی بی نے ایک دوسرے کو دیکھ کر پہچان کر ہاتھ
بڑھایا تھا، پھر وہ اپنے جگر گوشے کی خوشی پر کیسے نہ خوش ہوئیں۔

شادی پورے زور شور سے ہوئی۔ برات بنیڈ باجے کے ساتھ
دلہن وہاں کو لے کر گھرائی۔ راستہ بھر آتش بازی اچھوٹی رہیں۔
اور روفو پھوپھی خود اپنے ہاتھوں پیسے لٹاتی رہیں۔ آج کوئی روفو پھوپھی
کی خوشی دیکھتا۔ بڑھاپے کے باوجود ان کے چہرے پر جوانی کا رنگ
چھپا ہوا تھا۔ وہ رہ رہ کر مسکراتیں۔ ان کے پڑ مردہ اور پیلے چہرے
پر آتش گلا بیاں اٹھ رہی تھیں۔

دہن کا کمرہ بھی خود انہوں نے اپنے ہاتھوں سے سجایا تھا۔

پھولوں کی بہتات سے کمرے پر کسی خطہ باغ کا گمان ہو رہا تھا۔ بقیش کے تاروں اور چاندی کے تیلے نیلے پھولوں سے مہری جگمگ جگمگ کر رہی تھی۔ چہرہ ٹھٹ پر دلہن سر میوڑائے بیٹھی تھی اور رفو پھو پھی آتے جانے پر مسرت انداز سے اس کا جائزہ لے رہی تھیں کہ کب کب چاند چڑھے اور یہ کلی بھول بن کر مہکے۔

کھانے والے اور رستہ رسموں سے فارغ ہونے پر جب دولہا کو ادھر لایا گیا تو چانک رفو پھو پھی نے محسوس کیا کہ سہرے کی لڑائیوں میں سے جھجکتا ہوا شمو کا چہرہ کچھ ادا اس ادا اس سا نظر آ رہا ہے۔ آج کا دن۔ مسرتوں، ادا لوں، آرزوؤں کا دن اور شمو کے چہرے پر بڑبڑاؤں؟ وہ بے کل بے کل سی، بولائی بولائی سی ادھر ادھر پھرنے لگیں کہ جھجھک چھٹنے اور موقع ملے تو وہ شمو سے کچھ بات کریں۔ مگر دلہن دولہا کے اس پاس وہ جھجھک جھجکا تھا کہ کم ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔

رات کے بارہ بجتے بجتے سب ماؤں نے اپنے اپنے بچوں کو سلایا۔ مہماں بیبیان موقع پا کر اپنے جھروکوں میں گھسیں۔ باجے والوں نے شطرنجیوں اور ٹاٹوں میں لپیٹ لپیٹ کر باجے رکھ دیئے اور چیمٹ خالی ہو گئی۔

شمو اکیلا کمرے پر بیٹھا رہ گیا تھا۔ دلہن اندر کمرے میں تھی۔ رفو پھو پھی بے تابی سے لپکی ہوئی آئین اور چھوٹتے ہی بولیں۔

”میرے لال۔ کیا بات ہے؟ چہرہ یوں اترا اتر اسیوں ہے۔“ شمیم صاف بال گیا اور چہرہ نیچا کر کے بولا۔ ”کوئی بات نہیں امی۔ آج تو میں حد سے سوا خوش ہوں۔ آپ جی نہ کر لیجائیے۔“

مگر روفو سچو سچي کا جی نہ مانا۔ وہ گھٹے کا ہار ہو گئیں اور قسمیں
دے دے کر اسی کی ادا سی کا سبب پوچھنے لگیں۔ شمیم نے جیسے حلق
میں پھنسا ہوا گولہ نیچے اتارا اور انگ انگ کر بولا۔

”نہیں میں بس یہی سوچ رہا تھا کہ اگر آج میری اماں ہوتیں
تو کس قدر خوش ہوتیں۔“

”میری اماں۔!“

”میری اماں۔!“

”میری اماں۔!“

روفو سچو سچي کا سر گھومنے لگا۔ زمین، آسمان سب گھومنے لگے۔
”ماروں بھرا آسمان چکر کھانے دگا۔ بچوں بھری زمین چکر کھانے لگی۔
انہوں نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالنا چاہا، مگر ہر لمحہ وہ
بے سدھ ہوتی جا رہی تھیں۔ چٹ سے ان کو اپنے سینے میں کوئی چیز
ٹوٹتی محسوس ہوئی۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے دل کو پکڑنا
چاہا، مگر اسی لمحے ان کے ہاتھوں کا سارا زور ختم ہو گیا اور وہ تیرا
کر زمین پر گر پڑیں۔“

ختم شد

